معاد

جلد اوّل

تالیف

حضرت آیت اللہ محمد تقی فلسفی

مترجم

مولانا محمد علی فاضل

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب	معاد جلد اوّل
تصنیف	حضرت آیت اللہ محمد تقی فلسفی
مترجم	حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا ذوالفقار علی سعیدی قمی
کمپوزنگ	الحمد گرافکس لاہور فون: 301-7229417
فنی معاونت	قلب علی سیال
ناشر	مصباح القرآن ٹرسٹ۔ لاہور۔ پاکستان
تعداد	ایک ہزار (۱۰۰۰)
طبع	اوّل
قیمت	

ملنے کا پتہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

قرآن سینٹر ۲۴۔ الفضل مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

عرض ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کی ان صدقاتِ جاریہ میں سے ہے جس سے لوگ تا قیامت استفادہ کرتے رہیں گے اور موصوف کے درجات عالیہ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مصباح القرآن ٹرسٹ نے تراجم و تفاسیر قرآن سے کام شروع کیا اور پھر ہر وہ کتاب جس کی ملت کو ضرورت تھی شائع کی انشاءاللہ العزیز شائع کرتی رہے گی۔

موجودہ کتاب ''معاد'' حضرت آیت اللہ محمد تقی فلسفی کی تصنیف ہے جو کہ تین جلدوں پر مشتمل ہے اس میں آپ کے ذہن میں پیدا ہونے والے سینکڑوں سوالوں کے جوابات موجود ہیں کتاب کا نام اگرچہ معاد ہے لیکن اس کے مطالعہ کے بعد انشاءاللہ آپ کی دنیا بھی سدھر جائے گی اور آخرت بھی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب انشاءاللہ آپ کو پسند آئے گی۔

یاد رہے کہ مصباح القرآن نے اپنی تمام کتابیں آپ کے استفادہ کے لئے انٹرنیٹ پر دے دی ہیں۔ ایڈریس ہے:

www.misbahulqurantrust.com

www.misbahulqurantrust.org

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر وہ اس کتاب میں کہیں خامی دیکھیں یا کمی محسوس کریں تو ہمیں مطع ضرور فرمائیں ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ ادارہ کی ترقی اور اس کے بانی محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کے طالب ہیں۔

ادارہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست

معاد جلدنمبر1

عنوان	صفحہ نمبر
مجلس نمبر1	18
مکتب اوراس کی تاثیر:	18
حکمت پر مبنی اندازہ:	19
انسانی فکر کی نارسائی:	19
مادی اوراسلامی مکتبِ فکر میں انسان کی حیثیت:	20
دوحیثیتوں کا حامل انسان	21
اللہ کی بارگاہ میں جوابدہ ہونا ہے	22
غافل نادان:	22
موت اورنئی زندگی کا آغاز:	23
مادہ پرستوں اورخداپرستوں کے عقیدہ کا فرق:	23
عالمِ آخرت کا قبول اورانکار:	23
ادیانِ الٰہی کی بُنیاد:	24
خداپرایمان کا راستہ:	24
قیامت اورانبیاء:	25
متقی لوگ اورآخرت پریقین:	26
آخرت پرایمان اوراس کا انتخاب:	27
پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اورپاک دل انسان:	28
فطری غریزے اوراُن کی تکمیل:	29
زندگی سے محبت کا غریزہ:	30
انسان اورہمیشہ کی زندگی کی آرزو:	30
ہمیشہ کی زندگی اورآخرت:	30
ابدی زندگی کا غریزہ:	31
بقاسے محبت:	31
حیاتِ ابدی کا احساس:	32
ظالموں کوسزا:	32
ضمیر کا سُکون:	33
روزِ جزا کا انتظار:	33
خدااورظالموں پرنگاہ:	34
دینی نظریات میں دوسرے نظریات:	34
مُشرک درعبادت:	35
خداپرست منکرین معاد:	35
آزادخیال اورقبول اسلام:	36
قومی تعصّبات اورمعادکا انکار:	36
بغیردلیل کے گفتگو:	37
باطل تصوّراوراس کا جواب:	37
خداہی دنیااورآخرت کوزندگی عطا کرتا ہے:	38
معادکی تکذیب اورنامشروع خواہشات:	39

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
معاد یا خدا کا قطعی وعدہ:	39	کمال مطلق سے مشابہت پیدا کریں:	51
مرنے کے بعد نئی زندگی کا آغاز:	40	لوگوں کے ایام زندگی:	51
آخرت کی سزا و جزا:	40	زندگی بہتر ہے:	51
آج کی دنیا کا کل کے جہاں سے تعلق:	41	یادِ خدا اور قلبی سکون:	52
مادی اور معنوی اُمور کا باہمی تعلق:	41	زندگی بہتر ہے:	53
دینی اور دنیاوی امور کے تحرک کے ذرائع:	42	یادِ خدا اور قلبی سکون:	53
گناہ اور تباہی:	42	قیامت پر ایمان:	54
مادی دور اور اقتصادی غلامی:	43	آخرت اور حیات جاوید:	54
انسانی ارتقاء کی بجائے اوزاروں کا ارتقاء	43	دنیاوی زندگی سے لوگوں کی پریشانی:	55
متمدن دُنیا اور مادّی رجحان:	44	نا قابلِ علاج تشویش:	56
روحانیت اور معنویت سے بے اعتنائی:	45	معاد کا انکار اور دُنیا کا کھوکھلا پن:	56
جوانی کا عرصہ اور اہلِ ضرورت کی تلاش:	45	مادہ پرستی اور مفاد پرستی	57
آج کا انسان اور مادی اُمور:	46	ایمان کے سائے میں بلندیوں کا حصول:	57
غیر متوازن جسم اور رُوح:	46	صاحبِ بصیرت انسان اور مستقبل پر اس کی نگاہ:	58
آئین خلقت سے روگردانی:	46	فرصت کو غنیمت جانو:	58
خود سے بے خبر لوگ:	47	دُنیا اور اس کی تلخیاں:	58
ریا اور خود سے بے خبری کا باہمی فرق:	47	جن لوگوں کی نظروں میں دُنیا فضول ہے:	59
خود سے بے خبر دُنیا:	48	دُنیا تھکا دینے والی ہے:	59
مجلس نمبر 2	49	موت یا دوسری ولادت:	60
انسان اور کمال مطلق کی فکر:	49	خودسازی اور فلاح:	60
مادہ پرست اور ایک پہلو کا نظریہ:	49	قیامت میں دل کے اندھوں کا حشر:	61
انبیاء کا مکتب اور مبداء و معاد پر ایمان:	50	انسان خودسازی میں آزاد ہے:	61
خدا پر ایمان:	50		

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
شکر اور ناشکری:	61	سربراہانِ حکومت کی معنویات کے فروغ میں ناتوانی:	72
دُنیا انبیاء کے نقطہ نظر سے:	62	فراموش شدہ انسانیت:	72
مستقبل کی فکر:	63	انبیاءکرام اور مکارمِ اخلاق:	73
غفلت اور لاپرواہی:	63	ایمان اور اجتماعی امن وامان کی صورتِ حال:	73
احیاء انسانیت کے لیے ریاضت ضروری ہے:	63	خدا پر ایمان سے مراد:	74
فرض شناس لوگ:	64	آخرت پر ایمان سے مراد:	74
بامقصد زندگی:	64	گناہگار اور نامہ اعمال:	75
بےمقصد زندگی:	65	عدل وانصاف پر مبنی فیصلہ	75
روحانی شکنجہ اور خودکشی:	65	فرض شناس لوگ:	76
غلط سوچ:	65	مخلوق کا خالق سے حیا:	76
آخرت کی سعادت کا معیار:	66	تزکیہ نفس اور دائمی سعادت:	77
خدا دیکھ رہا ہے:	66	ظلم سے اجتناب:	77
زندگی کا مقصد ظاہر ہو گیا:	67	مادی زندگی اور ذمہّ داریاں:	78
غرائز پر قابو:	67	انسانی اقدار کی طرف رجحان:	78
غرائز کی سرکشی اور خودفراموشی:	68	انبیاء اور انسان سازی:	78
اجتماعی خواہشات اور اتقاء:	68	غلط خواہشات کا مقابلہ:	79
خودپرستی اور جرائم:	69	حق کی سربلندی اور خدا کی جزا:	79
بےراہروی اور تباہی کے اسباب:	69	شہادت کا عشق:	80
معاشرے کی بہت بڑی مشکل:	70	راہِ خدا میں موت:	80
نفاذِ قوانین کے وسائل:	70	حضرت حمزہؓ کا موت کے بارے میں نظریہ:	81
مجرمین کو سزا:	70	قیامت پر یقین اور فداکاری:	82
ترقی یافتہ ممالک اور ہولناک جرائم:	71	انسانی فطرت اور اخلاقِ کریمہ:	82
بےایمانی اور جرائم:	71		

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
فضیلت دوستی کی قدر و قیمت:	83	دین اور عقل سے بالاتر مسائل:	95
مجلس نمبر 3	84	فرشتوں کے وجود کی تائید:	96
انسانی زندگی کے تین اہم دن:	84	حیاتی عوامل کے پیشِ نظر مقصد ہوتا ہے:	96
آخرت کی پہلی منزل:	85	ناقابلِ تفسیر ہم آہنگی:	97
شک کے مشابہ یقین:	86	خلیوں کی طبعی خصوصیات:	98
حکمت اور مصلحت کا تقاضا:	86	نظم کے محافظ فرشتے:	98
اخلاقی تباہی سے حفظِ ماتقدم:	87	بدن میں خلیّوں کے فرائض:	98
موت کی یاد اور باطنی اصلاح:	87	خلیّوں کی مخصوص صفات:	99
عیب کے پردے ہٹتے ہیں:	88	خلیوں کی ہدایت تکوینی:	99
مومن اور جنت کا نظارہ:	89	فرعون کو موسیٰ کا جواب:	100
فرشتوں کا دیدار:	89	جسمانی ساخت اور خلیّوں کی ساخت میں مماثلت:	100
مکتب انبیاء میں فرشتوں کا تصوّر:	90		
فرشتوں کی فرض شناسی:	90	خلیّوں کے مواد اور تعداد کا فرق:	101
انبیاء اور وحی کا فرشتہ:	91	اعضاء و اعصاب کی ہمکاری:	102
فرشتوں کے ذمہ کام:	91	خلیّوں کی ہدایت تکوینی:	102
کائنات کا نظام اور فرشتے:	92	عالمی سطح پر تولیدات کا موازنہ:	103
نظم کائنات کو چلانے میں فرشتے واسطہ ہیں:	92	نر اور مادہ کے جنسی خلیّے:	103
حاملین عرش:	93	تولیدات کے توازن کی برقراری:	103
عرش کے معانی:	93	فرشتے یا خدائی رابطے:	104
عرش پر غلبہ:	94	انسانی عضو کی نارسائی:	104
فرشتوں کا مقام و منصب:	94	موت و حیات کا اصلی مالک:	104
غلط تاویل:	95	موت کے فرشتے کی ذمہ داری:	105
فرشتوں کا ادراک اور آگاہی:	95	موت اور خدا کی طرف بازگشت:	105

عنوان	صفحہ نمبر
ایک زندیق کو حضرت علیؑ کا جواب:	106
ایک دوسرے سے جُدا دو جہان:	107
خواب اور بیداری کا عالم:	108
بیداری کی پہلی علامت:	108
خدا سے مُلاقات کی محبت کا کیا معنی ہے:	108
دُنیا میں خودسازی کرنا:	109
دنیاوی زندگی کا آخری مرحلہ:	110
فرشتوں کا دیدار:	111
جنین کا قبض رُوح:	111
مرنے والا روحانی دباؤ کا شکار ہوتا ہے:	112
گناہگاروں کی توبہ:	112
افکار و اعمال کی اصلاح:	113
ضمیر کی پاکیزگی اور گناہ سے بچاؤ:	113
گناہوں پر پشیمانی اور سعادت کا حصول:	114
مرنے سے پہلے حقیقی توبہ:	114
مجلس نمبر 4	115
کورسی مارلیسن کی باتیں:	116
ہمیشہ روشن چنگاری:	116
کچھ فلاسفہ رُوح کی بقا کو نہیں مانتے:	117
رُوح کی سربلندی اور بقا:	117
رُوح ناشناختہ حقیقت:	119
موجودہ دور اور انسانی رُوح:	119
پیچیدہ اور لاینحل مسئلہ:	119
وحی اور انبیاء کا کلام:	120
رُوح یا معیارِ انسانیت	121
نفس کے معانی:	121
مرنے والے کی رُوح کو حاصل کرنا:	122
فرشتے اور متوفی کے درمیان گفتگو:	122
خدائی رُوح اور فرشتوں کا سجدہ:	123
منتخب رُوح:	124
زندہ مخلوق کی خصوصیت:	124
زندگی کی توانائیاں:	125
مادیون کا غلط تصّور:	125
انسان اور بندر کا رشتہ:	126
انسان کی خصوصی رُوح:	126
رُوح کی نسبت خدا کی طرف:	126
غیر مرئی لہریں:	127
رُوح اور نُور کی مشابہت:	128
امام جعفر صادقؑ کی ایک زندیق سے گفتگو:	128
رُوح خدا کا معنی:	129
انسانی شرافت کا سرمایہ	129
انسانی روح کی فوقیت	130
کمال مطلق کی صلاحیت:	130
انسان دو حیثیتوں کا حامل ہے:	130
روح اور بدن کے حالات:	131
مقتولین بدر سے رسولؐ اللہ کا خطاب:	131

عنوان	صفحہ نمبر
انبیاءکرام:	132
موت زندگی کا آغاز ہے:	132
مکتبِ انبیاءاور بے پناہ سعادت:	132
الیکٹرونی مغز اور زندہ مخلوق کا موازنہ:	133
مادہ پرستوں کے نزدیک زندگی کیا ہے:	133
ڈاکٹرارانی کی تشبیہ:	134
اصالتِ رُوح کی نفی:	134
غلط اور خلافِ واقعہ تصوّرات:	135
گزشتہ صدیوں کے غلط نظریات	135
اربعہ عناصر:	136
ڈاکٹرارانی کی غیر سنجیدہ باتیں	136
رُوح کی نفی پر راسل کو شک ہے:	136
گفتگو میں ادب کو ملحوظ رکھا ہے:	137
ڈاکٹرارانی کا تعصب:	137
روحیون کی توہین اور مادیوں کی تکریم:	138
ڈاکٹرارانی سے ایک سوال:	138
ذی رُوح کی پیدائش کے بارے میں قدیم نظریہ	139
عناصر اربعہ کا توازن:	139
ابوالحسین بصری کا نظریہ:	140
ڈاکٹرارانی کی غلط سوچ:	140
سائنسی ترقی اور روحیون کا نظریہ:	140
خدا پرست فلاسفہ اور رُوح کا نظریہ:	141
روحیون اور تجربی دلائل:	141
خواب اور رُوحوں سے رابطہ:	141
خواب اور مادی منطق:	142
خواب اور نفسیاتی تجزیہ:	143
خواب اور پُوری نہ ہونے والی خواہشات:	143
خواب کے بارے میں فرائڈ کا نظریہ:	143
خواب اور باطنی ضمیر:	144
ابنِ سیرین اور نفسیاتی تجزیہ:	144
خواب اور مستقبل:	144
مخفی حقائق کا انکشاف:	145
راز فاش کرنے والا خواب:	146
امام جعفر صادقؑ اور ابن ابی العوجاء:	147
مجلس نمبر 5	148
موت یا آخرت کی زندگی کا آغاز:	148
قضا اٹل ہے:	148
موت کی پہچان کے لیے انسانی کوششیں:	149
آیا موت ایک عدمی چیز:	149
ثنویہ کو جواب:	150
دوگانہ پرستوں کی غلط فہمی:	150
عدم ذاتی اور مستلزم عدم:	151
بُرائیاں عدم ہیں:	152
موت عدمی نہیں وجودی امر ہے:	152
موت کا قانون یا حکمت بھری روش:	153

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
معاشرے کی تعمیرِ نو:	154	سعادت ابدی کی ضمانت:	165
خلافِ مصلحت درخواست:	154	انسان اور حیات جاوید:	165
حیات کے ساتھ ساتھ موت کی نعمت:	155	انسانی صفات سے متصف ہونا:	166
نینداور بیداری کی علامتیں:	155	موت کے لیے تیار رہنے کے معنی:	166
موت اور نیند کا موازنہ:	156	انسان اور موت سے گریز:	167
موت اور نیندایسی جیسی ہیں:	156	احتضار کی حالت اور بدحواسی:	167
موت یا تقدیرالٰہی:	157	مومن کی نگاہ میں موت کیا ہے؟	168
زندگی اور موت کے آثار:	157	یا ثواب یا عذاب:	168
موت، خالق کی مخلوق ہے:	158	مومن کا قید خانہ اور کافر کی بہشت:	169
موت اور حیات کا مالک:	158	لاعلمی کی وجہ سے خوف:	170
ساری بحث کا نتیجہ:	159	نامعلوم ماحول اور حادثات کے خطرات:	170
ضروری یاددہانی:	159	مومن اور کافر کی موت میں فرق ہے:	171
ایک عدمی امر کی حکومت:	160	انجام سے آگاہی:	171
موت کا حکیمانہ عمل:	160	گناہگار مومنین:	172
احسن اور مستحکم نظام:	160	موت کی تعریف علیؑ کی زبانی:	172
موت کی شدید سختیاں:	160	بے فائدہ پشیمانی:	173
عالم غیب تک رسائی	161	مرتے وقت خدا کی رحمت کی اُمید رکھو:	174
مغزی لہروں کی ریکارڈنگ	162	فضلِ الٰہی کی اُمید:	174
سر کی طرف سے الیکٹریکی پیغامات:	162	خدا پر حُسنِ ظن:	175
اضطرابی حالت میں دماغی لہریں:	163	ہنگام مرگ اور کلمہ توحید:	175
احتضار کی حالت میں سخت دباؤ:	164	مجلس نمبر 6	176
حضرت علیؑ کا ایک فرمان:	164	دُنیا بازار ہے اور عمر اس کی قیمت:	176
اخلاق اور اعمال پر مکتبِ فکر کا اثر:	164	مفید اور مضر سودے:	177

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
سعادت اور بدبختی کا سامان:	177	روزانہ کا احتساب:	191
جس تجارت میں خسارہ نہیں:	178	صبح شام خدا کی یاد میں ہو:	191
لمبی آرزوئیں یا شیطانی پھندے:	179	محاسبہ نفس اور حفظ ما تقدم:	192
ایّام کے لحاظ سے عمر کی گنتی:	179	حسابِ قیامت سے چھٹکارا:	192
سانسوں کے حساب سے عمر کا اندازہ:	180	انسانوں اور حیوانوں کا باہمی فرق:	193
نفع اور نقصان کا معیار:	180	انسان کی تخلیق دو پہلو کی ہے:	194
زندگی کے سرمایہ اور کمپنی کے سرمایہ کا تقابل:	181	آزادی ایک قیمتی سرمایہ ہے:	194
حقیقی سعادت اور حقیقی شقاوت:	181	غریزے کو ٹھوکر مار کر عفت کی حفاظت کی جاتی ہے	194
حضرت یوسفؑ کی خاتمہ بالخیر کی دُعا:	182		
علیؑ کا سوال اور رُسولؐ پاک کا جواب:	182	کرۂ ارضی پر فرمانروائی:	195
حقوق العباد سے بے اعتنائی:	183	انسان اور کرۂ ارضی کی آبادی:	195
آخری عمر میں قرض کا احساس:	183	انسان اور انتخاب کا حق:	196
حق وانصاف کی وصیت:	183	یا فرشتہ سے افضل یا حیوان سے بھی پست:	196
مرنے کے وقت اعمال سے آگاہی:	184	ایک ہی وجود میں عقل اور شہوت کا اجتماع:	198
مرنے والے کو نامہ اعمال دکھایا جاتا ہے:	185	انسان اور انتخاب کی آزادی:	198
انسان اور بہشت یا دوزخ کا درمیانی فاصلہ	185	عقل سوئی ہوئی ہے اور خواہشات بیدار ہیں:	199
ابوذرؓ کے اپنے فرزند کی موت پر کلمات:	186	عقل قیدی ہے اور خواہشات حاکم:	199
ناقابلِ قبول درخواست:	187	خدائی تعلیمات اور احیاء انسانیت:	200
شخصیت بنانے والے سودے:	188	صنعتی تمدن میں زمین کی آبادکاری:	201
مالی حسابات کی جانچ پڑتال:	189	انسان اور کرۂ زمین کی آبادکاری:	201
محاسبہ نفس:	189	انسان کی پہچان نہیں ہوسکی:	201
ابوذرؓ کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیتیں:	189	حیوانی پہلو کی کسی حد تک شناخت ہوچکی ہے:	202
مفید احتساب:	190	آیا فکر واندیشہ مادی چیز ہے:	202

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
انسان اور مرنے کے بعد کی زندگی:	203	مجوسی اور زمانہ جاہلیت کے عرب:	214
اسلام کے زیرِ سایہ خودسازی:	203	اللہ کی رضا بھی مُردوں کو دفن کرنے میں ہے:	215
انبیاء کرام کی ماموریت:	203	طلا اور جواہرات سے مُردوں کی زنیت:	215
جنگل کا قانون اور ڈنڈے کی حکومت:	204	فراعنہ مصر کی لاشیں:	216
صنعتی دور میں اخلاقی پستی:	204	موسیٰ کے زمانے کا فرعون تہ خانے میں:	216
موجودہ دور میں اسلحہ کی دوڑ:	204	لاش کی عجائب گھر میں منتقلی	217
انسانیت کی راہ میں تگ ودو:	205	ناجائز اور ممنوع کام:	219
عقل کی راہنمائی سے استفادہ کرو:	206	متوفی کے احترام کی حدود:	219
غلط اور صحیح رستے کی پہچان:	206	تجہیز وتکفین میں جلدی کی جائے:	219
عقل کی اتباع کا نتیجہ:	207	متوفی کا غسل وکفن:	220
حقیقی انسان کا معیار:	208	مُردے کے احترام میں حد سے تجاوز:	220
امام کی نظر میں عقلمند انسان:	208	غُسل مس میت:	222
صنعتی تمدن میں اکثریت کا طریقہ کار:	209	میت کو زیادہ نہ چھوا جائے:	222
غلط سوچ اور باطل تصّور:	209	طبّی اصولوں کے خلاف کام:	223
ایمان اور علم کا تقابل:	210	قانونی مشکل:	223
ساری گفتگو کا خلاصہ:	210	مُسلمانوں کی رُسول پاکؐ سے سرگوشی:	224
مجلس نمبر 7	212	منافقین کی سرگوشیاں:	224
مُردوں کو دفن کرنا:	212	خودغرض اور دولت مندوں کا طریقہ کار:	224
کوّے نے دفن کی عملی تعلیم دی:	212	ضروری کاموں کے لیے سرگوشی:	225
مُردوں کا جلانا:	212	صدقہ کی ادائیگی کا حکم:	225
مجوسی اور اُن کے مُردے:	213	میت اور اس کے پسماندگان کا احترام:	226
مُردوں کو نذرِ آتش کرنا:	213	معرفت اور بصیرت کا سبب:	227
انبیاء اور مُردوں کی تدفین:	214	خلافِ شرافت کام:	227

عنوان	صفحہ نمبر
احترام انسانیت:	228
رحمت اور عذاب قبر کے لحاظ سے قبر کا مقام:	228
فشارِ قبر	229
مُحکم کاری کی اہمیت:	229
حدیث کی وضاحت:	229
ایک سوال اور اس کا جواب:	230
کام ٹھوس طریقوں پر انجام دینا چاہیے:	230
سعد بن معاذ اور فشارِ قبر:	231
ناجائز کاموں کا کفّارہ:	232
قبر میں مومنین کی جزا:	232
بے ایمان لوگوں کی سزا:	232
سوال قبر کے بارے میں:	233
قبر میں خالص مومنین اور خالص کفّار سے سوال کیا جائے گا:	233
امام محمد باقرؑ کی زرارہ سے گفتگو اور چند لوگوں کے بارے میں خاص ہدایت:	233
کم فکر والے مستضعف افراد:	234
جو لوگ نہ مومن ہیں نہ کافر:	235
غلط ماحول میں پھنسے ہوئے افراد:	236
جن کا عُذر قابلِ ہے:	236
دین کو نہ جاننے والے موحّدین:	237
اصحاب اعراف:	237
قبر سے کیا مراد ہے:	238
علامّہ مجلسی کا فرمان:	239
مُرحوم فیض کاشانی کے الفاظ:	240
کائنات کو ایک حیثیت کا حامل سمجھا جاتا ہے:	241
جن حقائق تک رسائی حاصل نہیں ہو سکی:	241
ناقابلِ عبور فکری بھُول بھلیاں:	242
موت اور رُوح و بدن کی علیحدگی:	242
مادی اور محسوس دباؤ:	242
معنوی اور غیر محسوس دباؤ:	243
محسوس اور غیر محسوس شکنجے:	243
فشارِ قبر سے مراد:	244
مجلس8	245
برزخ یا مرنے کے بعد کا عالم:	245
برزخ کا ثواب وعقاب:	245
شُہداٗ کی جزا:	245
مومنین کی ارواح اور برزخی بہشت:	246
قیامت سے پہلے عذاب:	246
فرعون والوں کو قیامت میں عذاب:	247
تناسخ اور دانشمندوں کا ردّعمل:	247
تناسخ اور دُنیا میں واپسی کا مسئلہ	248
ارتقاء پانے والے اور حدِ کمال تک پہنچنے والے سعادت مند:	248
خداؤں اور بزرگوں کی راہیں:	249
کمال مطلق کا حصول:	249

عنوان	صفحہ نمبر
انتہائی پستی اور بدبختی:	249
انسانی یا حیوانی صُورتیں:	250
تکمیل طلب تناسخ:	250
مکتب اسلام مین تناسخ کی حقیقت	251
غلط سوچ:	251
سزا اور جزا:	252
اخلاقی معیار کے مطابق ہی شکلیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں	252
درندہ صفت انسان:	253
حیوانی صورت میں حشر ونشر:	254
انبیاء کی تعلیمات کے خلاف نظریات:	254
خدا کا انکار، قیامت کی تکذیب:	254
واضح دینی راستے سے انحراف:	255
رُوح کی تخلیق کے بارے میں دو نظریے:	256
جسم سے پہلے رُوح کی تخلیق:	256
شیخ صدوق کا فرمان:	257
رُوح کی جسم کے ساتھ تخلیق:	257
انسانی رُوح یا دوسری مخلوق:	258
زندیق کا سوال اور امام کا جواب:	258
امام کے فرمان سے استفادہ:	259
صدر المتالہین کا کلام:	259
تناسخ باطل ہے:	260
رُوح اور زندگی میں رُونما ہونے والے واقعات:	260
دینی اور علمی لحاظ سے تناسخ کا بطلان:	261
مومن اور برزخ کی نعمتیں:	261
مشرک اور برزخ کا عذاب:	262
انسان کے زندگی اور موت کے ساتھی:	262
متوفی کا قبر میں ہم نشین:	263
عمومی افکار اور اعمال کا موازنہ:	264
نامہ اعمال کا عنوان:	264
بے غرض لوگوں کی رائے:	265
نیکیوں کے گواہ:	265
انجام فرائض کا خاتمہ:	266
برزخ اور قیامت کا باہمی فرق:	266
برزخ اور نعمت وعذاب میں افزائش:	266
نوجوان نسل کے ازدواج میں امداد کرنا:	267
نیک کام کی بُنیاد:	267
بُرے کاموں کی بُنیاد:	268
صدقہ جاریہ کا ثواب:	268
متوفی کا دائمی ثواب:	269
مرجانے والوں کے لیے صدقات:	270
والدین کی نیک اولاد:	270
برزخ میں متوفی کا حصّہ	271
مرنے سے پہلے وصیت:	272

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
اپنے وصی خود بنو:	272	میلادِ پیغمبرؐ کی خوشخبری:	283
مجلس نمبر 9	273	ایک خواب اور کئی غیبی خبریں:	283
آسمانی ادیان کی بُنیاد:	273	سچے خواب یا خدا کا الہام:	283
غیر محسوس حقائق:	273	خواب میں خدا کا کلام:	284
دین میں غیب مطلق کا تصوّر:	274	غیب سے انسان کی دلچسپی:	285
انسانی عقل کی نارسائی:	274	غیب جاننے کے دعویدار:	285
دین میں نسبتۂ غیب کا تصوّر:	275	جادوگری وغیرہ کے نقصانات:	286
برزخ میں مومن کی آرزو:	275	امام جعفر صادقؑ سے ایک سوال:	286
دولت جمع کرنے والوں کی برزخ میں آرزو:	275	غیب گو کی تصدیق قرآن کی تکذیب ہے:	287
برزخ والوں کے لیے قیامت کے غیب:	276	غیب بتانے کے لیے علم نجوم کی حیثیت:	288
بہشت والے دوزخ والوں سے پُوچھیں گے:	276	فریب کار اور لوگوں کو دھوکہ دہی:	288
لوگ اپنے کل سے بے خبر ہیں:	277	موت اور عالمِ برزخ کے مشاہدات:	289
لاعلمی کی وجہ سے مسرّت اور خوشی:	277	حضرت علیؑ وادی السلام میں: مُردوں سے باتیں	289
علم غیب کی آرزو:	278		
بے جا توقع:	278	سلمان سے پیغمبرؐ کا فرمان:	290
غیب کا علم صرف خدا جانتا ہے:	278	سلمانؓ قبرستان میں:	291
خدا کے حکم سے غیب سے آگاہی:	279	سلمان سے مُردہ کی باتیں:	291
سچّے خوابوں کے ذریعہ غیب کا علم:	279	آخری لمحات میں سلمان کی دُعا:	292
مکّہ میں پانی کی قلت اور کنوئیں کی کھُدائی:	280	رُوحوں کو بُلانے کی وبا:	292
قبیلہ جرہم نے چاہ زمزم کو بند کردیا:	281	ارواح سے رابطہ قائم کرنے والی انجمنیں:	293
الہام پر مبنی خواب:	281	رُوحوں کے بلانے کا کمرہ:	294
نامعلوم جگہ کی شناخت	282	سعدی کی رُوح حاضر ہے:	294
عبدالمطلب کا خواب:	282	سعدی کی رُوح اور عربی شعر	295

عنوان	صفحہ نمبر
سعدی کی رُوح روٹھ گئی:	295
فال کے ذریعہ غیب کا علم حاصل ہونا:	296
سچے خواب:	296
مکتب مادی اور چار بُنیادی اُصول:	297
سچے خواب:	297
باپ بیٹے کی گفتگو:	297
انگوٹھی جو گم ہوگئی:	298
نامعلوم چیز جو مرنے کے بعد معلوم ہوئی:	298
قرض خواہ اور قرضے کی تعیین:	299
مادی منطق کی نارسائی:	299
عالمِ خواب میں مُردوں کی ارواح سے رابطہ:	299
ایک خواب جس کی امام نے تعبیر فرمائی:	300
عالمِ برزخ اور نسبتۂ غیب:	300
عقلمند شخص کی علامتیں:	301
قرآن مجید انسانوں کو نصیحت کرتا ہے:	302
ارشادِ ربّ العزت ہے:	302
پیغمبرؐ اور آئمہؑ اطہار کی دلسوز نصیحتیں:	302
رُسول پاکؐ کا فرمان:	302
مجلس نمبر 10	304
قیامت سے پہلے دُنیا کا خاتمہ:	304
کائنات کا خاتمہ یا بُنیادی تبدیلی:	304
بالذات ازلی اور ابدی:	305
نہ اوّل کی ابتدا ہے نہ آخر کی انتہا:	305
مخلوقات کا آغاز اور انجام:	306
خالقِ کائنات جس کے نہ تو آغاز کی حد ہے اور نہ انجام کی	306
کائنات کے بارے میں غلط نظریہ:	307
انبیاء کے اقوال اور آج کا علم:	307
ازلی اور ابدی کا معنیٰ:	308
عالمِ تصوّر میں بے انتہا کی مثال:	308
آفاقی اجرام کی تخمینی عمر:	308
سُورج کی گذشتہ اور آئندہ زندگی:	309
اجسام کی پیدائش میں مختلف نظریات:	309
کائنات کے قدیمی ہونے کا نظریہ:	310
دہریوں کا نظریہ:	310

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مجلس نمبرا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِیَةٌ لَّا رَیۡبَ فِیۡهَا وَ لٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۝۵۹ سورہ مومن

مکتب اسلام کے نقطہ نظر سے قیامت اور روزِ جزا پر ایمان ضروریات دین کے ارکان میں سے ایک رُکن اور قطعی اعتقادی اصول میں سے ایک اصل ہے اور قرآن مجید کی آیات پیغمبر اسلام اور آئمہ طاہرین علیہم السلام کی ہزاروں روایات اس بارے میں موجود ہیں۔ جو شخص روزِ جزا کو نہیں مانتا اور اس کا انکار کرتا ہے اس کا دین اسلام پر ایمان نہیں ہے۔ اور نہ ہی اُسے قرآن شریف کے پیروکاروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

صحیح اور سچے مسلمان پیغمبر السلامؑ پر نازل ہونے والی وحی الٰہی پر بھروسہ اور اطمینان کرتے ہوئے اُسے خدا کا قطعی وعدہ سمجھتے ہیں اور یقین جانتے ہیں کہ وہ خلافی نہیں کرتا، یقینا قیامت کا دن آ کر رہے گا عدلِ الٰہی کا ترازو برپا ہو کر رہے گا اور لوگوں کے حساب و کتاب کی جانچ و پڑتال ضرور ہوگی۔ نیک لوگ اپنے اعمال کی جزا پائیں گے اور بدکاروں کو ان کے اعمال کی سزا مل کر رہے گی۔

مکتب اور اس کی تاثیر:

انسان خواہ کسی بھی مکتب کا پیروکار ہو اور عملی طور پر اس کی پیروی بھی کرتا ہو، چاروناچار اس مکتب کے نقطہ نظر سے ضرور متاثر ہوتا ہے اس کی تعلیمات کی روشنی میں سوچتا اور غور وفکر کرتا ہے اور انسان اور کائنات کے بارے میں اپنے تصورات کو اس مکتب کے نظریات کے مطابق ڈالتا ہے اور اس عظیم کائنات اور اس کی تخلیق کو اسی مکتب کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ انسان اور انسانی اقدار کو اسی مکتب کے پرتو میں پہچانتا ہے۔ اپنے اچھے اور بُرے اخلاق اور اعمال کو اسی مکتب کے معیار پر پرکھتا ہے۔ خلاصہ کلام کسی بھی مکتب کے پیروکار اپنے اندر اپنے مکتب کے مطابق نظریات رکھتے ہیں۔ اس کائنات کے بارے میں بھی ان کا طرز تفکر اسی مکتب کے مطابق ہوتا ہے۔

اس مقصد کو کسی حد تک واضح اور روشن کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے بارے میں اسلام اور مادیت کے مکاتبِ فکر کا باہمی تقابل کیا جائے اور دیکھا جائے کہ ان دونوں مکاتب فکر کا ان کے پیروکاروں پر کیا اثر پڑتا ہے تاکہ معلوم ہوجائے کہ کائنات کے بارے میں ہر دو مکاتب فکر کا اختلاف کس حد تک آرا اور عقائد کو متاثر کرتا ہے اور ان

دونوں گروہوں نے انسان اور کائنات سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے ان کا کس حد تک بنیادی اختلاف ہے۔

(۱) مادیت پرست مکتب کے پیروکاروں کا نظریہ ہے کہ خواہ انسان ہو یا جہان، دونوں چیزیں سو فیصد مادی تخلیق ہیں اور مختلف اور گونا گوں طبیعی علل واسباب اور مختلف موارد کے فعل وانفعال اور اُتار چڑھاؤ کی وجہ سے اتفاقی طور پر معرضِ وجود میں آ گئے۔ نہ تو ان کی پیدائش میں کسی غیر مادی طاقت کا عمل دخل ہے۔ اور نہ ہی طبیعی علل واسباب کے بغیر کسی اور چیز نے اُن کی کمیت وکیفیت کا اندازہ لگانے میں مداخلت کی ہے۔

جب کہ مکتب اسلام کے پیروکاروں کا نظریہ یہ ہے کہ اس کائنات کا انحصار صرف مادہ اور مادی موجودات میں نہیں ہے بلکہ یہ تو عالم وجود ہستی کا صرف ایک حصہ ہے۔ اور کائنات کے وجود کا ایک اور حصہ بھی ہے جو مادے سے بالاتر اور مادی اشیاء کے ماوراء ہے۔ اس کے علاوہ اُن کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ مادہ کی ہست وبود اسی طرح تمام مادی موجودات کی ہستی ایک ایسے خدا کی طرف سے ہے جو خود مادہ سے مبرا اور تمام مادی نقائص سے پاک ومنزہ ہے۔ اُس نے ہی اپنی لایزال اور بے زوال قدرت کے ذریعہ ہے عالم کو وجود کی نعمت عطا کی اور موجودات عالم کو خلقت ہستی سے نوازا اور وجود میں آنے والی ہر چیز میں اپنے حکیمانہ اندازے کو پیشِ نظر رکھا۔ انا کل شی خلقناہٗ بقدرٍ۔ (یعنی ہم نے تمام موجودات کو حکمت بھرے پیمانے پر رکھ کر پیدا کیا[1])

حکمت پر مبنی اندازہ:

(۲) مادی مکتب کے پیروکار کہتے ہیں کہ جہان اور انسان بے مقصد موجودات ہیں۔ ان کی تخلیق میں نہ تو کوئی منصوبہ مدنظر رکھا گیا اور نہ حکیمانہ نقشہ پیش نظر رہا ہے۔ بلکہ یہ دونوں اندھی اور بے شعور طبیعت کے بغیر کسی حساب وکتاب اور مصلحت کے آدھمکیں اور کسی پیش بینی کے بغیر کروڑوں اربوں علل واسباب کی بدولت موجودہ صورت اختیار کر چکی ہیں۔

انسانی فکر کی نارسائی:

مگر مکتب اسلام کے پیروکار کہتے ہیں کہ حکمت والے خدا کی مصنوعات اور تخلیقات میں کوئی بھی لغو اور بے فائدہ چیز موجود نہیں ہے اور تمام کائنات میں کوئی بھی مخلوق عبث اور بے مقصد پیدا نہیں کی گئی۔ اور اگر کسی مقام پر انسان کسی چیز کی تخلیق کے اسباب واسرار کو نہیں سمجھ پایا تو اس کی وجہ اس کی کوتاہ فکری اور نقص علمی ہے۔

---

[1] سورۃ ۵۴ آیہ ۴۹

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝۱۶ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۹

''ہم نے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان موجود ہے بیکار پیدا نہیں کیے۔ہم نے انہیں حق اور حکمت ومصلحت کے بغیر پیدا نہیں کیا،لیکن بہت سے لوگ اس بات سے آگاہ نہیں ہیں'[1]'

خرامیدن لا جوردی سپر
ہمی گرد گردین ماہ ومہر
پلندار ازروی باز یگری
سراپردہ ایں چنین سرسری
درایں پردہ یک رشتہ بیکار نیست
سررشتہ بر ماپدیدار نیست
نہ رین رشتہ سری توان تافتین
نہ سررشتہ رامی تو ان یافتن

''یعنی یہ آسمان اور سورج وچاند کے چکر ایسے ہیں جنہیں کھیل تماشا نہیں سمجھنا چاہیے۔امر پردہ پر کوئی ایک چیز بھی بیکار نہیں ہے۔یہ اور بات ہے کہ ان کا سررشتہ ہم پر واضح نہیں، نہ تو اسے سلسلے سے منہ موڑا جاسکتا ہے اور نہ ہی اُن کے سررشتہ کی تلاش کی جاسکتی ہے۔

مادی اور اسلامی مکتب فکر میں انسان کی حیثیت:

(۳) مکتب مادی کے پیروکار، انسان کو صرف ایک حیثیت کی حامل مخلوق سمجھتے ہیں، ان کا نظریہ ہے کہ انسان مادہ اور ماوراآثار خواص کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔اس کے اعضا ہوں یا اجزاء ظاہری قوا ہوں یا باطنی، اس کے عقل وہوش ہوں یا دوسری اندرونی وبیرونی سرگرمیاں، غرض سب کچھ مادی ہیں اور مادہ کے فعل وانفعال اور اُتار چڑھاؤ سے معرض وجود میں آئی ہیں۔بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ انسان کے افکار اور سوچیں بھی مادی عوامل واسباب کا نتیجہ ہیں جو مغز میں جاگزین

---

[1] سورۃ ۴۴ آیات ۳۸،۳۹

ہیں اور معنوی صورت اختیار کر چکی ہیں۔

لیکن مکتب اسلام کے پیروکاروں کا نظریہ یہ ہے کہ انسان صرف ایک حیثیت کا عوامل نہیں بلکہ اس میں دو حیثیتیں پائی جاتی ہیں ایک تو یہ کہ وہ طبعی مخلوق اور عالم کے طبیعی عناصر سے بنا ہوا ہے، اس لیے وہ مادی حیثیت کا مالک ہے اور قرآن شریف نے بھی انسان کے اس پہلو کو پیشِ نظر رکھ کر متعدد آیات میں اس بارے میں گفتگو کی ہے، چنانچہ کہیں پر فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا، کہیں پر فرمایا ہے مٹی کے نچوڑ سے، کہیں پر فرمایا لیس دار کیچڑ سے، کہیں پر فرمایا بد بودار دلدل سے، اور کہیں فرمایا نطفہ سے پیدا کیا، لیکن چونکہ آدمی کی سرشت اور نہاد میں خدائی رُوئی رُوح مستقر ہو چکی ہے۔ لہٰذا وہ معنوی ذخائر کا حامل، الٰہی امانت کا اہل اور خلافتِ الٰہیہ کا مستحق قرار پا چکا ہے اور یہی اس کا رُوحانی و معنوی پہلو ہے۔ قرآن مجید نے کئی آیات میں انسان کی ان جہات اور صفات کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور اس کے مادی پہلو کے ساتھ ساتھ اس کی معنوی اور روحانی حیثیت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے، جن میں سے ایک جگہ یہ بھی ہے جہاں ارشاد ہے:

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝۸
ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (سورہ سجدہ)

''یعنی خداوندِ عالم نے انسان کی خلقت کا آغاز مٹی سے کیا۔ پھر نسل انسانی کو منی کے خلاصہ میں قرار دیا جو کہ پست اور بے قدر و قیمت پانی ہے، لیکن جب اسے رحم میں معتدل بنا دیا پھر اس میں اپنی روح پھونک دی۔''[1]

دو حیثیتوں کا حامل انسان

(۴) مادی مکتب کے پیروکار جو خود کو بے سمجھ مادہ مخلوق اور اتفاقیہ اسباب کا معلول سمجھتے ہیں، یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ وہ بھی دوسرے حشرات اور جانوروں کی مانند ایک اتفاقیہ مخلوق ہیں جو طبیعت کے کسی سوچے سمجھے منصوبے کے بغیر ہی معرضِ وجود میں آ گئے ہیں۔ نہ تو ان کے وجود میں لانے والا اپنے عمل سے آگاہ تھا اور نہ ہی اس کی تخلیق کے کوئی مقاصد کارفرما تھے، اور نہ ہی وہ اپنے وجود میں لانے والے نادان اور بے سمجھ مادہ کے سامنے کسی قسم کے جوابدہ ہیں۔

لیکن مکتب اسلام کے پیروکار جو خود کو خدا کی مخلوق سمجھتے ہیں، ان کا یہ عقیدہ ہے کہ دانا و بینا خالق نے انھیں مصلحت اور حکمت کے مطابق پیدا کیا ہے۔ انہیں عقل و ہوش کی قدرت، توحیدی فطرت، اخلاقی اقدار اور خودسازی و ارتقاء کی دوسری

---

[1] سورہ ۳۲ آیات ۷ تا ۹

بہت سی نعمتوں سے مالا مال کر دیا ہے، ہدایتِ تشریعی کے ذریعہ حق اور باطل کی راہیں دکھادی ہیں اور بلندی اور پستی کی راہوں کے انتخاب میں انہیں آزاد اور خود مختار بنایا ہے اور ساتھ ہی انہیں یہ بھی باور کرا دیا ہے کہ وہ بے مقصد، بے کار اور فضول پیدا نہیں کیے گئے بلکہ اپنے خالق یکتا کے سامنے پیش ہوکر جوابدہ بھی ہونا ہے اور اپنے انجام دیے ہوئے کاموں کے بارے میں ان سے پوچھ گچھ بھی کی جائے گی۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾ (القیامہ)

''یعنی آیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے فضول اور غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔''[۱]

اللہ کی بارگاہ میں جوابدہ ہونا ہے

(۵) مادی مکتب کے پیروکار یہ تصور کرتے ہیں کہ انسان کی زندگی بھی دوسرے جانوروں کی طرح صرف اسی مادی اور محسوس دنیا تک ہی محدود ہے اور جب وہ اپنی طبیعی موت یا کسی دوسرے طریقہ سے مر جاتا ہے۔ تو مکمل طور پر اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اس کے تمام حیاتیاتی پہلو ختم ہو جاتے ہیں اور سوائے اس کے مُردہ جسم کے کچھ بھی باقی نہیں رہتا اور یہ جسدِ خاکی بھی تھوڑے سے عرصے میں نیست و نابود ہو جاتا ہے اور اس کے تمام عناصر اپنے طبیعی خزانوں کو واپس لوٹ جاتے ہیں، قرآن مجید اس مادہ پرست اور عالمِ آخرت کا عقیدہ نہ رکھنے والے گروہ کے متعلق فرماتا ہے۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۷﴾ (الروم)

''یعنی ان لوگوں کا علم صرف دُنیا کی ظاہری اور مادیات کی محسوس باتوں تک محدود ہے اور وہ آخرت اور اس کی سزا و جزا سے غافل ہیں۔''[۲]

غافل نادان:

مکتب اسلام کے پیروکار، انسان کو حقیقت اور خدا کی وحی کے آئینہ میں دیکھے اور اُسے قرآن شریف کی آیات کے مطابق پہنچانتے ہیں اور اُن کا عقیدہ ہے کہ انسان کی زندگی ختم ہو جانے اور موت کے آجانے کی وجہ سے اس کی صرف جسمانی زندگی اور مادی و دنیاوی حیات ختم ہو جاتی ہے لیکن اس کی روح اسی طرح باقی اور برقرار رہتی ہے۔ وہ مرنے کے بعد ایک اور عالم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور اپنی نئی قیام گاہ میں نئے حالات کے مطابق ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔

---

[۱] سورہ ۷۵ آیت ۳۶

[۲] سورۂ ۳۰ آیت ۷

موت اور نئی زندگی کا آغاز:

مادی مکاتب فکر کا خدائی مکاتب فکر سے عموماً اور انبیاء کے پیروکاروں سے خصوصاً اس بارے میں زبردست فرق ہے جس کی تشریح کی یہاں پر ضرورت نہیں ہے اور ان چند باتوں کی تشریح بھی اس لیے کی گئی ہے تاکہ مادی مکتب فکر کا کسی حد تک اسلامی مکتب سے جو اختلاف ہے اس کا اصولی فرق واضح ہو جائے اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ان دو مکاتب کا اپنے پیروکاروں کی طرز فکر اور سوچ پر کس حد تک اثر پڑتا ہے۔

مادہ پرستوں اور خدا پرستوں کے عقیدہ کا فرق:

کیا یہ بات ممکن ہے؟ کہ مادہ پرست لوگ جو کہ کائنات اور انسان کو ایک اتفاقی تخلیق اور بے ارادہ اور بے علم مادہ کی حرکات کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کی مانند اپنا نظریہ رکھتے ہوں جو مکتب اسلام کے پیروکار ہیں اور جن کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ کائنات اور انسان اس خدائے علیم وقدیر کی پیداوار ہیں جس نے اپنے حکمت بھرے ارادے کے ساتھ اُنہیں خلق فرمایا ہے؟

آیا جو لوگ انسان کو صرف ایک حیثیت کا حامل اور صرف مادی ہی سمجھتے ہیں اور جن کی زندگی کا اصل مقصد عیاشی اور لذت پرستی ہے وہ ان لوگوں کی مانند سوچ سکتے ہیں جو مکتب اسلام کے پیروکار ہیں اور جن کی زندگی کا اصل مقصد اس میں اعلیٰ مدارج کا حصول اور کمال انسانیت کی آخری حدود تک رسائی ہوتا ہے؟

آیا جو لوگ انسان اور کائنات کو مادیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اپنے وجود کو بھی بے سمجھ مادہ اور طبیعت کے سوچے سمجھے عوامل کا مرہونِ منت سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو اندھے اور بے شعور خالق کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھتے اُن کے افعال وکردار اُن لوگوں کی مانند ہو سکتے ہیں جو خود کو عالم اور حکیم ذات کی مخلوق سمجھتے ہیں وہ اپنے آپ کو اس کے سامنے جوابدہ جانتے ہیں؟ جو اُن کے ظاہری اور باطنی حالات سے آگاہ ہے اور قیامت کے دن اُن کا حساب وکتاب اسی ذات کے ہاتھ میں ہوگا؟

عالمِ آخرت کا قبول اور انکار:

المختصر ایک مادہ انسان کی طرز فکر کئی لحاظ سے اس شخص سے بالکل مختلف ہے جو مکتب اسلام کا پیروکار ہے۔ ان مختلف افکار میں سے ایک بنیادی فرق آخرت کے مسئلہ کے بارے میں ہے۔ مادی لوگ انسان کی زندگی کو دُنیا کی چندروزہ زندگی تک ہی محدود سمجھتے ہیں اور اُن کا نظریہ یہ ہے کہ نیک اور بداعمال کی جزا یا سزا انسان کو اسی چندروزہ زندگی ہی میں مل جاتی ہے اور موت کے ساتھ ہی سب چیزوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

لیکن اسلام کے مکتب کے پیروکار یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ موت کے آ جانے کے ساتھ اور زندگی کی بساط لپٹ جانے کے بعد انسان ایک اور جہان کی طرف منتقل ہوجاتا ہے جہاں سے اس کی ابدی زندگی کا آغاز ہوگا اور اپنے نیک و بد اعمال کی جزا اور سزا اس دُنیا میں پانے کے علاوہ بھی اس جہان میں سزا یا جزا کا مستحق قرار پائے گا۔

ادیانِ الٰہی کی بُنیاد:

مبداء اور معاد پر ایمان، مکتب انبیاء میں دو اہم اعتقادی ستون ہیں جن پر تمام آسمانی ادیان کی بُنیاد رکھی گئی ہے۔ انبیاء کرام کی دعوت کا سر آغاز بھی یہی تھا کہ لوگ غیب اور ان غیر محسوس حقائق پر ایمان لائیں جن پر خدا کا دین استوار ہے۔ اور اہم ترین غیب جو خدائی ادیان میں قطعی اور لازم شرط کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ خدا اور قیامت پر ایمان ہے۔ البتہ ان دو چیزوں پر ایمان کے جو راستے ہیں اور لوگوں کو منزلِ مقصود تک پہنچاتے اور اُنہیں مبداء اور معاد کا مقصد بناتے ہیں وہ مختلف ہیں۔

خدا پر ایمان کا راستہ:

خدا پر ایمان کا راستہ ایک تو فطری معرفت ہے جو تمام انسانوں کی سرشت میں داخل ہے اور اندر ہی اندر سے انسان کو پکار رہی ہوتی ہے اور اُسے خدا کی تلاش کے لیے آمادہ کرتی ہے اور دوسرے اس کی عقل ہے کہ اگر انسان آزاد ہو کو سوچ اور ہر قسم کی لجاجت اور تعصب سے ہٹ کر اُسے کام میں لائے۔ کائنات کی اس کتاب میں غور و فکر سے کام لے اور خدا کی کچھ حکیمانہ آیات کا غور سے مطالعہ کرے تو اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہو جائے گا کہ یقیناً اس جہان کا کوئی صاحبِ حکمت اور دانا پیدا کرنے والا ضرور ہے جس نے اپنے پختہ نظام کے تحت اس جہان کو برقرار رکھا ہوا ہے اور اس عظیم کائنات کو اپنے عالمانہ انداز کے ساتھ متحرک کیا ہوا ہے تو اسی عقلی حساب و کتاب اور سوچ سمجھ کے ساتھ عقلمند انسان تہہ دل کے ساتھ خدا پر ایمان لے آئے گا اور مطمئن ہو جائے گا کہ یہ حیرت انگیز اور تعجب آور نظام نہ تو اندھی اور بے شعور طبیعت و نیچر کا نتیجہ ہے اور نہ ناآگاہی اتفاق اور تصادم کی پیداوار ہے چنانچہ پریکٹیکل فزکس کے استاد جارج ہربرٹ بلونٹ GEORGHERBERT BIUNT کہتے ہیں:

''بالفرض مان لیا جائے کہ کائنات کا نظام خود بخود یا اتفاقات کے نتیجہ میں وجود میں آ گیا ہے تو یہ انسانی عقل و شعور کی توہین ہوگی اور اس طرح سے ہر سوچنے والا شخص اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس کائنات کے لیے ایک ایسے خالق کو تسلیم کرنا چاہیے

کہ جو ناظم بھی ہو، اس طرح سے وہ اپنی زندگی کے تمام مسلمات اور بدیہی اُمور میں خدا شناسی کو اہمیت دے گا۔[1]

خالق کائنات کے وجود کی بداہت اور واشگافی قرانی مجید میں انبیاء کی زبانی یوں مذکور ہوئی ہے:

"قالت رسلهم انی الله شك فاطر السموٰات والارض۔"

"یعنی خدا کے پیغمبروں نے لوگوں سے کہا کیا آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے خدا کے بارے میں کوئی شک وشبہ ہے[2]؟

خدا کی وحی پر ایمان اور انبیاء پر نازل ہونے والی وحی کی صحت ودرستی پر ایمان اور یقین ہی قیامت پر ایمان لانے کا ایک ذریعہ ہے کیونکہ معاد دین کے غیبی مسائل میں سے ہے جس کا تعلق آئندہ کے نامعلوم اوران دیکھے حالات سے ہے انسان خدائی وحی اور انبیاء علیم السلام کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے اس روز پر ایمان اور یقین پیدا نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور اور زمانے میں ایسے بہت سے افراد گزرے ہیں جو فطری معرفت کی کشش کی بنا پر خدا کی تلاش میں نکلے، اپنی عقلوں سے بھی کام لیا خدائی آیات کا مطالعہ بھی کیا۔ صاحب حکمت اور صاحب علم خالق پر ایمان بھی لے آئے اور آفاقی مطالعہ کے لحاظ سے خدا پرستوں کی صفت میں بھی قرار پائے۔ لیکن چونکہ خدا کی وحی اور انبیاء کی بعثت کے قائل نہیں تھے، لہٰذا عالم آخرت سے بے خبر رہے اور انہیں اس دوسرے جہان کی معرفت کا کوئی اور ذریعہ نہ مل سکا کہ روز جزا پر ایمان لے آتے اور اس روز میں خدا کی سزا اور جزا سے آگاہی پیدا کرتے۔

قیامت اور انبیاء:

قیامت کا قیام ان امور میں سے ہے جن کے واقع ہونے کے بارے میں خداوند عالم کی حتمی قضاء کا تعلق ہے اور بغیر کسی شک وشبہ کے وہ دن آ کر رہے گا اور اس حقیقت کو خداوند عالم نے ہر دور اور زمانے میں وحی کے ذریعہ اپنے تمام انبیاء کو مطلع فرمایا اور اُنہوں نے ادائے فریضہ کے طور پر اپنی اقوام کو اس اہم خبر سے مطلع کیا اور واشگاف الفاظ میں بتادیا کہ خدا کا یہ وعدہ حتمی پورا ہو کر رہے گا روز جزا یقینی طور پر آ کر رہے گا۔ لوگوں کے اعمال کا اس دن محاسبہ ہوگا اور ہر شخص اس دن اپنے نیک یا بد اعمال کا بدلہ پائے گا۔ صرف قرآن مجید ہی میں سینکڑوں آیات معاد اور اس کی کیفیت کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور اسلام کے عظیم الشان پیغمبرؐ نے ہر مناسب موقع پر لوگوں کے سامنے ان کی تلاوت کر کے انہیں روزِ جزا کے حساب و کتاب اور سزا و جزا سے آگاہ فرمایا۔

---

[1] اثبات وجودِ خدا ص ۱۴۷

[2] سورۃ ۱۴ آیت ۱۰

انبیاء کے پیروکاروں کا قیامت کے دن پر ایمان اسی حد تک تھا جتنا کہ اُن کا وحی اور نبوت پر ایمان تھا۔اُن کا جس قدر انبیاء پر ایمان محکم تھا اسی قدر اُن کا قیامت کے دن پر قلبی عقیدہ اور محکم ایمان تھا۔قرآن پاک نے قیامت کے بارے میں سچے مومنین کی قلبی حالت اور اندرونی اطمینان کو یقین کے لفظ سے تعبیر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴ (البقرہ)

"یعنی پرہیز گار لوگ وہ ہیں جو ہر اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو آپؐ پر اور آپ سے پہلے دوسرے انبیاء پر نازل ہوئی ہیں اور عالم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں"[۱]

متقی لوگ اور آخرت پر یقین:

راغب کہتے ہیں:

اليقين من صفة العلم فوق المعرفة والدارایة واخواتها يقال علم يقين ولا يقال معرفة يقينٍ وهو سكون الفهم مع ثباتِ الحكم۔"

یقین علم کی صفت ہے اور وہ معرفت ادراک اور اس جیسے دوسرے الفاظ سے بالاتر ہے۔لغت عرب میں علم الیقین تو کہا جاتا ہے لیکن معرفۃ الیقین نہیں کہا جاتا، بنابریں یقین نام ہے قطعی حکم کے ساتھ اطمینان قلب کا"[۲]

جن لوگوں نے معاد کو یقین کے ساتھ قبول کیا ہے اور اس پر صحیح معنوں میں یقین رکھتے ہیں وہ اس کی جزا سے بھی کبھی غافل نہیں ہوئے۔وہ گناہوں کے نزدیک نہیں جاتے اور زندگی میں غیر شرعی اور ناجائز لذتوں سے دور بھاگتے ہیں تا کہ بروزِ قیامت ان کی سزا سے بچ جائیں اور خدائی عذاب کے مستحق نہ ہوں۔اسی طرح وہ کلمہ حق کی سربلندی اور پروردگار عالم کی اطاعت کے لیے ہر سختی کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے ہیں۔اس راہ میں جان اور مال کے چلے جانے کی پرواہ نہیں کرتے تا کہ اُنہیں خدائی جزا مل سکے اور اللہ تعالی کی رضا ان کے شاملِ حال ہو۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

---

[۱] سورۃ ۲ آیت ۴

[۲] مفردات راغب (مادہ یقین)

لو کنتم توقنون بخیر الاخرۃ وشرھا کما توقنون بالدنیا لاثر تم طلب الاخرۃِ"

"یعنی اگرتمہارا یقین آخرت کی اچھائی وبرائی کے متعلق بھی اتنا ہی ہوتا جتنا کہ دنیا کی اچھائی وبرائی کے متعلق ہے تو یقیناتم آخرت کی اچھائی وبرائی کے متعلق بھی اتنا ہی ہوتا جتنا کہ دنیا کی اچھائی وبرائی کے متعلق ہے تو یقیناتم آخرت کوترجیح دیتے اوراس بارے میں خوب کوشش کرتے۔[1]

آخرت پر ایمان اوراس کا انتخاب:

ایمان کامل کا حصول اوریقین کے اعلیٰ مدارج تک رسائی پاک دل افراد میں بڑی حد تک موثر ہیں۔ان کے ادراک اورشناخت کی قوتوں میں اضافہ کرتی ہیں۔ان کے ضمیر کومنوراورچشم بصیرت کواس قدرروشن کرتی ہیں کہ گویاان کی روشنی میں وہ پوشیدہ حقائق سے آگاہ ہوجاتے ہیں۔دوسروں کی نامعلوم چیزوں سے واقف ہوجاتے ہیں۔گویا کہ مرنے کے بعد کی منزلوں کودیکھ رہے ہیں اورآخرت کے نشیب وفراز کا مشاہدہ کررہے ہیں۔حضرت علی علیہ السلام ایسے باعظمت لوگوں کے بارے میں ارشادفرماتے ہیں۔

فکانما قطعوا الدنیا الی الاخرۃ وھم فیھافشاھد وامّا ورازالك فکانما اطلعوا عیوب اھل البرزخ فی طول الاقامۃ فیه وحققت القامۃ عواتها فکشفو ا عطاذالك لاھل الدنیا حتیٰ کانھم یرون مالا یھی الناس ویسمعون مالا یسمعون۔"

یعنی گویاان لوگوں نے اپنی دنیاوی زندگی کومکمل کرلیاہے اوراب عالم آخرت میں پہنچ چکے ہیں اورایسے مراحل کودیکھ رہے ہیں جواس کے بعدرونما ہونے والے ہیں۔گویاوہ ایسے پوشیدہ اُمورسے بھی واقف ہوچکے ہیں جوبرزخ والوں کواس دوران میں درپیش ہیں۔گویا قیامت برپا ہوچکی ہے اوراس بارے میں ہونے والے وعدے پورے ہوچکے ہیں اوران لوگوں نے پردے اٹھادیے ہیں تاکہ دنیاوالے پس پردہ اُمورسے واقف ہوسکیں۔گویا یہ لوگ وہ کچھ دیکھ رہے ہیں اوردوسرے لوگ نہیں دیکھ سکتے۔

---

[1] مجموعہ وارم جلد ۱ ص ۱۳۴

اور وہی کچھ سن رہے ہیں اور جو دوسرے نہیں سن سکتے۔[۱]

اس قسم کے باعظمت اور صاحب ایمان لوگ کہ جن کی چند ایک صفات مولائے کائنات علیہ السلام نے بیان فرمائی ہیں بہت ہی کم تعداد میں ملتے ہیں جو تقریباً ہر دور میں پائے جاتے ہیں لیکن غالب طور پر گمنام زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان میں سے بھی بہت تھوڑے لوگ صرف خاص مواقع اور مخصوص حالات کے تحت ہی پہچانے جا سکتے ہیں۔

پیغمبرِ اسلام صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور پاک دل انسان:

ایک دن کی بات ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صبح کی نماز باجماعت ادا فرمائی۔ بعد از نماز آپؐ کی نگاہ ایک ایسے نوجوان پر پڑی جس کا چہرہ زرد اور آنکھیں تھکی ہوئی اور خواب آلود تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے یہ رات نیند اور کسی قسم کے آرام کے بغیر بسر کی ہے۔ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُس سے پوچھا: حارث! رات کیسے گزری؟'' تو اُس نے جواب دیا: یقین کی حالت میں'' آپؐ نے اس کی یہ بات سن کر تعجب کیا اور فرمایا ''ہر یقین کی ایک حقیقت ہوتی ہے تمہارے یقین کی کیا حقیقت ہے؟'' عرض کرنے لگا ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! یہی تو میرا یقین ہے جس نے مجھے ساری رات بیدار رکھا اور مادی اور دنیاوی تعلقات سے مجھے بے پرواہ کر دیا۔ وہ کہنے لگا:

کانی انظر الی عرش ربی قد نصب للحساب وحشر الخلائق لذالك وانافیهم و کانی انظر الیٰ اهل الجنة یتنعمون فیها ویتعارفون علی الارائك متكین و کانی انظر الیٰ اهل النار فیها معذبون ویصطر خون و کانی اسمع الان ذفیر النار یدور فی مسامعی فقال رسول الله هذا عبد نور الله قلبه فی الایمان ثم قال الزم ما انت علیه ۔ فقال الشاب ادع الله لی یا رسول الله ان ارزق الشهادة معك فدعاله بذالك فلم یلبث ان خرج فی بعض غزوات النبی فاستشهد بعد تسعته نفرٍ و کان هو العاشر۔''

''گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ مخلوق کے حساب کتاب کے لیے عرش لگ چکا ہے۔ لوگ حساب کتاب کے لیے جمع ہو چکے ہیں اور میں بھی اُن کے درمیان موجود ہوں، گویا میں اہل بہشت کو دیکھ رہا ہوں جو بہشت میں خدا کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو بخوبی پہچانتے ہیں اور تخت پر تکیہ

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۲۱۳

لگائے ہوئے ہیں گویا میں جہنم والوں کو بھی دیکھ رہا ہوں جو وہاں پر عذاب میں گرفتار ہیں اور مسلسل فریاد کررہے ہیں اور مدد کے لیے پکار رہے ہیں اور گویا آتش دوزخ کے شعلوں کی مہیب آواز اب بھی میرے کانوں میں پڑ رہی ہے...... یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یہ خدا کا ایک ایسا بندہ ہے جس کے دل میں خدا نے نور ایمان کا چراغ روشن کر دیا ہے۔''

پھر آپؐ نے فرمایا اپنی اس روحانی کیفیت اور باطنی پاکیزگی کی حفاظت کرو اور یاد رکھو کہیں اسے ضائع نہ کر دینا۔ یہ سن کر اس جوان نے عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دعا کیجئے کہ خدا مجھے آپ کے قدموں میں شہادت کی سعادت عطا فرمائے۔ تو آپؐ نے اس کے حق میں دعا فرمائی۔ اور تھوڑی مدت کے بعد وہ نوجوان دوسرے مسلمان سپاہیوں کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں جنگ کے سلسلے میں مدینہ منورہ سے باہر آ گیا اور معرکہ کارزار میں داخل ہو گیا۔ اس سے پہلے نو مسلمان شہید ہوئے دسواں شہید یہی نوجوان تھا۔ تو اس طرح سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا مستجاب ہوئی اور وہ درجہ شہادت پر فائز ہو گیا۔[1]

اگر چہ باایمان افراد کا قیامت کے دن اور عالم آخرت کے بارے میں عقیدے کا اصل سرچشمہ خدا کی وحی اور انبیاء علیہم السلام کی خبریں ہی ہیں۔ لیکن ان آسمانی خبروں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے شواہد بھی ملتے ہیں جن پر غور وفکر کرنے سے مومنین کے ایمان کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور قیامت کے بارے میں ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

فطری غریزے اور اُن کی تکمیل:

(۱) صاحب حکمت خالق نے انسان اور حیوان کی فطرت میں کچھ غریزے اور خواہشات مقرر فرمائے ہیں اور انفرادی واجتماعی زندگی کو چلانے کے لیے ہر غریزلے کے ذمے کچھ فرائض سونپے ہیں اور کوئی بھی غریزہ اور خواہش بیکار اور فضول نہیں ہے۔ اور جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ تخلیق کائنات کے حکیمانہ نظام میں تمام غریزے اور طبیعی خواہشات اپنی تکمیل کے لیے کچھ ذرائع بھی رکھتی ہیں جن سے اُن کی تکمیل ہوتی ہے۔ ''جان ڈیوٹی'' کہتے ہیں:

آنکھ ''نور کی تشنہ ہوتی ہے، کان آواز کے اور ہاتھ سطح کے، بازوؤں کو ان چیزوں کی تلاش ہوتی ہے جن تک ان کی دسترس ہو یا انہیں دور پھینک دیں پاؤں کو چلنے کی خواہش ہوتی ہے۔ تو غصے کو دشمن کی تلاش، تجسس کو اشیاء کے کشف کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو عشق کو معشوقہ کی تلاش، اس طرح سے ہر غریزہ کسی نہ کسی موضوع کی تلاش میں رہتا ہے تاکہ اس طرح

---

[1] مشکوۃ الانوار ص ۱۴

سے اُن کی خواہشات کی تکمیل ہو، کسی موضوع پر کسی غریزہ سے انکار درحقیقت ایسے ہی ہے جیسے افسانوی اور تخیلاتی موجودات کا تصور کیا جائے۔[1]

زندگی سے محبت کا غریزہ:

زندگی سے پیار کا غریزہ اور خواہش، ایسے غرائز میں سے ہے جو ہر ذی روح کی سرشت میں موجود اوران کی فطرت میں داخل ہے۔اسی غریزے کی بنا پر وہ ہر وقت اور ہمیشہ اس کی حفاظت میں لگے رہتے ہیں۔اور جس چیز سے اُن کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے اس سے اجتناب کرتے ہیں۔

انسان میں بھی دوسرے حیوانوں کی طرح زندگی سے محبت کا غریزہ پایا جاتا ہے۔لیکن اس کی طبیعت میں ایک اور رجحان بھی موجود ہے۔جس سے دوسرے جاندار محروم ہیں اور وہ ہے ہمیشہ کی زندگی کی تمنا، انسان ہمیشہ کی زندگی کی فکر میں ہوتا ہے اور یہی چیز ہمیشہ اس کے ذہن میں موجود رہتی ہے اور یہ کوئی عارضی یا کسبی خواہش نہیں ہے اور نہ ہی کسی خاص گروہ سے اس کا تعلق ہے بلکہ یہ ایک فطری خواہش ہے جو ہر فرد بشر کی سرشت میں داخل ہے۔

انسان اور ہمیشہ کی زندگی کی آرزو:

اوراس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ کوئی بھی غریزہ اور خواہش فضول اور بیکار خلق نہیں ہوئی اور اس نکتہ کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے کہ ان کی طبیعی خواہشات اور غرائز میں سے ہر ایک کسی نہ کسی مناسب موضوع اور مورد کے ذریعہ اس دنیا میں ہی پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے لیکن ہمیشہ کی زندگی کی خواہش اس ناپائیدار اور زودگزر دنیا میں ناممکن ہے۔

ہمیشہ کی زندگی اور آخرت:

تو اس طرح سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انسان کے اندر موجود یا تو ہمیشہ کی زندگی کے اس اصل اور فطری غریزے کا بیکار اور فضول تسلیم کریں پھر انبیاء الٰہی کے مکتب کی طرف سے پیش کردہ آخرت کی ابدی زندگی کو قبول کریں اور اس بات کا یقین کریں کہ انسان مرنے کے بعد فنا اور نیست ونابود نہیں ہوجاتا بلکہ وہ اس طرح سے صرف اپنی منزل کو بدل لیتا ہے اس زودگزر دنیا کی سرائے کو چھوڑ کر آخرت کی جاودانی زندگی میں قدم رکھتا ہے اور اس عالم ہی میں اس کی اس خواہش کی تکمیل ہوتی ہے۔وہاں پر ہی حیات ابدی کو حاصل کرتا ہے اور اس کی خواہش پوری ہوتی ہے۔

---

[1] اخلاق وشخصیت ص ۱۳۶

ابدی زندگی کا غریزہ:

بعض فلاسفہ اور دانشوروں کے نظریہ کے مطابق انسانی سرشت میں داخل یہ اصل اور فطری غریزہ، انسان کی ہمیشہ اور جاودانی زندگی کے برحق ہونے کی ٹھوس دلیل ہے۔

"عاطفة حب الخلود من اشرف عواطف النفس بل هی العاطفة الکریمة التی تشعر بانها من طبیعة ارتی من طیعة هذا الارض وقد اتخذها بعض الفلاسفة من ارل الادلة علی حقیقة الخلووفقالو اذالم یکن للانسان خلود فلم اورعت فیه هذه العاطفة ولم یعهد فی اعمال الطبیعة الجزاف والسوف۔"

یعنی ہمیشہ کی زندگی کا غریزہ نفس انسانی کے شریف ترین اور پاکیزہ ترین غرائز میں سے ہے اور یہ اس حقیقت کی جانب اشارہ ہے کہ انسانی روح کرہ ارضی کی طبیعت سے اعلیٰ اور بالاتر ہے اور بعض فلاسفہ نے اسی غریزے کو انسان کی حیات ابدی پر بہترین دلیل قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اگر انسان کے لیے ابدی زندگی نہ ہوتی تو پھر یہ فطری خواہش اس کی سرشت میں ہی کیوں رکھی گئی ہے؟ جبکہ طبیعت اور نظامِ خلقت میں کوئی چیز بھی بیکار اور فضول نہیں ہے۔"[1]

بقا سے محبت:

اسی موضوع کو محقق حکیم اور اسلام کے عظیم اور عالیشان عالم مولانا محسن فیض کاشانی نے بھی اپنی بحث کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

و کیف تعدم النفوس وقد جعل الله وعزوجل بواجب حکمه فی طبائعها محبة الودوالبقاء وجعل فی جبلتها کرامة العدم والفناء وقد ثبت وتیقن ان بقائها ودوامها فی هذا النشاة الحیة امر مستحیل فلولم یکن لها نشاة اخری منتقل هی الیها لکان ما ارتکزفی طبائعها واودع فی

---

[1] دائرۃ المعارف جلد ۴ ص ۳۲۲ (مادہ رُوح)

جبلتها من محبة البقاء الابدے والحيوة السرمدية باطلا ضائعا تعالیٰ الله عن ذالك۔"

''یعنی کیونکر نیست ونابود ہوجائیں گے جبکہ خداوند عالم نے اپنی حکمت کے تحت ہی ان کی طبیعت اور فطرت میں دائمی زندگی کی محبت خلق فرمادی ہے اور فطری طور پر فنا اور نیستی سے کراہت اور نفرت ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں ابدی زندگی بالکل ناممکن ہے اور اگر دوسرا جہان نہ ہو کہ جس میں وہ منتقل ہوجائیں اور ہمیشہ رہیں تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ خدا کی یہ امانت جو قضائے الٰہی کے تحت تمام انسانوں کے ضمیر کو سونپی جاچکی ہے۔ بیکار اور فضول ہوگی اور خداوند حکیم ودانا اس فضول عمل سے منزا ومبرا اور پاک وپاکیزہ ہے۔''[۱]

حیاتِ ابدی کا احساس:

''حیات ابدی کا فطری احساس بذات خود ایک اہم ترین مثبت گواہ ہے جو ہمیں اس حقیقت کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ جب خداوند تبارک وتعالیٰ خود یہ چاہتا ہے کہ انسان کی کسی ایسی حقیقت تک رسائی ہو جس کا بیج آغاز ہی میں اس کے ضمیر میں بو دیا ہے انسان کی جاودانی زندگی اور بقا کی آرزو اس قدر عالمگیر ہے کہ کسی بھی صورت میں یہ بات نہیں مانی جاسکتی کہ اس کی یہ آرزو پوری نہ کی جاسکے۔[۲]

ازیں ملک روزی کہ دل برکنم
سرپردہ درملک دیگر زنم
پس این مملکت رانبا شد زوال
زملکی بہ ملکی بود انتقال

ظالموں کو سزا:

(۲) ایک اور بات ہے کہ جس سے روزِ جزا کے عقیدہ کو تقویت ملتی ہے اور انبیاء کے پیروکاروں کے ایمان پختہ

[۱] علم الیقین جلد ۲ ص ۸۳۷
[۲] وانستیھائے جہان علم ص ۲۰۴

ہوتے ہیں وہ ظالموں کو سزا کا مسئلہ ہے۔ہم جانتے ہیں کہ ہر دور اور زمانے میں سرکش اور ظالم وجابر لوگ مختلف قسم کے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔لوگوں کو مختلف قسم کے جرائم کا نشانہ بناتے اور جارحیت کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔اور عام طور پر نہ تو ظالم کو سزا مل پاتی ہے اور نہ ہی کوئی مظلوم کی حمایت کرتا ہے اور خدا کے ان خاص بندوں کے لیے تو یہ صورت حال اور ہی دردناک اور ناگوار ہوتی ہے جو کہ خدائے دانا و بینا اور عادل وحکیم پر ایمان کامل رکھتے ہیں۔وہ روحانی اور باطنی طور پر ان صدمات کے زیادہ متحمل ہوتے ہیں اور خود سے سوال کرتے ہیں کہ آیا کبھی حساب وکتاب نہیں ہوگا؟ آیا ان تمام جرائم کی کسی کو سزا نہیں ملے گی؟ آیا خداوند عالم یہ سب ظلم وستم ایسے دیکھتا رہے گا؟ خلاصہ یہ کہ صاحبِ ایمان لوگ حیران اور سرگردان ہوجاتے ہیں جس طرح کوئی شخص اپنی گمشدہ قیمتی چیز کو تلاش کرتا ہے۔یہ بھی ہمیشہ اسی جستجو میں ہیں کہ کہیں سے قانع کرنے والا جواب مل جائے تاکہ اُن کا ضمیر مطمئن ہو اور روحانی بوجھ اور ضمیر کی اس تکلیف سے چھٹکارا مل جائے۔

ضمیر کا سُکون:

قیامِ قیامت اور لوگوں کو سزا جزا کے بارے میں انبیاء کرام علیہم السلام کی بتائی ہوئی خبریں خدا کے نیک لوگوں کے عقدے حل کرتی ہیں، ان کے ذہن میں اُٹھنے والے سوالوں کا جواب دیتی ہیں اور ان کے پریشان ضمیروں کو تسکین عطا کرتی ہیں۔قیامت اور مخلوق کے حساب کا مسئلہ عدل الٰہی سے متعلق ایک یقینی ضرورت ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو ظالم اور مظلوم کا مسئلہ حل نہ ہو پاتا اور اس بارے میں پیدا ہونے والے سوال بغیر جواب کے رہ جاتے۔قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴿۴۲﴾ (ابراھیم)

''یعنی یہ گمان نہ کرو کہ خداوند عالم ظالموں کے غلط اور ناجائز کاموں سے غافل ہے بلکہ اُن کی سزا میں اس لیے تاخیر کرتا ہے تاکہ قیامت کا دن آجائے جس دن حیرانی وپریشانی کی وجہ سے آنکھیں پتھرا جائیں گی اور حیرت زدہ ہوں گی۔[1]''

روزِ جزا کا انتظار:

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[1] سورہ ۱۴ آیت ۴۲

"ولئن امهل الله الظالم فلن يفوت اخذه وهوله بالمرصادعلى امجاز طريقة وبمرضع الشجىٰ من مساغ ريقه۔"

"یعنی اگر خداوند عالم ظالم کو ڈھیل دیتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے مواخذے کا موقع ضائع ہوجاتا ہے۔ اس کی آمدورفت ہی خدا کے پیشِ نظر نہیں اُس کا گلا بھی اُس کے قبضہ قدرت میں ہے جو لعابِ دہن اور لقمہ کی گزرگاہ ہے۔"[1]

خدااورظالموں پرنگاہ:

تونتیجہ یہ نکلا کہ قیامِ قیامت اور روز جزا کی اصل دلیل تو خدا کی وحی ہے جو تمام انبیاء پر نازل ہوئی ہے اور اُنہوں نے اپنے پیروکاروں کو اس سے مطلع کیا ہے، اور حیات جاودانی کے ساتھ انسان کا فطری لگاؤ اور دُنیا میں ظالموں کو سزا نہ ملنا اور تائیدی باتیں تھیں جو ابھی ذکر ہوئی ہیں بنابریں صرف مادہ پرست اور خدا کے منکر لوگ ہی معاد کی نفی نہیں کرتے بلکہ وہ خدا پرست بھی معاد کے منکر ہیں جو خدا کی وحی، نبوت اور خدا کے ادیان کے معتقد نہیں ہیں۔ اسی طرح میرے خیال میں وہ لوگ بھی معاد کی نفی کرتے ہیں جو دین الٰہی میں دوسرے افکار کو دخیل سمجھتے ہیں (دین کو آدھا تیسرا اور آدھا بیڑ تصور کرتے ہیں) ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن شریف فرماتا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿١٥٠﴾ (النساء)

"وہ کہتے ہیں کہ ہم انبیاء کی کچھ تعلیمات پر تو ایمان رکھتے ہیں اور کچھ کا انکار کرتے ہیں۔ اس طرح سے وہ اپنے لیے کفر اور ایمان کی درمیانی راہ کا انتخاب کرتے ہیں۔"[2]

دینی نظریات میں دوسرے نظریات:

خلاصہ کلام خدا کی قضاء کے پیشِ نظر معاد (قیامت) ایک حتمی اور یقینی طور پر واقع ہونے والا امر ہے۔ پھر بھی ماضی اور حال میں لوگوں کو اکثریت نے اس کا انکار کیا ہے اور اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی ہے۔ قرآن مجید نے اس بات کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۹۶

[2] سورہ ۴ آیت ۱۵۰

إِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٥٩﴾

''یعنی اس میں شک نہیں کہ قیامت کی گھڑی ضرور قائم ہوگی لیکن بہت سے لوگ اس پر ایمان نہیں رکھتے۔''[1]

مُشرک در عبادت:

عصر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مکہ کے مشرکین خدا کو مانتے تھے۔ خالق کائنات پر ایمان رکھتے تھے، مادی مکتب فکر کی پیروی نہیں کرتے تھے اور کائنات کو اتفاق کی پیداوار نہیں سمجھتے تھے وہ آفرینش کے لحاظ سے موحد تھے اور خدا ہی کو زمین وآسمان کا خالق سمجھتے تھے، لیکن عبادت کے مقام پر وہ مشرک اور بت پرست تھے اور غیر خدا کے آگے بندگی کا سر جھکاتے تھے۔ اس بات کو خداوندِ عالم نے ان لفظوں میں یوں بیان کیا ہے:

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٦١﴾ (العنکبوت)

''یعنی اگر آپ مشرکین سے سوال کریں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کیا ہوا ہے؟ تو وہ کہیں گے خدا نے! تو پھر انہوں نے کس لیے اپنے لیے جھوٹے خداؤں کا انتخاب کیا ہوا ہے اور غیر خدا کی پرستش میں بھٹکے ہوئے ہیں؟''[2]

خدا پرست منکرین معاد:

آفاقی نکتہ نظر سے اگرچہ یہ لوگ خدا پرست تھے اور اس قدر باعظمت کائنات کا خالق بھی خداوند قادر وقدیر کو سمجھتے تھے، لیکن چونکہ وحی پروردگار اور انبیاء پر ایمان نہیں رکھتے تھے لہٰذا عالم آخرت، حشر ونشر اور قیامت کی نفی کیا کرتے تھے اور اُن کی گفتگو صرف اور صرف دنیاوی موت وحیات تک ہی محدود تھی۔ وہ کہتے تھے:

إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ﴿٣٧﴾ (المومنون)

''یعنی ہمارے لیے اس دنیاوی زندگی کے علاوہ کوئی اور زندگی نہیں۔ اسی دنیا ہی میں مریں گے اور اسی

---

[1] سورہ ۴۰ آیت ۵۹

[2] سورہ ۲۹ آیت ۶۱

میں ہی جییں گے اور قیامت میں دوبارہ نہیں اُٹھیں گے۔'[۱]'

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے نبوی فریضہ اور لوگوں کی ہدایت کے پیشِ نظر لوگوں کے سامنے معاد کی آیات کی تلاوت کیا کرتے تھے جو آپؐ پر خدا کی وحی کے ذریعہ نازل ہوتی تھیں اور موعود اور قیامِ قیامت کے بارے میں لوگوں کو مطلع کرتے تھے اور اُنہیں خدا کی سزا و جزا سے آگاہ فرماتے تھے، لیکن وہ لوگ اسلامی مکاتب کی من گھڑت تاویلیں کیا کرتے تھے۔

آزاد خیال اور قبول اسلام:

ان سامعین میں کچھ لوگ تو ہٹ دھرمی اور تعصب کے پھندوں سے آزاد اور آزاد فکر کے مالک تھے۔ قرآنی آیات اور فرامین نبویؐ کو سنتے اور اُن پر خوب غور و فکر سے کام لیتے۔ آنحضرتؐ کے ساتھ گفتگو کرتے اور آپؐ کی مدلل اور جاذب گفتگو سے متاثر ہو کر اسلام کو قبول کر لیتے اور قرآنی تعلیمات پر ایمان لے آتے جن میں سے ایک معاد بھی ہے۔

قومی تعصّبات اور معاد کا انکار:

جو لوگ موروثی عقائد، قومی تعصّبات اور خواہشات نفسانی کے پابند تھے اور اسلام کو ان باتوں کے منافی سمجھتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں لانا چاہتے تھے۔ وہ کئی مسائل کو زیرِ بحث لا کر اپنی مخالفت کا اظہار کیا کرتے تھے جن میں سے ایک قیامت بھی ہے۔ وہ مرنے کے بعد کی زندگی کو زیرِ بحث لا کر اس بارے میں مختلف باتیں کیا کرتے تھے۔ کچھ لوگ مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کو ایک غیر ممکن اور انہونی بات بتاتے اور دلیل پیش کیے بغیر معاد کی نفی کیا کرتے تھے۔ قرآن مجید ایسے لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے:

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿۲۴﴾ (الجاثیہ)

''یعنی وہ کہتے تھے کہ ہماری زندگی اور موت صرف دنیا ہی میں ہے اور ہمیں صرف زمانہ اور گردش ہی ہلاک کرتی ہے۔ ان کی گفتگو میں کوئی علمی دلیل نہیں ہے اور ان کی گفتگو کا دار و مدار صرف گمان و خیال پر ہے۔'[۲]'

---

[۱] سورہ ۲۹ آیت ۶۱

[۲] سورہ ۴۵ آیہ ۲۴

بغیر دلیل کے گفتگو:

قریش کے کچھ افراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے جن میں عتبہ بن ربیعہ، ابی بن خلف، ولید بن مغیرہ اور عاص بن سعید بھی شامل تھے اور آپؐ سے معاد کی مخالفت پر مبنی باتیں کرنے لگے۔ اچانک ابی بن خلف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک ہوا اور اپنے ساتھ جو ہڈی کا ٹکڑا لایا تھا اُسے ہاتھوں میں لیا اور اُنگلیوں سے خوب مسل کر اُسے سفوف میں تبدیل کیا اور پھونک مار کر اس سفوف کو اُڑا دیا، پھر کہنے لگا:

اتزعم ان ربك يحيئ هذا بعد ماترىٰ۔"

''یعنی جو آپؐ نے دیکھا پھر بھی آپؐ کا گمان ہے کہ آپؐ کا رب اس بوسیدہ اور گلی سڑی ہڈی کو زندہ کرے گا۔[1]

باطل تصوّر اور اس کا جواب:

اُس نے ہڈی کا ٹکڑا ظاہر کر کے اور اس کے ذرات کو منتشر کر کے یہ تصور کر رہا تھا کہ معاد کی نفی اور اس کے غیر ممکن ہونے پر ٹھوس علمی دلیل پیش کر چکا ہے، لہٰذا بڑے اعتماد کے ساتھ پیشوائے اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہنے لگے: یہ سب دیکھنے کے بعد پھر بھی آپؐ اپنے گمان پر قائم ہیں اور تصور کرتے ہیں کہ لوگ قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہوں گے؟'' خداوند عالم نے اس کا جواب دینے اور دوسرے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے یہ آیت نازل فرمائی:

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴿٧٨﴾ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُۨ ﴿٧٩﴾ (یٰسٓ)

''یعنی ہمارے لیے تو مثالیں لاتا ہے۔ لیکن اپنی تخلیق کو فراموش کر چکا ہے۔ وہ کہتا ہے اس گلی سڑی ہڈی کو کون دوبارہ زندہ کرے گا؟ تو کہہ دیجئے اسے وہ زندہ کرے گا جس نے اُسے آغاز میں وجود بخشا ہے اور اس مُردہ عناصر کو زندگی عطا کی ہے اور وہ اپنی تمام مخلوق پر محیط اور آگاہ ہے۔'[2] '

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ ص ۸۹۱

[2] سورہ ۳۶ آیات ۷۸ تا ۷۹

خدا ہی دنیا اور آخرت کو زندگی عطا کرتا ہے:

یعنی اگر سائل زندگی کے فیوضات کو ناممکن سمجھتا ہے اور پوچھتا ہے کہ بوسیدہ ہڈی کے ذرات کو کون شخص زندہ کرے گا؟ تو اس کے جواب میں کہہ دیجئے کہ وہی خدا جس نے ہڈی کو آغاز میں زندگی بخشی اور اس کے مردہ عناصر کو حیات سے نوازا! اور اگر اس کا اعتراض یہ ہے کہ ان منتشر ذرات کو کون پہچانے گا اور ان پر کن کا علمی احاطہ ہے کہ اُنہیں دوبارہ جمع کرے گا تو کہہ دیجئے کہ وہی خدا ہی ہے جس کا عالم کی ہر چیز پر علمی احاطہ ہے اور تمام مخلوقات سے آگاہ ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے قیامِ قیامت اور مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان فرماتے ہیں:

"عجبت لمن انکر انشاۃ الاخرۃ وھو یری انشاۃ الاولی" [1]

''یعنی میں اس شخص پر تعجب کرتا ہوں جو دوسری زندگی کا انکار کرتا ہے اور انہونی بات سمجھتا ہے جب کہ وہ اپنی دنیاوی زندگی کو دیکھ رہا ہے۔''

گویا امام علیہ السلام یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ اس دنیا میں زمین کے مواد مُراد ہونے کے باوجود ہمیشہ زندگی کی راہ پر گامزن ہیں اور خداوندعالم کی قضائے تکوینی کے تحت زندہ ہوتے ہیں تو معاد کے منکر افراد اپنے آپ کو اس بات کی کیونکر اجازت دیتے ہیں کہ حیات بعدازموت کا انکار کریں اور آخرت کی زندگی کی نفی کریں؟

کچھ لوگ وہ بھی تھے جو مرنے کے بعد زندہ ہونے کو ناممکن نہیں جانتے تھے اور پہلے گروہ کی مانند کھلم کھلا اس کی نفی بھی کرتے تھے، لیکن اس قسم کے عظیم امر کے وقوع پذیر ہونے کو بعید اور نہایت ہی بعید تصور کرتے تھے۔ اس قسم کے لوگوں کے بارے میں قرآن کریم فرماتا ہے۔

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝۲
ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝۳ (ق)

یعنی اُنہوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ ایک شخص خود اُن سے کیونکر چن لیا گیا ہے کہ جو اُنہیں عذابِ الٰہی سے ڈراتا ہے، اور کافر کہنے لگے کہ یہ امر تو عجیب ہی ہے۔ اسی طرح وہ کہتے تھے کہ جب ہم مرکر مٹی بن جائیں تو کیا دوبارہ جی اٹھیں گے؟ اس قسم کی بازگشت کا وقوع پذیر ہونا اور حقیقت کی صورت

---

[1] غرر الحکم، ص ۴۹۳

اختیار کرنا بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔‘[۱]‘

معاد کی تکذیب اور نامشروع خواہشات:

بعض وہ لوگ بھی تھے جو اپنی خواہشات نفسانی کے اسیر تھے۔ اور اپنی ناجائز اور نامشروع خواہشات کو پورا کرنے پر تلے ہوئے تھے وہ ہر قسم کی پابندی سے جان چھڑانا چاہتے تھے اور مادر پدر آزادی کے قائل تھے، لہٰذا وہ روزِ جزا کی تکذیب کیا کرتے تھے اور نہایت ہی تحقیر آمیز انداز میں اس کا انکار کیا کرتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ معاد کا اعتقاد اور اللہ تعالیٰ کے حضور ذمہ داری کا احساس اُنہیں محدود اور پابند کر دے گا جس سے وہ اپنی ہر قسم کی غیر مشروع اور ناجائز خواہشات کو عملی جامہ نہیں پہنا سکیں گے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں خدا فرماتا ہے۔

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝۵ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۝۶

”یعنی انسان کی طبیعی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اسے مادر پدر آزادی حاصل ہو، وہ چاہتا ہے کہ اسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ ہو، کسی قسم کی روک ٹوک کے بغیر اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرے اور جیسے اس کا جی چاہتا ہے آزاد ہو کر اپنی مرضی کے مطابق کام کرے، لہٰذا وہ تمسخر آمیز لہجہ میں پوچھتا ہے کہ ”قیامت کب آئے گی اور روز جزا کب ہوگا؟‘[۲]‘

خلاصہ کلام، دور جاہلیت کے بت پرست مختلف وجوہ و اسباب کی بنا پر معاد کا انکار کیا کرتے تھے، اور کسی قسم کی دلیل کے بغیر ہی اس کی نفی کیا کرتے تھے۔

معاد یا خدا کا قطعی وعدہ:

اب بھی ہمارے اس دور میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کائناتی تصوّر کے لحاظ سے خدا پرست ہیں، کائنات کو خداوند حکیم و دانائی کی تخلیق کا شاہکار سمجھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ قیامت کے منکر ہیں اور کسی قسم کی دلیل کے بغیر اُسے قابلِ قبول نہیں سمجھتے، لیکن انبیاء کرام کے سچے پیروکار ہر دور میں موجود رہے ہیں جو قیامت کے قیام کو قطعی سمجھتے تھے، کیونکہ اُنہیں اچھی طرح علم تھا کہ یہ اہم امر خداوندِ عالم کا قطعی وعدہ ہے جو وحی کے ذریعے تمام انبیاء کو بتایا گیا ہے۔ اور اُنہوں نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے یہ بات لوگوں تک پہنچائی ہے۔ اُنہیں یقین تھا کہ کسی شک وشبہ اور وہم وگمان کے بغیر قیامت کا دن آ کر رہے گا اور خدا کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ اور لوگ اپنے نیک و بد اعمال کی جزا و سزا پانے کے لیے دوبارہ زندہ ہوں گے۔ قرآن

---

[۱] سورہ ۵۰ آیات ۳ تا ۴

[۲] سورہ ۷۵ آیات ۵ تا ۶

پاک فرماتا ہے۔

وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝ (الحج)

''یعنی کسی قسم کے شک وشبہ کے بغیر قیامت کی گھڑی آ کر رہے گی اور خدا کے حکم کے مطابق مردے اپنی قبروں سے اُٹھائے جائیں گے۔''[۱]

مرنے کے بعد نئی زندگی کا آغاز:

انسان قیامت پر یقین اور انبیاء کرام علیہم السلام کے قول کے مطابق یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کی زندگی چند روزہ دنیا پر ہی منحصر نہیں ہے اور نہ ہی مرنے کے بعد نیست ونابود ہو جاتا ہے بلکہ وہ ایک اور عالم میں منتقل ہو کر اپنی نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ اس عالم میں ہر شخص اپنی زندگی کے دوران محدود ہے اور جب اس کی زندگی کے ایام پورے ہو جاتے ہیں تو اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے، لیکن انبیاء علیہم السلام کے بقول، آخرت کی زندگی ابدی اور پائیدار ہے، جہاں پر لوگ لافانی زندگی بسر کریں گے۔ اس دنیا میں بھی اس جہان میں بھی مختلف قسم کی لذتیں اور نعمتیں موجود ہیں اور مختلف قسم کے عذاب اور تکالیف بھی۔ مگر آخرت کی نعمتیں اور عذاب اس قدر وسیع اور عظیم ہیں کہ دنیاوی نعمتوں اور تکلیفوں کا ان سے تقابل نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"کل شئی من الاخرۃ عیانہ اعظم من سماعہ"

''یعنی آخرت کے متعلق ثواب اور عذاب وغیرہ جو کہ قیام کے بعد درپیش آئیں گے وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں جو دنیا میں سنتے یا اُن کا تصوّر کیا جاتا ہے۔''[۲]

آخرت کی سزا و جزا:

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

"کل ماذکرہ اللہ فی القرآن ممانی الجنۃ وسماہ لیس لہ مثل فی الدنیا ولکن سماہ اللہ بالاسم الذی یعرف۔"

''یعنی بہشت کی جن جن چیزوں کا خدا نے قرآن میں تذکرہ فرمایا ہے اور نام لیا ہے دنیا میں ان

---

[۱] سورہ ۲۲ آیت ۷

[۲] فہرست غررص ۵

جیسی کوئی بھی چیز موجود نہیں ہے لیکن تعارف کے طور پر ہر نعمت کا وہی نام لیا ہے جو اس دنیا میں متعارف ہے۔“[1]

مکتب انبیاء کے مطابق کائنات کے بارے میں نظریہ، آخرت پر یقین اور آخرت ہی کے ثواب وعذاب پر اطمینان، انسان اور کائنات کے بارے میں لوگوں کی سوچ میں تبدیلی پیدا کرتا اور ان کی زندگی کے پروگراموں کو تبدیل کر دیتا ہے۔

آج کی دنیا کا کل کے جہاں سے تعلق:

جو شخص اللہ کے بھیجے ہوئے رسول پر ایمان رکھتا ہے، جب اس سے یہ سنتا ہے کہ ہر انسان کا ”کل اس کے“ آج“ کے اعمال وگفتار سے وابستہ ہے اور ”آخرت“ کی آسائش ورفاہ یا رنج وعذاب کا تعلق اس کے ”دنیا“ کے اچھے یا برے اعمال ہی کے ساتھ ہوتا ہے جو وہ اس دنیا میں انجام دیتا ہے، تو وہ ٹھٹک کر رہ جاتا ہے۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو کر اس بات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے کہ اُسے اپنے اعمال اچھی طرح سوچ سمجھ کر انجام دینے چاہئیں اور گناہ اور غلط کاموں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اسی طرح وہ یہ بھی سمجھ لیتا ہے کہ اس کا فریضہ صرف یہی نہیں ہے کہ دُنیا میں اپنی مادی ضرورتوں کو پورا کرے اور آج کی دنیاوی زندگی کی ضروریات کو برطرف کرے، بلکہ اُسے کل کی زندگی کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔ مادی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ معنوی زندگی کے بارے میں بھی سعی وکوشش سے کام لینا چاہیے تاکہ آئندہ کی سعادت وخوش بختی کی بنیاد رکھ کر نجات اور فلاح ابدی کو حاصل کر لے۔

مادی اور معنوی اُمور کا باہمی تعلق:

دوسرے لفظوں میں معاد پر اعتقاد اور حیات ابدی پر ایمان انسان کی زندگی کے دائرہ کو وسیع کر دیتے ہیں۔ نابودی کی فکر اور نیستی کے اندیشے کو اس کے دل سے دُور کر دیتے ہیں۔ اُمید کی قوت کو اس کے باطن میں طاقتور بنا دیتے ہیں۔ انسان اور انسانیت کی قدر وقیمت کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ مومن افراد کو خود آگاہی کی نعمت عطا کرتے اور اُنہیں معنوی سربلندی اور روحانی ارتقاء کے راستوں پر گامزن کر دیتے ہیں۔

---

[1] لئالی الاخبار ص ۴۳۶

دینی اور دنیاوی امور کے تحرک کے ذرائع:

فطری طور پر انسان ہمیشہ لذتوں اور نعمتوں کے حصول اور رنج وغم کے دُور کرنے کی فکر کرتا ہے۔ لہٰذا جب وہ خدا کے ثواب وعقاب پر ایمان لے آتا ہے اور مرنے کے بعد کی دنیا کے عذاب اور نعمتوں کو باور کرتا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ اپنے باطنی یقین کی پرواہ نہ کرے؟ اور جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی نعمت کا حصول اور وہاں کے عذاب سے بچاؤ کے ذرائع بھی دنیا میں اس کے اپنے اختیار میں دیئے گئے ہیں تو اس بارے میں وہ کوئی اقدام نہیں کرے گا۔ اور اس بارے میں کوئی فکر نہیں کرے گا؟ اس سوال کا جواب یقیناً منفی ہے، کیونکہ جو غرائز اور قوتیں انسان کی سرشت میں داخل ہیں اور انسان کو دنیاوی منافع کے حصول اور نقصانات سے بچنے کے لیے راغب کرتے ہیں وہی آخرت کے ثواب وعقاب کے بارے میں بھی اسے فعالیت عطا کرتے ہیں۔

صاحبان ایمان افراد ان چیزوں کو دینی دروس سے حاصل کرتے ہیں، یعنی خدائی فرائض کی بجا آوری اور حرام سے اجتناب اور خدائی احکام کی اطاعت سعادت ابدی کا موجب ہے جس کے نتیجے میں انسان آخرت میں پروردگار عالم کی رحمت میں شامل ہوجاتا ہے جو نعمتیں پاک اور نیک لوگوں کے لیے مہیا کی گئی ہیں اُنہیں حاصل کرتا ہے۔

گناہ اور تباہی:

اسی طرح اُنہوں نے دینی مکتب میں یہ بھی سیکھا ہے کہ غرائز اور شہوت کی تکمیل میں حد سے تجاوز درحقیقت حق وعدالت کی راہ سے انحراف اور گناہ وآلودگی کی زندگی انسان کی بدبختی اور روسیاہی کا باعث بنتی ہے اور اسے تباہی اور بے راہروی کی طرف لے جاتی ہے اور اس طرح کے بے راہرو اور منحرف انسان نہ صرف دنیا میں سقوط اور پستی کا شکار ہوجاتا ہے بلکہ آخرت میں بھی اخلاقی برائیوں اور گناہوں کی سزا بھی بھگتے گا۔

اسلام کے سچے پیروکار اپنے دینی فریضہ کی بنیاد پر اپنی زندگی کی فرصت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اپنی صحیح معنوں میں اصلاح اور اپنے تمام وجود کو سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تمام حالات میں اپنے مادی اور معنوی توازن کو برقرار رکھتے ہیں۔ وہ جہاں پر اپنے حیوانی غرائز وخواہشات کی جائز طریقے سے تکمیل کرتے ہیں اور مختلف دنیاوی لذتوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں، وہاں پر انسانیت کے احیا کی خاطر ضروری اور لازمی طور پر جہاد بالنفس سے بھی کام لیتے ہیں، مکارم اخلاق سے متصف ہونے اور انسانی اوصاف سے موصوف ہونے کی بھی حدامکان کوشش کرتے ہیں اور اس طرح اپنے لیے رضائے الٰہی اور دنیا وآخرت کی سعادت کے حصول کی خاطر کوشاں رہتے ہیں۔

مادی دوراور اقتصادی غلامی:

آج کی مادی اوراقتصادی دنیا میں ہر چیز اقتصاد کی خدمت کے لیے وقف ہو چکی ہے۔ بلکہ اقتصاد کی غلام بن چکی ہے ۔ اقتصاد ہی کو انسان کی زندگی کا اصل مقصد سمجھ لیا گیا ہے۔ انسان ایک اقتصادی جانور کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ انسانیت کے اُصولوں کوفراموش کر چکا ہے اور معنویت اور انسانی برتری سے بالکل غافل ہو چکا ہے جو انسانیت کی ارتقاء کا معیار ہے۔

اب بھی اکثر و بیشتر لوگوں کے نزدیک انسانوں کی سعادت اور خوشحالی کا راز مادی تونگری اور خوشحال زندگی میں مضمر ہے۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ دیگر اقوام پر فوقیت اور برتری کا بنیادی معیار اقتصادی امکانات کی فراوانی اور مالی و مادی بنیادوں کی مضبوطی ہے، اسی لیے عملی طور پر ان کی تمام سعی وکوشش اسی معیار کے پیشِ نظر ہوتی ہے۔حتیٰ کہ وہ اخلاق کو بھی صرف اقتصاد، منافع، خوری، عیش پرستی غرضیکہ مادی نکتہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے روحانی اور انسانی پہلوؤں کو یکسر فراموش کر چکے ہیں۔

افسوس جس انسان کو آزادی اور احیاء انسانیت کے سائے میں شرافت نفس اور عزتِ نفس کو تلاش کرنا تھا اور مکارم اور انسانی صفات کی طرف رجحان پیدا کرنا تھا اور روحانیت کی سربلندی اور معنویت کی تکمیل کے لیے قدم اٹھانا تھا ہمارے آج کے اسی دور میں لوگوں کی غالب اکثریت اس راہ سے منحرف ہوگئی ہے اخلاقی سربلندیوں کو فراموش کر چکی ہے۔اقتصاد ہی کو انسانی برتری کی علامت سمجھ لیا ہے، مصنوعات اور اس کے مصرف کی دست بستہ غلام بن گئی ہے اور انسانیت کو زمانے کے اس عظیم بت کی بھینٹ چڑھادیا ہے۔

انسانی ارتقاء کی بجائے اوزاروں کا ارتقاء

اس عظیم غلط فہمی کی بنا پر مادی اور معنوی توازن بگڑ گیا ہے۔اوزاروں کے ارتقاء نے انسانیت کے ارتقاء کی جگہ لے لی ہے اور انسان اپنے آپ سے اس حد تک بیگانہ ہوگیا ہے کہ اپنے انسان ہونے کو بھی بھول گیا ہے بلکہ انسانی اقدار سے بھی نابلد ہوگیا ہے۔

ان آخری دوصدیوں میں قدرتی توانائیوں کو واضح طور پر رام کرنے اور مصنوعات وایجادات کی کثرت نے انسان کو اس قدر سرمست اور مغرور بنادیا ہے کہ خدا کو بھی بھول گیا ہے۔خدائی تعلیمات سے روگردانی کر چکا ہے۔انسان کو انسان بنانے کے پروگراموں کو یکسر نظرانداز کر دیا ہے اور غریزی ونفسانی خواہشات اور حیوانی لذات کو پورا کرنے کے لیے اس حد

تک سرگرم عمل ہے کہ اپنی معنوی سربلندی اور رُوحانی ترقی سے بالکل ہی عاجز آ گیا ہے۔ تباہی اور بے راہروی نے آہستہ آہستہ فروغ پانا شروع کر دیا اور جرائم اور گناہوں کے اعداد وشمار اس حد تک بڑھنے لگے کہ تمام ممالک میں کم وبیش لوگوں کے لیے اخلاق سوزی اور اخلاقی تباہی اپنے عروج کو پہنچ گئی۔

متمدن دُنیا اور مادّی رجحان:

حسن اتفاق سے مغربی ممالک میں باخبر اور تعلیم یافتہ نوجوان ان نا قابلِ معافی جرائم سے واقف ہیں انسانی سوچ اور ضمیر کی اخلاقی آواز نے انہیں اس بات سے آگاہ کر دیا ہے کہ آج کی نام نہاد متمدن دنیا ہدایت اور فلاح کے رستوں سے بھٹک کر گمراہی اور بدبختی کی راہ اپنالی ہے۔ اگر اس انحراف اور بدبختی کے آگے بند باندھا گیا تو ترقی یافتہ ممالک کو ترقی پذیر ملکوں پر جو تسلط اور غلبہ حاصل ہے دنیا بھر کے لوگ اس اندھی تقلید میں سرمایہ بشریت کو ضائع کر بیٹھیں گے اور انسانیت کو عظیم اخلاقی اور معنوی مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

اب بھی ترقی یافتہ ممالک میں تعلیمی وثقافتی پروگرام، ذرائع ابلاغ عامہ، سینما، فحاشی کی آزادی غرض یہ کہ اجتماعی ماحول ایسی صورت اختیار کر چکے ہیں کہ جن کا نتیجہ اخلاقی بے راہروی اور انسانیت کی تباہی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ جوان اور نوجوان نسلیں اخلاقی بے راہروی کا شکار ہو رہی ہے۔ تباہی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ ناجائز اور منافی عفت کام، منشیات کی عادت، ناموس پر تجاوز جیسے برے کام ان میں اس قدر تیزی سے پھیل رہے ہیں کہ وہ غیر شعوری طور پر حیوانی عادات واطوار اپنا رہی ہیں۔

مذکورہ تعلیم یافتہ اور باخبر افراد مغرب کے ان طور طریقوں کے ساتھ مخالفت کے اظہار اور وہاں کی موجودہ روش سے اپنے غم وغصے کے اظہار کے لیے بسا اوقات سرکشی اور لاقانونیت پر اُتر آتے ہیں تا کہ جہاں تک ہو سکے معاشرے میں انجام دیئے جانے والے ایسے پروگراموں کو بند کرا سکیں۔ اس طرح سے وہ اپنے ان احتجاجات کے ذریعہ معاشرے میں ہونے والی ہر قسم کی برائیوں سے اپنی نفرت اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان جوانوں کو اُمید ہے کہ اس طرح سے مغربی ملکوں میں انقلاب برپا کر دیں گے۔ موجودہ مادی ثقافت کو کہ جس کی بنیاد ہی منفعت اور خواہشات نفسانی پر رکھی گئی ہے نیست ونابود کر کے ایسی ثقافت کی بنیاد رکھیں گے جس میں دونوں انسانی پہلوہوں مادی پہلو بھی اور معنوی پہلو بھی نہ جو جسم اور جان (روح) دونوں کے لیے برابر کی ضروریات پوری کر سکے۔ دنیا بھر کے لوگوں کو عام طور پر اور مغربی ممالک کے باشندوں کو خاص طور پر ان خطرات سے چھٹکارا دلائیں جو مادی افکار اور مادی ثقافت کی پیداوار ہیں۔

روحانیت اور معنویت سے بے اعتنائی:

جوان معاشرے کی سرکشی کبھی تو سخت انداز میں اور کبھی نرم صورت میں ظاہر ہوتی ہے جیسے ہپیوں کی تحریک وغیرہ جو پہلے مرحلہ میں مغربی معاشرے کے بنیادی مقاصد اور اہداف کے ساتھ ایک طرح کی ناہم آہنگی، ناسازگاری اور شک وشبے کے اظہار کی صورت میں ہوتی ہے اور درحقیقت یہ سرکشی اس نکتے کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ مغربی معاشرے نے انسان کے باطنی رجحانات، جذبات، روحانی اور بُنیادی ضروریات کو نظر انداز کردیا ہے اور فرد کی خوش بختی اور سعادت کو آلات واوزار اور نت نئی مصنوعات پر قربان کردیا ہے۔ایک ہی جملہ میں اُن کے نظریہ کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ مغربی معاشرے نے بڑی حد تک اصول کو فروغ کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

جو روحانیت زمانہ ماضی میں مذہبی یا قومی اور تاریخی رسومات پر مبنی تھی آج وہ سست پڑگئی ہے جس کا اہم مقصد مختلف نسلوں کو مشترک مقاصد اور شعار کے تحت یکجا کرنا ہوتا تھا اور ان کے درمیان باہمی رابطے اور وحدت کا اہم ذریعہ تھی۔گذشتہ زمانے میں بزرگ افراد نوجوان نسل کو دنیاوی خواہشات کے جال میں پھنسنے سے بچنے، اپنے آپ پر کنٹرول کرنے اور روحانی اقدار کو اپنانے کی ترغیب دلایا کرتے تھے،لیکن اب صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ وہی بزرگ افراد نوجوانوں کو مادی اور نفسانی لذتوں کی تشویق دلاتے ہیں اور اُنہیں مادی اور چندروزہ زندگی کے علاوہ کسی اور چیز کی رہنمائی نہیں کرتے۔شاید یہی وجہ ہے کہ آج نوجوان نسل کی آنکھوں میں ان کا وقار گر گیا ہے۔اور یہی اُن کی عزت وآبرو کی شکست کی ایک وجہ ہوسکتی ہے، کیونکہ جہاں تک نوجوانی کا عرصہ ایک ہیجان انگیز صُورت میں غرائز اور خواہشات کی تکمیل کا دورانیہ ہوتا ہے۔لیکن یہی مدت پاک باطنی، نیک سیرتی اور اصل اور اہم مقاصد تک پہنچنے کا بھی ایک دورانیہ ہوتی ہے جس میں نوجوان نسل کے دل میں بلند مقاصد اور آئیڈیل نظریات وجود میں آتے ہیں۔مادی غرائز اور خواہشات کی تکمیل ہی جوان نسل کی باطنی اور اندرونی ضروریات کی جگہ نہیں لے سکتی۔

جوانی کا عرصہ اور اہلِ ضرورت کی تلاش:

”گذشتہ تمدنوں کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہمیشہ دوسروں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے فداکاری ضبطِ نفس اور ایثار ہی نوجوان نسل کے لیے ان کی مادی خواہشات کی تکمیل سے زیادہ مسرور کن اور لذیذ ہوا کرتی تھیں۔“[۱]

[۱] غربت غرب: ص۱۰۹

آج کا انسان اور مادی اُمور:

آج کے ترقی یافتہ ممالک میں امورِ مملکت کو چلانے اور زندگی کی اہم ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اس طرح کے منصوبے بنائے جاتے ہیں کہ لاشعوری طور پر زندگی کے مختلف طبقات کی تمام تر توجہ ہی مادی اُمور کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ تمام افرادی قوت کو دنیاوی اُمور کے لیے ہی وقف کر دیا گیا ہے۔ روحانی تعلیم اور انسانی صفات کی تربیت کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تحصیل علم کا عرصہ ایک ایسا بہترین دورانیہ ہوتا ہے جس میں ابنائے ملت کو بہترین انسان بنایا جا سکتا ہے اور ان کے دل و دماغ میں ایمان اور مکارِم اخلاق کی تخم ریزی کی جا سکتی ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں اس بابرکت عرصہ کے دوران طلبہ کے لیے کوئی روحانی اور معنوی پروگرام مرتب نہیں کیا جاتا۔ بچے کے پرائمری سکول میں قدم رکھنے کے عرصے سے لے کر اس کے اعلیٰ جماعتوں تک پہنچنے اور یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے تک سارا نصاب ہی جسمانی اور بشری ضروریات کے پورا کرنے پر مشتمل ہوتا ہے۔ روحانی ترقی اور انسانی پہلوؤں پر مبنی پروگرام یا تو سرے سے ہوتا ہی نہیں، اگر ہوتا ہے تو اس قدر کم کہ طالب علم کے ضمیر اور باطن میں اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔

غیر متوازن جسم اور رُوح:

اس غلط طریقہ کار نے جسم اور رُوح کے توازن کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے اور مادی اور معنوی زندگی کے توازن کو ختم کر دیا ہے جس سے انسانی زندگی فطرت اور تخلیق کے رستے سے ہٹ گئی ہے کیونکہ ایک طرف تو مادی پہلوؤں اور خواہشات کی تکمیل کی طرف حد سے زیادہ توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ اور دوسری طرف انسان کی انسانیت اور اس کے روحانی پہلاؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے جو آدمیت کے وجود کا آدھا حصہ ہے اور جان بوجھ کر اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس طرح کی زندگی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ لوگ آہستہ آہستہ اپنی روحانی اور معنوی شخصیت کو کھو بیٹھے ہیں، انسانیت سے غافل ہو گئے ہیں اور اپنی تمام سعی و کوشش کو مفاد پرستی اور خواہشات نفسانی کی تکمیل کے لیے بروئے کار لا چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کا عمل آئین خلقت کے مخالف اور نظامِ آفرینش کے بالکل خلاف ہے جس سے وہ کبھی بھی حقیقی سعادت کو حاصل نہیں کر سکتے اور سربلندی اور ارتقاء کی منزل جو مقامِ انسانیت کے شایان شان ہے ان کے حصے میں کبھی نہیں آئے گی۔

آئین خلقت سے روگردانی:

خداوند عالم نے اپنی حکمت پر مبنی فیصلہ کے پیشِ نظر انسان کو عقل کی نعمت سے نوازا اور اسے آزاد پیدا کیا ہے اور یہ دوسری تمام مخلوقات کی نسبت انسانیت کے لیے یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ اگر آزادی کو صحیح معنوں میں استعمال کیا جائے اور

عقل کی رہنمائی میں اس سے استفادہ کیا جائے تو انسان سعادت کے اعلیٰ مراحل تک پہنچ سکتا ہے،لیکن اگر عقل کی نگرانی سے ہٹ کر اسے استعمال کیا جائے تو وہ حیوانی شہوات، اندھی اور بے مقصد خواہشات کی نذر ہوجاتی ہے جس سے معاشرے کے غلط تقاضے پورے ہوجاتے ہیں اور آزادی اُن کو محکوم اور مطیع ہوکر رہ جاتی ہے اور انسان بدبختی اور شقاوت کا شکار ہوکر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد ہوجاتا ہے۔

خود سے بے خبر لوگ:

بہت سے معاشروں کے افراد اپنی گفتار، اپنے کردار، اپنے پیشے اور اجتماعی وابستگیوں کے لحاظ سے اپنی حقیقی سرشت سے بہت حد تک ہٹ چکے ہیں اور اپنے آپ سے بے خبر ہوگئے ہیں۔خود سے بے خبر انسان کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے کسی قسم کا ارادہ اور اختیار نہیں رکھتا۔ایسے افراد درحقیقت مصلحتوں کے ہاتھوں اسیر اور ناجائز اور غلط احکامات کے لیے فرمانروا بن گئے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کے گلے میں نہ دیکھی جانے والی رسی ڈال دی گئی ہے جس کے ذریعہ وہ ہر طرف کھینچے جاتے ہیں۔

تعریف کی رو سے انسان ایک حیوان ناطق ہے۔یعنی قوت عقل وادراک کا مالک ہے اور اس میں اور اجمادات میں بہت بڑا فرق ہے۔عقل وادراک کی یہی قوت اسے اس بات کا امکان مہیا کرتی ہے کہ وہ روح کے مظاہروں کی کیفیت میں دخل اندازی کرے جو اس کی زندگی کا اصل جوہر ہے اور جب بھی ارادہ کرے یا اجتماعی اور معاشرتی حالات اسے مجبور کریں تو وہ اپنی شخصیت کو حقیقت کے خلاف جلوہ گر کرے۔

ریا اور خود سے بے خبری کا باہمی فرق:

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان کی ''خود سے بے خبری'' اور عرف عام سے بولا جانے والا کلمہ ''منافقت'' یا ''ریا'' کی ماہیت ایک جیسی ہے لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ منافقت کا تعلق ہمیشہ آگاہی اور علم کے ساتھ ہوتا ہے جب کہ خود سے بے خبری عموماً یا تو اصرار اور تکرار (بار بار کے دہرانے) سے پیدا ہوتی ہے یا پھر (اختیار کئے ہوئے مذہب) کسی بلند منصب پر پہنچ جانے کی وجہ سے معرض وجود میں آتی ہے کہ جب انسان اس منصب پر جا پہنچتا ہے اور سب لوگ اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں تو ایسی کیفیت لاشعوری طور پر وجود میں آجاتی ہے۔علاوہ ازیں ریا اور منافقت میں انسان کے اپنے ارادہ کا زیادہ عمل دخل ہوتا ہے جبکہ خود سے بے خبر انسان زیادہ تر اجتماعی ضروریات کی مجبوریوں کی وجہ سے اپنی ذاتی طبع اور حقیقی سرشت کے رشتوں کو توڑ ڈالتا ہے۔

اس مجمل بیان سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ''خود سے بے خبری'' درحقیقت نظام اجتماعی کی ناہمواریوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔[1] البتہ یہ بات مخفی نہ رہے کہ گذشتہ دور میں بھی کم وبیش ہر مُلک اور معاشرے میں کم وبیش کچھ ایسے لوگ مل جاتے تھے جنہوں نے اپنے آپ کو حیوانی غرائز اور نفسانی خواہشات کے اندر محصور کر رکھا تھا، وہ انسانیت کو فراموش کو چکے تھے اور ہمارے دور کے اہل قلم کے بقول خود سے بیگانہ تھے،لیکن اس قسم کے لوگ ہر مُلک میں ایک محدود اقلیت میں تھے،لیکن آج کی صنعتی دنیا میں ملکوں کو چلانے کا سارا دارومدار ہی مادیت پرستی اور عیش وعشرت کی طرف رجحان دلانے پر ہے۔لوگوں کی تقریباً عظیم ترین اکثریت معاشرے کے عظیم پہیوں کے ساتھ گردش کر رہی ہے اور خودشناسی کی بجائے اپنے آپ سے بے خبر ہو چکی ہے۔ بنابریں دورِ حاضر میں ''خود سے بے خبر افراد'' کے کہنے کے بجانے سے بے خبر دُنیا'' کہنا چاہیے۔

خود سے بے خبر دُنیا:

خود سے بے خبری کی کیفیت سے چھٹکارا پانے کے لیے پختہ ارادے اور عزم راسخ کی ضرورت ہوتی ہے،اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی فطرت کی طرف پلٹ آئے، اپنے آپ کو اسی طرح پہچانے جس طرح کہ وہ ہے! گمشدہ انسانیت کو تلاش کرے، اپنے آپ کو انسان بنائے اور انسان بن کر رہے،مکتب انبیاء کی پیروی کرتے ہوئے جسم اور رُوح کے درمیان توازن برقرار کرے۔ بہت سے لوگ عالم آخرت پر ایمان نہ رکھنے اور انسانی اقدار کی پرواہ کرنے کی وجہ سے خودشناسی اور خودآ گاہی کو تلاش نہیں کرتے اور نہ ہی اس بارے میں کوئی قدم اُٹھانا چاہتے ہیں، گویا اُنہوں نے یہ پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ ہمیشہ انسانیت اور انسانی ذمہ داریوں سے غافل رہیں تاکہ اس طرح سے وہ جانوروں کی سی زندگی بسر کرتے رہیں اور چونکہ حیوانوں کو زندگی بھی کھانے پینے،سونے،غیظ وغضب اور شہوت پر مبنی ہوتی ہے۔اور اسی پر ہی ان کا خاتمہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ بھی اپنے لیے حیوانوں کی سی موت اختیار کرتے ہیں۔سرانجام اپنی پست اور ذلیل زندگی ختم کر کے موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ان انسان نما جانوروں کا وجود دینی پیشواؤں اور مکتب انسان سازی کے رہنماؤں کے لیے باعث تعجب اور موجب حیرت ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''عجبت لمن ینشو ضالة وقد اضل نفسه فلا یطلبها۔''

''یعنی مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو اپنی گمشدہ چیز کو تو تلاش کرتا ہے۔لیکن اپنے گمشدہ وجود کی اُسے کوئی پرواہ نہیں۔ وہ نہ تو اسے تلاش کرتا ہے اور نہ ہی اس بارے میں کوئی قدم اٹھاتا ہے۔''[2]

---

[1] جہانی از خود بیگانہ ص ۶

[2] غرر الحکم ص ۴۹۶

مجلس نمبر2

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰکُمۡ عَبَثًا وَّ اَنَّکُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ﴿۱۱۵﴾(المومنون)

انسان اور کمال مطلق کی فکر:

انسان اپنی طبعی ساخت اور فطری کشش کے اعتبار سے ہمیشہ غیر محدود اور بے انتہا کی تلاش میں ہے اور باطنی طور پر بھی علم مطلق، قدرت مطلق، حق مطلق، عدل مطلق اور خیر مطلق کا طلبگار رہے اور ہمیشہ ہی ان چیزوں کی تلاش میں رہتا ہے۔اسی طرح وہ طبعی طور پر زندگی جاوید کی فکر میں بھی رہتا ہے۔اس کے دل میں بقائے ابدی اور بے انتہا زندگی کی تڑپ موجود ہے۔

دانشوروں نے ان فطری رجحانات اور اندرونی خواہشات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس بارے میں خوب تحقیق اور جستجو سے کام لیا ہے۔آخر کار اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔کہ انسان کے اندر کمال مطلق اور حیات جاوید کی قابلیت اور استعداد موجود ہے اور اس بے انتہا اور غیر محدود قابلیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسان میں محدود مادی پہلو کے علاوہ روح مجرو بھی موجود ہے اور وہ رُوح، مادہ کے حدود اربعہ اور مادیات میں محصور بھی نہیں ہے۔اس روح میں بے انتہا سربلندی اور ارتقاء وتکامل کی صلاحیت بھی پائی جاتی ہے۔

حد جسمت دوگز خود بیش نیست
جان تو آسمان جولان گئی است

مادہ پرست اور ایک پہلو کا نظریہ:

مادی مکتب کے پیروکار جو کائنات اور زندگی کو مادہ کے برابر سمجھتے ہیں اور ہر چیز کی مادی منطق کے ساتھ توجیہ اور تشریح کرتے ہیں انسان کے بے انتہا اور غیر محدود رجحانات کی مشکل کو حل نہیں کر سکتے کیونکہ ان لوگوں کا آفاقی تصوّر کائنات صرف مادی پہلو ہی پر منحصر ہوتا ہے جو اُنہوں نے مادی مکتب فکر سے حاصل کیا ہے۔ان کے تمام افکار اور ساری سوچیں مادہ ہی کے گرد گھومتی ہیں اور مادیات کے محدود ماحول میں مقید ہیں اور وہ مادہ کے ماوراء غیر محدود اور بے انتہا عالم سے غافل اور بے

خبر ہیں۔

لیکن مکتب انبیاء کے پیروکار جوکہ کائنات کے بارے میں اس کے دونوں پہلوؤں پر ایمان رکھتے ہیں، نہ تو وجود کو صرف مادی نکتہ نظر سے دیکھتے ہیں اور نہ ہی عالم ہستی کو مادہ اور مادیت میں منحصر سمجھتے ہیں۔ وہ ایک طرف تو مادہ پرستوں کی مانند مادی دُنیا اور مادی مخلوق کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ دوسری طرف غیر مادی حقائق اور مادی دُنیا سے ہٹ کر کئی اور جہانوں کو بھی مانتے ہیں۔

انبیاء کا مکتب اور مبداء و معاد پر ایمان:

انبیاء کرام کے آسمانی اور الٰہی مکتب فکر کی اصل دو بنیادی اُصولوں پر استوار ہے۔ ایک تو خدا پر ایمان اور دوسرے قیامت پر اعتقاد۔

خدا پر ایمان:

انبیاء کرام علیہم السلام لوگوں کو اس خدا کی طرف بلاتے ہیں جس نے تمام ماسویٰ اللہ کو پیدا کیا ہے۔ جو خدا مادہ اور تمام مادی شائبوں سے منزہ و مبرا ہے جس کی کوئی حدحدود نہیں ہیں۔ جس کی ذات غیر متناہی ہے۔ جس کے علم کی کوئی انتہا نہیں ہے، غرضیکہ جو تمام صفات کمال کا جامع ہے اور جس کے کمالات لامحدود اور غیر متناہی ہیں۔ انبیاء کرام نے اپنے مکتب کے آفاقی نظریہ میں واضح کر دیا ہے کہ تمام لوگوں کی بازگشت اسی کی طرف ہے، لہٰذا ان پر فرض ہے کہ وہ دُنیا میں خود کو سدھاریں، اپنی غیر محدود استعداد کو بے انتہا کمال مطلق کی راہ میں صرف کریں۔ سربلندی اور ارتقاء کے مدارج کو سعی و عمل کی روشنی میں طے کریں، اپنے آپ کو کمال کی صفات سے متصف کریں، اپنے مکان کی حد تک کامل مطلق یعنی خدا کی مقدس ذات سے اپنے آپ کو مشابہ بنائیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

يَاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۝ (الانشقاق)

"اے انسان خبردار ہو جا کیونکہ تو سعی وکوشش کے ذریعہ، رنج و مصائب برداشت کر کے اور اپنے پروردگار کے راستے پر چل کر ہی اس کی ملاقات کا شرف حاصل کرے گا۔"[1]

---

[1] سورہ ۸۴ آیہ ۶

کمال مطلق سے مشابہت پیدا کریں:

اسلام کے سچے پیروکار، اولیائے دین کی تعلیمات کے تحت ہمیشہ اس بات کے پابند ہیں کہ معنوی سربلندی اور روحانی ارتقاء کے حصول کے لیے تاحدامکان کوشش کریں اور جو دن بھی ان پر آئے اسی کی مقدار بے انتہا کمال کی جانب پیش رفت کریں اور سعادت وفلاح کے نئے مرحلے تک پہنچنے کی کوشش کریں ورنہ خسارے میں ہیں۔

لوگوں کے ایام زندگی:

چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔"

"من استوی یوماه فهو مغبون، ومن کان آخر یومیه خیرهما فهو مغبوط، ومن کان آخر یومیه شرهما فهو ملعون، ومن لم یر الزیادة فی نفسه فهو الی النقصان ومن کان الی النقصان فالموت خیرله من الحیوة۔"

''یعنی انسانی کمال کے لحاظ سے جس کے دونوں دن یکساں ہوں تو وہ مغبون ہے، کیونکہ ایک دن کی مقدار کا زمانہ اُس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس کے بدلے اُسے کچھ بھی نہ ملا، جس کا پہلا دن دوسرے دن سے بہتر ہو وہ فائدہ میں ہے۔ اور دوسرے لوگوں کو اس پر رشک کرنا چاہیے۔ جس کا پہلا دن دوسرے دن سے بدتر ہو وہ ملعون اور راندہ درگاہ الٰہی ہے، جو شخص معنوی ترقی کے لحاظ سے آگے نہیں بڑھتا اور اپنے روحانی کمال میں ترقی نہیں کرپاتا وہ نقصان اور خسارے میں ہے اور جس کی زندگی نقصان اور خسارے کی طرف جارہی ہو، اس کے لیے موت بہتر ہے۔''[1]

زندگی بہتر ہے:

خلاصہ کلام انسان ہمیشہ کمال مطلق کی فکر میں ہے اور اس کی بے انتہا خواہشات ہیں، محدود مادیات لامحدود خواہشات کو پورا نہیں کرسکتیں، بلکہ مادی لذتوں اور نعمتوں کو پاکر اور دولت وثروت اور دنیاوی جاہ ومنصب کو حاصل کرکے سیر ہوجاتا ہے اور اس کا دل اچاٹ ہونے لگتا ہے۔ اُس کے ساتھ اُسے پھر بھی کسی بے انتہا کی تلاش رہتی ہے تاکہ اپنی غیر محدود خواہشات کو پورا کرسکے اور اپنے غیر مطمئن نفس کی تسکین کرسکے۔ لیکن یہ مقصد خدا کو یاد کیے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔

---

[1] معانی الاخبار ص ۳۴۲

ایسے خدا کی یاد جس کی کوئی حد وانتہا نہیں ہے جو کامل مطلق اور کمال کی تمام صفات کا جامع ہے لہٰذا انسان ایک غیر محدود و بے انتہا خدا کی ذات سے مشابہت پیدا کر کے غیر محدود کمال کی راہ طے اور بے انتہا سر بلندی کی طرف پیش رفت کر سکتا ہے۔ اپنی طلب کی روح مطلق کو راضی اور اپنے دل بے قرار کو اطمینان وسکون عطا کر کے اور اس کی یاد اور اس سے معنوی تقرب حاصل کر کے ہمیشہ کا سکون ومسرت اور دائمی خوشی حاصل کر سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

''الا بذکر اللہ تطمئن القلوب'' خبردار ہو کہ صرف یاد خدا ہی سے دلوں کو سکون واطمینان حاصل ہوتا'[1] '

یادِ خدا اور قلبی سکون:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اوحی اللہ عزوجل الی دائود علیہ السلام یا دائود بی فافرح وبذکری فتلذذ وبمنا جاتی فتنعم"

"من استوی یوماہ فھو مغبون، ومن کان آخر یومیہ خیرھما فھو مغبوط، ومن کان آخر یومیہ شرھما فھو ملعون، ومن لم یر الزیادۃ فی نفسہ فھو الی النقصان ومن کان الی النقصان فالموت خیرلہ من الحیوۃ۔"

''یعنی انسانی کمال کے لحاظ سے جس کے دونوں دن یکساں ہوں تو وہ مغبون ہے، کیونکہ ایک دن کی مقدار کا زمانہ اُس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس کے بدلے اُسے کچھ بھی نہ ملا، جس کا پہلا دن دوسرے دن سے بہتر ہو وہ فائدہ میں ہے اور دوسرے لوگوں کو اس پر رشک کرنا چاہیے، جس کا پہلا دن دوسرے دن سے بدتر ہو وہ ملعون اور راندہ درگاہ الٰہی ہے، جو شخص معنوی ترقی کے لحاظ سے آگے نہیں بڑھتا اور اپنے روحانی کمال میں ترقی نہیں کر پاتا وہ نقصان اور خسارے میں ہے اور جس کی زندگی نقصان اور خسارے کی طرف جا رہی ہو، اس کے لیے موت بہتر ہے۔''[2]

---

[1] سُورہ ۱۳ آیت ۲۸

[2] معانی الاخبار ص ۳۴۲

زندگی بہتر ہے:

خلاصہ کلام انسان ہمیشہ کمال مطلق کی فکر میں ہے اور اس کی بے انتہا خواہشات ہیں، محدود مادیات لامحدود خواہشات کو پورا نہیں کرسکتیں بلکہ مادی لذتوں اور نعمتوں کو پا کر اور دولت وثروت اور دنیاوی جاہ ومنصب کو حاصل کر کے سیر ہوجاتا ہے اور اس کا دل اچاٹ ہونے لگتا ہے۔اُس کے ساتھ اُسے پھر بھی کسی بے انتہا کی تلاش رہتی ہے تا کہ اپنی غیر محدود خواہشات کو پورا کرسکے اور اپنے غیر مطمئن نفس کی تسکین کرسکے، لیکن یہ مقصد خدا کو یاد کیے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ایسے خدا کی یاد جس کی کوئی حدودوانتہا نہیں ہے جو کامل مطلق اور کمال کی تمام صفات کا جامع ہے، لہٰذا انسان ایک غیر محدود و بے انتہا خدا کی ذات سے مشابہت پیدا کر کے غیر محدود کمال کی راہ طے اور بے انتہا سر بلندی کی طرف پیش رفت کرسکتا ہے۔اپنی طلب کی روح مطلق کو راضی اور اپنے دل بے قرار کو اطمینان وسکون عطا کر کے اور اس کی یاد اور اس سے معنوی تقرب حاصل کر کے ہمیشہ کا سکون ومسرت اور دائمی خوشی حاصل کرسکتا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

''الابذکر اللہ تطمئن القلوب''خبردار رہو کہ صرف یادخدا ہی سے دلوں کو سُکون واطمینان حاصل ہوتا ہے''[1]۔

یادِ خدا اور قلبی سکُون:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"اوحی اللہ عزوجل الی دائودؑ یادائودبی فافرح وبذکری فتلذذوجاتی فتغم"

''یعنی خداوند عالم نے داوٗد علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ اے داوٗد! مجھے یاد کرو اور خوش رہو، میری یاد کے ذریعہ لذتیں اٹھاوٗ، اور میری مناجات کے ذریعہ خود کو نعمتوں سے بہرہ مند کروٗ''[2]

خلاصہ کلام خدا پر ایمان ہی انبیاء کرام علیہم السلام کے مکتب کی سب سے پہلی اور بنیادی اصل ہے۔انسان کی مطلق خواہشات اور بے انتہا طلب کا جواب دے سکتا ہے جس انسان مین غیر محدود خواہشات ہوں اور ہمیشہ کمال مطلق کی فکر میں ہو وہ کبھی بھی محدود مادیت کے ساتھ قانع نہیں ہو پاتا، اور مادی مکتب بھی اس کی بے انتہا خواہشات کا مثبت جواب نہیں دے سکتا،

---

[1] سُورہ ۱۳ آیت ۲۸

[2] امالی صدوق، ص ۱۱۸

لیکن انبیاء علیہم السلام کا مکتب جس کی بُنیاد خدا کے ایمان پر رکھی گئی ہے وہی انسان کی بے شمار خواہشات کا جواب دے سکتا ہے کیونکہ جو شخص صحیح معنوں میں پروردگار عالم پر ایمان لے آتا ہے اور اس کے روحانی قرب کو ہی اپنے ارتقاء کا منتہائے مقصود سمجھتا ہے وہی شخص اللہ تعالی کے امر پر عمل کرے نہی شدہ چیزوں سے ہٹ کر اپنی نفسیانی خواہشات پر قابو پالیتا ہے۔ سرکش غرائز کو مسخر کرلیتا ہے اسی طرح معنوی تسلط اور روحانی قدرت کے ذریعہ اس پر کمال مطلق کی راہیں کھُل جاتی ہیں۔ روز بروز بے انتہا کمال وسربلندی کی جانب رواں دواں رہتا ہے اور ہر روز نت نئے کمال کو حاصل کرتا رہتا ہے۔

قیامت پر ایمان:

حیات جاوید اور بے پایان زندگی کا تصوّر انسان کی ایک فکر ہے جو فطری طور پر انسان کے دل میں موجود ہے۔ اس خواہش کی تکمیل بھی دوسری غیر محدود خواہشات کی مانند اس محدود اور ناپائیدار دُنیا میں ناممکن ہے۔ مادی مکاتیب فکر کے پاس ایسی مشکل کے حل کا کوئی راستہ نہیں ہے، کیونکہ ان کے نزدیک انسان مرنے کے ساتھ ہی فنا اور نیست ونابود ہوجاتا ہے لیکن انبیاء کرام علیہم السلام کے مکتب میں انسان کی موت نیستی ونابودی کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ رُوح ایک سرائے سے دوسری سرائے میں منتقل ہوجاتی ہے اور جب کہ سابقہ فصل میں اشارہ ہو چکا ہے کہ تمام انبیاء نے اس بات سے مطلع فرمایا ہے کہ اس دنیا کے ختم ہوجانے کے بعد عالم قیامت برپا ہوگا۔ لوگ دوبارہ زندہ ہوں گے اور وہیں سے نئی زندگی کا آغاز کریں گے لہٰذا معاد کا مسئلہ خدا پر ایمان کے بعد مکتب انبیاء کا اہم ترین اور بنیادی رُکن ہے۔ اُس جہان میں ایسے قوانین اور نظام حکم فرما ہوں گے جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ دُنیا ناپائیدار اور بے قرار ہے، جبکہ آخرت کی زندگی ہمیشہ، ابدی اور برقرار ہے۔

آخرت اور حیات جاوید:

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”دُنیا کی ہر چیز ناپائیدار اور فانی ہے، اور آخرت کی ہر چیز جاوید اور باقی ہے۔“[1]

بنابریں مکتب انبیاء علیہم السلام کے مطابق انسان کو آخرت میں زندگی جاوید ملے گی مرنے کے بعد ہمیشہ کی زندگی کی خواہش جامہ عمل پہنے گی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہاں رہے گا۔

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا عالمِ آخرت پر ایمان اور مرنے کے بعد کی زندگی پر یقین کا مرنے سے پہلے کی زندگی پر بھی کوئی اثر پڑتا ہے؟ آیا یہ امان اور عقیدہ لوگوں کے دنیاوی حالات میں بھی کسی قسم کی تبدیلی پیدا کرسکتا ہے

---

[1] غرر الحکم ۸۷۵

اور اُن کے افکار واعمال میں کسی طرح کی تبدیلی لاسکتا ہے؟ تو اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہے اور اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ مکتب انبیاء کو قبول کر لینا، روز جزا پر ایمان لے آنا اور خدائی سزا اور جزا کا باور کر لینا انسان کے طرز تفکرّ اور نظریات میں زبردست تبدیلی پیدا کر دیتا ہے، اور انسان کے باطن میں بُنیادی تبدیلی وجود میں لے آتا ہے۔ عالم آخرت پر ایمان دنیاوی زندگی کو معنی اور مفہوم عطا کرتا ہے، انسان کے ضمیر میں ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے، اسے فرض شناسی اور صحیح راہ پر گامزن ہونے کی ترغیب دلاتا ہے، نتیجہ کے طور پر انسان خدا کے ثواب وعذاب پر باطنی عقیدہ رکھنے کی وجہ سے جرائم اور گناہوں سے اجتناب کرتا ہے، معاد پر ایمان رکھنے کے بارے میں مزید وضاحت کی جاتی ہے۔

ا۔ انسان ایک طرف تو فطری اور طبعی کشش کی وجہ سے زندگی جاوید کی فکر میں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہمیشہ زندہ رہے تا کہ وہ اپنی غیر محدود خواہشات اور بے انتہا لیاقتوں اور استعداد کو عملی جامہ پہنائے تا کہ اس طرح سے وہ اس کمال تک جا پہنچے جس کی اُسے آرزو ہے، جبکہ دوسری طرف اُسے یہ بھی معلوم ہے کہ دُنیا کی یہ زندگی چندروزہ اور محدود ہے۔ نہ تو یہاں پر حیات جاوید کا غریزہ اپنی تکمیل کو پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی بے انتہا اور غیر محدود خواہش پوری ہوسکتی ہے۔

دنیاوی زندگی سے لوگوں کی پریشانی:

ان دو باہم مخالف اور ناہم آہنگ احساسات کی وجہ سے ترقی یافتہ ممالک کے بہت سے تعلیم یافتہ اور خوشحال افراد اپنی زندگی کے بارے میں پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ دنیاوی زندگی اُنہیں بے مقصد اور کھوکھلی نظر آتی ہے۔ دنیاوی زندگی کے بے فائدہ اور فضول ہونے کی فکر نے اُنہیں روحانی بیماریوں اور پریشانیوں میں مبتلا کر دیا ہے جس سے نجات کا ذریعہ وہ صرف خودکشی ہی کو کہتے ہیں اور پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ زندگی سے مایوسی اور پریشانی ان لوگوں کی رُوح میں اس قدر گہرا اتر کر چکی ہے۔ کہ ماہرین نفسیات بھی اُنہیں اس بارے میں نہ تو کوئی اُمید دلا سکتے ہیں اور نہ ہی خودکشی سے روک سکتے ہیں۔

’’پرنسٹن یونیورسٹی کے ماہر معاشرہ شناس پروفیسر پروفیسر ڈونلڈ لائٹ (   ) نے یونسکو سے شائع ہونے والے اجتماعی علوم کے رسالے میں ایک مضمون لکھا ہے جس میں اُنہوں نے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس وقت امریکہ میں پانچ ملین (پچاس لاکھ) لوگ ایسے ہیں جو اپنی زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ خودکشی کا اقدام کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں خودکشی کے مسئلہ پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ اس اقدام کے خلاف کئی انجمنیں اور فاؤنڈیشنز تشکیل دی گئی ہیں تا کہ ایک تو اس بارے میں تحقیقات کریں اور دوسرے جو لوگ خودکشی پر مصمم ہیں ان کی کوئی امداد کریں۔‘‘

ناقابلِ علاج تشویش:

مسٹر لائٹ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس قسم کے ٹیکنیکی اقدام نے ان لوگوں پر بہت کم اثر کیا ہے جو اس قسم کے ارادے میں مصمم ہیں، ماہرینِ نفسیات اور معاشرہ شناس افراد کی طرف مذکورہ فنون اور ٹیکنیک ان لوگوں کے لیے کارگر ثابت نہیں ہوسکتی جو دنیاوی زندگی کے کھوکھلے پن سے مایوس اور زندگی کے بارے میں بے یقینی اور تنہائی کے احساس کا شکار ہوکر خودکشی پر اُتر آتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات انہیں زندگی کے بارے میں نہ تو کوئی اُمید دلا سکتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کا اعتقاد پختہ کرسکتے ہیں۔ موجودہ نسل میں روحانی اور اجتماعی بحران سے پیدا ہونے والا اضطراب اور بے چینی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جن کا علاج نفسیات یا فنون اور ٹیکنیک سے کیا جاسکے۔"[1]

معاد کا انکار اور دُنیا کا کھوکھلا پن:

دنیاوی زندگی ان لوگوں کو نگاہوں میں بے معنی اور کھوکھلی ہے جو مادیات پر جان دیتے ہیں نہ کائنات کو صرف مادہ ہی تک محدود سمجھتے ہیں، انسان کو سو فیصد مادی سمجھتے ہیں، غیر مادی روح کے قائل نہیں ہیں جو درحقیقت غیر محدود کی قرارگاہ ارتقاء و تکامل کا ذریعہ ہے۔ یہ لوگ انبیاء کے مکتب اور خدا کے دین سے یکسر غافل ہیں مرنے کے بعد عالم اور آخرت کی زندگی جاوید پر عقیدہ نہیں رکھتے، اور یہی گمان کرتے ہیں کہ انسان کی زندگی فقط یہی چند روزہ دنیاوی زندگی ہے اور مرنے کے بعد فنا اور نیست و نابود ہوجائیں گے۔ البتہ ایسے لوگوں کو چونکہ طرزِ عمل ہی ایسا ہے، لہٰذا دنیاوی زندگی انہیں کھوکھلی اور فضول ہی نظر آنی چاہیے اور اس دُنیا کو زود گذر زندگی جو تھکا دینے والے مکرر اُمور کا مجموعہ ہے اُن کی نظر میں فضول اور بیکار ہونی ہی چاہیے۔

"مغرب کے عظیم ماہرین نفسیات میں سے ایک پروفیسر یونک ہیں۔ وہ کہتے ہیں، ساری دُنیا سے میرے پاس علاج کی غرض سے رجوع کرنے والے لوگوں میں سے دو تہائی افراد کی تعداد ایسی ہے جو تعلیم یافتہ اور کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ زندگی کا بے مقصد (بے معنی) اور فضول ہونا ایسے دور میں جو انہیں ہر وقت اس تکلیف میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ٹیکنالوجی، تعلیم کا جمود، کوتاہ نظری اور تعصب کی وجہ سے بیسیویں صدی کا انسان "لامذہب" ہوچکا ہے اور اپنی رُوح کی تلاش میں سرگردان ہے، لہٰذا جب تک کوئی مذہب آگے نہیں آئے گا۔ اُسے آرام نصیب نہیں ہوگا اور مذہب کے بغیر زندگی یونہی بے مزہ، فضول اور بے معنی ہی رہے گی"[2]

---

[1] غربت غرب ص ۱۸

[2] روزنامہ کیہان شمارہ نمبر ۸۱۹۶

مادہ پرستی اور مفاد پرستی

مادی مکتب کے پیروکار جو اپنی زندگی کا مقصد صرف خودغرضی، مفاد پرستی اور مادی کامیابیوں ہی کو سمجھتے ہیں۔وہ صرف اس مادی دُنیا ہی کو دیکھتے ہیں اور اس عالم کے ماورا کائنات سے بے خبر ہیں۔اسی لیے اُن کی تمام تگ ودو صرف مادی اُمور ہی تک محدود ہے۔وہ ہمیشہ اسی کوش میں لگے رہتے ہیں کہ جتنا زیادہ سے زیادہ ہوسکے مال ودولت کو سمیٹیں۔جتنا زیادہ ہوسکے دُنیاوی لذتوں سے بہرور ہوں اور ہر طرف سے اپنی کامیابی وکامرانی کے اسباب فراہم کریں۔

ایمان کے سائے میں بلندیوں کا حصول:

مکتب انبیاء کے سچے پیروکار اس دنیا کو جو سرائے کی مانند ہے اپنے لیے خودسازی کی کلاس سمجھتے ہیں اور انہیں یقین ہے کہ انسان کی ابدی آسائش اور آرام کی جگہ مرنے کے بعد کی منزل ہے۔وہ اگر اس دنیا سے فائدہ اُٹھاتے بھی ہیں تو صرف اس حد تک کہ روح اور جسم کا رشتہ برقرار ہے اور مادی ضروریات پوری ہوسکیں۔وہ صرف اس حد تک اس دُنیا سے فائدہ اُٹھاتے ہیں کہ صحت وسلامتی اور توانائی کو بحال رکھ سکیں۔وہ کبھی بھی مفاد پرستی اور عیش وعشرت کو اپنی زندگی کا بنیادی مقصد نہیں سمجھتے اور نہ ہی اس بارے میں اپنی تمام توانائیاں خرچ کرتے ہیں۔بالفاظ دیگر حقیقی مومنین کی نگاہ میں یہ دُنیا منتہائے مقصود نہیں بلکہ منزل مقصود تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔یہ لوگ دوسرے لوگوں کی دنیاوی نعمتوں سے فائدہ تو اٹھاتے ہیں لیکن اُن کا آخری مقصود سربلندی اور ارتقاء کے مراحل کو طے کرنا ہوتا ہے۔وہ خودکو انسان بنانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی فکر میں ہوتے ہیں۔معارف خداوندی کو حاصل کرنے اور مکارم اخلاق سے خودکو مزین کرنے کی سعی میں منہمک ہوتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ اس زودگزر دُنیا سے جتنا زیادہ ہوسکے علمی، ایمانی، اخلاقی اور علمی سرمایہ جمع کرکے دائمی زندگی کے لیے جو آخرت میں نصیب ہوگی اس سے فائدہ اُٹھائیں۔حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"انما الدنیا منتھی بصر الاعمیٰ لایبصر مماورائھا شیئا والبصیر ینفذبصرہ ویعلم ان الدارورائھا فالبصیرمنھا شاخص والاعمیٰ الیھا شاخص والبصیر منھا متزودوالاعمیٰ لھا متزود۔ [1]

یعنی یہ چندروزہ دنیا دل کے اندھے اور بے خبر انسان کے لیے اس کا آخری مطمع نظر ہے۔وہ اس کے پیچھے دوسرے کسی عالم کو نہیں دیکھ پاتا، لیکن صاحب بصیرت اور باخبر انسان اس کے بعد کے جہان کو بھی

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۳۳

دیکھتا ہے۔اچھی طرح جانتا ہے انسان کا دائمی اور مستقل ٹھکانہ اس دنیا کے ماوراہے۔صاحبِ بصیرت انسان دنیا کی نگاہوں سے مرنے کے بعد کے عالم کی طرف بھی متوجہ ہے اور دل کا اندھا صرف اسی دنیا پر نگاہیں گاڑے ہوئے ہے۔صاحب بصیرت شخص اس دُنیا سے مرنے کے بعد والی دُنیا کے لیے توشہ اور زادِراہ مہیا کرتا ہے جب کہ دل کا اندھا صرف دُنیا ہی کے لیے سب کچھ اکٹھا کرتا ہے۔"

صاحبِ بصیرت انسان اور مستقبل پر اس کی نگاہ:

حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

"یابن آدم انك لم تزل فی هدم عمرك منذ سقطت من بطن امك فخذ مما فی يديك لها بين يديك فان المومن يتزود والكافر يتمتع۔"

"یعنی اے فرزند آدم! تُو نے جونہی اس دُنیا میں قدم رکھا ہے مسلسل اپنی زندگی کے ایام کم کرتا آ رہا ہے لہٰذا فرصت کو غنیمت جان اور جو کچھ تمہارے اختیار میں ہے ابھی سے بعد میں درپیش ہونے والی منازل اور مراحل کے لیے زادراہ اکٹھا کر، کیونکہ مومن دُنیا سے زادراہ لیتا ہے اور کافر اس کی لذتوں میں کھویا رہتا ہے۔"[1]

فرصت کو غنیمت جانو:

بدقسمتی سے جولوگ اس دُنیا کی لذتوں میں کھوئے رہتے ہیں اور شہوت رانی ہی کو اپنی زندگی کا اصل مقصد سمجھتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہیں آخر ان کو بھی شکست اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے کیونکہ ایک طرف تو فطری طبی، قانونی اور اجتماعی رکاوٹیں اُن کے سدراہ ہوتی ہیں اور اُنہیں اُن کے حسبِ دل خواہ لذت نہیں اُٹھانے دیتیں۔

دُنیا اور اس کی تلخیاں:

ادھر دوسری طرف دُنیا کی طبیعت کے ساتھ تلخیاں اور ناگواریاں اس حد تک مخلوط ہیں کہ جب اس کی لذتیں اور خوشیاں حد سے بڑھ جائیں تو دردناک اور ناخوش گوار صورت اختیار کر لیتی ہیں اور عیش وطرب کی بجائے رنج وغم کا سبب بن

---

[1] بحارالانوار جلد ۱۷ ص ۱۴۷

جاتی ہے۔

طرب افسردہ کند چہ زحد درگزرد
آب حیوان بکشد نیز چہ ازسرگرد
من ازاین زندگی یک نہج آزردہ شدم
گرچہ قنداست نخواہم کہ مکرگزرد
گرہمہ دیان ایک سلسہ مکروہات است
کاش این عمر گراں مایہ سبکتر گزرو

''یعنی اگر خوشی حد سے بڑھ جائے تو غمگین کر دیتی ہے آب حیات اگر سر سے گزر جائے تو مار ڈالتا ہے میں تو ایک ڈھنگ کی دُنیا سے تنگ آ چکا ہوں، اگر چہ زندگی شیریں ہے لیکن میں اسے دوبارہ نہیں چاہتا۔مگر اے کاش کہ یہ قیمتی عمر آسانی کے ساتھ گزر جاتی۔

جن لوگوں کی نظروں میں دُنیا فضول ہے:

یہ دنیاوی زندگی جن لوگوں کی نگاہ میں فضول اور بے معنی ہے اور اس روحانی بیماری سے دُکھی ہیں اکثر وہی لوگ ہیں جن کا اس دُنیا میں خودغرضی اور عیش ولذت کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہوتا، ایسے لوگ مادی مکتب کے پیروکار ہیں اور موت کو انسان کی فنا اور نابودی سمجھتے ہیں۔

یہ لوگ ایک طرف تو فطری طور پر حیاتِ جاوید کی فکر میں ہیں اور ہر وقت دائمی زندگی کی خواہش کرتے ہیں دوسری طرف یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ موت یقیناً آ کر رہے گی۔اور ان کے عقیدہ کے مطابق موت انسانی زندگی کی فنا کا نام ہے جس سے اس کا تمام وجود ملیا میٹ ہوجاتا ہے۔وہ اپنے آپ سے کہتے ہیں ہمارا یہ فضول آنا جانا کس لیے ہے؟ ہم یہاں کیوں آئے اور پھر کیوں چلے جائیں گے یہ چندروزہ زندگی جو تھکا دینے اور ملال اور امور کا مجموعہ ہے آخر اس کا کیا فائدہ ہے؟ آیا بہتر نہیں ہے کہ خودکشی کر کے ہی عمر کی اس طویل رسی کو کاٹ ڈالیں اور جتنا جلدی ہوسکے اس عبث اور فضول زندگی کا خاتمہ کر دیں؟

دُنیا تھکا دینے والی ہے:

لیکن جو لوگ مکتب انبیاء کے پیروکار ہیں وہ اس کائنات کو ادیانِ الٰہی کے آئینہ میں دیکھتے اور مرنے کے بعد کی

زندگی پر عقیدہ رکھتے ہیں، دنیاوی زندگی میں ان کا اصل اور حقیقی مقصد مفاد پرستی اور مادی لذتوں کا حصول نہیں ہوتا۔ یہ لوگ دُنیا اور آخرت کو باہمی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ ''آج'' کے متعلق سوچتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ''فکر فردا'' بھی کرتے ہیں اور کل کو سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر اس بات کی طرف بھی اُن کی توجہ ہے کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا اچھا یا بُرا انجام اس کے مرنے سے پہلے کی زندگی کے تابع ہے۔ اسی لیے اس دُنیا میں پھُونک پھُونک کر قدم رکھتے ہیں اور کارِ خیر بجالاتے ہیں۔ اپنے فرائض کو احسن طور پر ادا کرتے ہیں۔ اپنے دامن کو گناہ کی آلودگیوں سے ملوث نہیں کرتے اور اپنے لیے آخرت کی بدبختی اور سیاہ روزی کے اسباب فراہم نہیں کرتے۔

موت یا دوسری ولادت:

مکتب انبیاء کے پیروکاروں کی نظر میں اس دُنیا میں لوگوں کی زندگی ایسے ہے جیسے شکم مادر میں بچے کی ہوتی ہے اور انسان کی موت بمنزلۂ ''دوسری ولادت'' کے ہے جس طرح ماں کے پیٹ میں بچے کی زندگی کا دورانیہ عارضی ہوتا ہے اسی طرح اس دُنیا میں انسان کی زندگی کا دورانیہ عارضی ہوتا ہے جس طرح بچہ ماں کے پیٹ سے باہر رحمِ مادر کے محدود ماحول کو ترک کر کے دُنیا کے وسیع ماحول میں قدم رکھتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی PLACENTA بھی ہوتی ہے لیکن اسے انسان سے جدا کر کے زمین میں دبا دیتے ہیں مگر انسان زندہ رہتا ہے۔ اسی طرح مرنے کے ساتھ ہی انسان دنیا کے رحم'' کی تنگنائیوں کو الوداع کر کے آخرت کے وسیع ترین ماحول میں قدم رکھتا ہے اس کا بدن جو رحم دُنیا میں اس کی پلینسٹا PLACENTA کے مانند ہوتا ہے قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے جو خاک میں مل کر مٹی بن جاتا ہے، لیکن اس کی رُوح ایک وسیع ترین عالی ترین عالم میں منتقل ہو جاتی ہے۔ جس طرح بچہ ماں کے پیٹ میں پروان چڑھتا ہے وہیں پر اس کے اعضاو جوارح تیار ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک عضو دنیاوی کاروبار چلانے اور سعادت کو حاصل کرنے کے لیے ضروری یا کم از کم مفید ہوتا ہے، اسی طرح انسان کے لیے بھی چاہیے کہ دُنیا میں سعادت ابدی کو حاصل کرنے کے لیے خودسازی کرے اور اپنے کو سنوارے۔ معنوی کمالات اور مکارم اخلاق سے مزین ہو، تاکہ مرنے کے بعد وہ اپنی زندگی کو اچھے انداز سے بسر کرے اور آخرت کی فلاح ورستگاری سے بہرہ مند ہو۔

خودسازی اور فلاح:

اگر بالفرض بچہ، اپنی ماں کے پیٹ میں اندھا تخلیق ہو کر اندھا ہی متولد ہوتا ہے تو وہ اپنی ساری زندگی اندھا ہی رہے گا اور بینائی کی نعمت سے ہمیشہ محروم رہے گا اور اسے ساری زندگی اپنی آنکھوں کا صدمہ ستاتا رہے گا۔ اسی طرح انسان

بھی اگر اس دُنیا میں اپنی چشم بصیرت نہ کھولے اور خود ساری زندگی اندھا ہی رکھے تو عالم آخرت میں اندھا محشور ہوگا اور تا ابد اسی دُکھ درد اور عذاب میں مبتلا رہے گا۔

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۷۲﴾ (الاسراء)

''یعنی جس شخص کے دل کی آنکھیں اس دُنیا میں اندھی ہیں وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا اور گمراہی میں بڑھ کر ہوگا''[1]

قیامت میں دل کے اندھوں کا حشر:

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ شکم مادر میں بچے کو اپنی طرف سے کوئی اختیار نہیں ہوتا اور نہ اپنی طرف سے کوئی ارادہ کر سکتا ہے، اپنی ساخت اور بناوٹ میں بھی وہ بالکل بے اختیار ہے کہ اپنی حسب دل خواہ بناوٹ اور ساخت کو حاصل کر سکے۔ وہ تکوینی قوانین اور عوامل وارثت کے ہاتھوں مجبور ہے۔ وہ جبر خلقت کے تحت وہ طبیعی قوانین اور تخلیق طریقوں کے مطابق خلق کیا جاتا ہے۔ یہ نظامِ خلقت کا جبر ہی ہوتا ہے جس سے اُس کے اندرونی اور بیرونی اعضا کی تشکیل ہوتی ہے اور وہ کامل یا ناقص، صحیح وسالم یا معیوب، عاقل یا دیوانہ، زیرک یا پاگل، متوازن یا غیر متوازن اور خوبصورت یا بدصورت تخلیق ہوتا ہے اور پھر زبردستی اُسے شکم مادر سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔

انسان خودسازی میں آزاد ہے:

لیکن مادر گیتی کے شکم میں انسان کی صورتِ حال اس طرح نہیں ہے، وہ دُنیا میں آزاد ہے اگر چاہے تو خود سازی کر کے اپنے آپ کو انسان بنائے، انسانی اخلاق وصفات سے آراستہ ہو، تکامل وارتقاء اور سربلندیوں کو حاصل کرے جو مقامِ انسانیت کے شایانِ شان ہیں۔ اگر چاہے تو عملی طور پر انسانیت کو ٹھوکریں لگائے، اپنے اندر درندوں اور چوپالوں کی صفات کو پروان چڑھائے اور خود کو حیوان یا ان سے بھی ذلیل وخوار بنادے۔

شُکر اور ناشُکری:

خداوند عالم نے لوگوں کی ہدایت، سربلندی وارتقاء کی منزلوں کی رہنمائی اور حصولِ سعادت کے رستوں کی فراہمی کے لیے تاریخی طور پر تمام زمانوں میں اپنے پیغمبروں کے ذریعہ شرعی مقاصد اور دینی قوانین کا اعلان فرمایا۔ انسان کو شقاوت

---

[1] سُورہ ۱۷ آیت ۷۲

اور سعادت کی راہیں دکھلا دیں اور دینی تعلیمات کے قبول کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اُسے اختیار دیا۔اس چیز کو قرآن مجید نے اپنے لفظوں میں بیان فرمایا ہے کہ:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴿٣﴾ (الانسان)

''یعنی ہم نے انسان کو تشریعی ہدایت کی نعمت سے نوازا ہے،لیکن وہ آزاد ہے چاہے تو اس ہدایت کی نعمت کا شُکریہ ادا کرے اور اس کی پیروی کرے اور چاہے تو نعمت سے روگردانی کرے۔''[1]

جو لوگ خدائی ہدایت کو قبول کرتے ہیں اور باری تعالیٰ کی تشریعی رہنمائی پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور خود کو صحیح معنوں میں انسان بناتے ہیں تو وہ قیامت میں بھی انسان محشور ہوں گے۔متقی اور فلاح پانے والے لوگوں میں اُن کا شمار ہوگا اور خدا کی بے انتہا نعمتوں کے مستحق ہوں گے۔لیکن جو جو لوگ ہدایتِ الٰہی سے جی چراتے ہیں،انسانی صفات اور انسانیت کا کوئی احترام نہیں کرتے بلکہ حیوانی صفات کو اپنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں وہ آخرت میں بھی گمراہ لوگوں کے زمرے میں محشور ہوں گے اور اپنی دنیاوی بدکاریوں کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

دُنیا انبیاء کے نقطہ نظر سے:

مکتب انبیاء کے نقطہ نظر سے یہ دُنیا انسان کے لیے ایک ایسے تعلیمی ادارے کی مانند ہے جس میں نوجوان طالب علم تعلیم حاصل کرتے ہیں۔لیکن چونکہ علم اور معلم کے بارے میں نوجواں کا نظریہ مختلف ہوتا ہے اسی لیے مدرسہ اور حصولِ علم کے بارے میں بھی اُن کا نقطہ نظر مختلف ہوگا۔

کچھ طلبا تو ایسے ہیں جو اپنے مستقبل کو اچھی طرح سمجھتے ہیں،مستقبل کی ذمہ داریوں سے اچھی طرح آگاہ ہیں اور اُنہیں معلوم ہے کہ کچھ عرصہ بعد وہ معاشرہ میں داخل ہو کر اہم ذمہ درایوں کا بوجھ اُٹھائیں گے۔اپنی زندگی اور معاش کو چلانے کے لیے آبرومندانہ کام شروع کریں گے،اُنہیں اچھی طرح علم ہے کہ آج پُوری لگن سے علم حاصل کریں گے تو کل اس کا صحیح معنوں میں فائدہ اُٹھائیں گے۔اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور جدوجہد کے ساتھ درس پڑھتے اور تاحدِامکان کوشش سے کام لیتے ہیں تاکہ اس طرح سے اپنی اصلاح کر سکیں اور علم ودانش کے ہتھیار سے مسلح ہوں،حصولِ علم کے ذریعہ اپنے فہم وادراک کو جلا بخشیں،اس طرح سے حاصل شدہ لیاقت اور قابلیت کے ذریعہ کل کے معاشرہ میں اپنا نام پیدا کریں۔

---

[1] سورہ ۷۶،آیت ۳

مستقبل کی فکر:

ایسے طلباء اگرچہ ہرروز اپنے تعلیمی ادارہ میں آتے اور جاتے رہتے ہیں مگر وہ اپنے روزمرہ کے اس معمول کو نہ توفضول سمجھتے ہیں اور نہ ہی آنے جانے کو بیکار تصوّر کرتے ہیں بلکہ اُن کی نگاہوں میں اُن کی روازنہ کی یہ آمدورفت نت نئے مرحلے کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ کیونکہ جب وہ درستگار میں جاتے ہیں تو ہرروز ایک نیا سبق پڑھ کر آتے ہیں، اُنہیں ایک نیا مطلب مل جاتا ہے اور ایک دن کی مدت میں وہ علم وکمال کی بے شمار راہوں کو طے کرلیتے ہیں۔

غفلت اور لا پرواہی:

اس کے برعکس کچھ نوجوان ایسے ہوتے ہیں جو طالب علم کے نام سے اسی تعلیمی ادارے میں روزانہ آتے جاتے ہیں۔لیکن اپنی تعلیمی ذمہ داریوں کو نہیں سمجھتے، سبق نہیں پڑھتے، اُستاد کی پرواہ نہیں کرتے، اپنی تعلیم کی طرف توجہّ نہیں دیتے، ایسے لوگ اپنی کل سے غافل اور مستقبل کی ذمہ داریوں سے بے پروہ ہیں، اُنہیں فکر فردا نہیں ہے، اسی لیے وہ کل کی فکر سے بے نیاز اور اپنی درسگاہ سے کل کے لیے کچھ بھی حاصل نہیں کرپاتے ، وہ اپنے آپ سے کہتے ہیں کہ یہ ہرروز کا آنا جانا کیسا؟ کیوں روزانہ سکول جاتے اور واپس آجاتے ہیں۔اُن کی کوشش ہوتی ہے جتنا جلد مُمکن ہو خود کو اس کام سے چھٹکارا دلائیں اور جلد ہی اس آنے جانے کو ختم کریں۔

احیاءِ انسانیت کے لیے ریاضت ضروری ہے:

مکتب انبیاء کے پیروکاروں کی نگاہ میں یہ دنیا فضیلت اور کمال کے حاصل کرنے کی کلاس ہے۔ وہ مرنے کے بعد زندگی خدا کی سزا وجزا پر ایمان رکھتے ہیں۔اُنہیں معلوم ہے کہ عالم آخرت میں سعادت اور فلاح کے حصول اور خدا کی بے انتہا نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کے لیے دنیا میں خود کو سنوارنا ہوتا ہے۔استعداد اور لیاقت کی مقدار معنوی ترقیوں اور روحانی ارتقاء کے مراحل کو طے کرنا ہوتا ہے۔معارف الٰہی ایمان کی پختگی، اخلاق واعمال کی اصلاح غرض انسانیت کے احیاء کے لیے ریاضتوں کو بروئے کار لانا ہوتا ہے۔اسی لیے سچے مومنین زندگی کی فرصت کو غنیمت سمجھتے ہیں، زندگی کے قیمتی سرمایہ کو صرف صحیح اور سعادت کی رہوں میں خرچ کرتے ہیں۔ اولیائے دین کی ہدایت کے مطابق اس زودگزر دُنیا سے آخرت کی جاوید وپائیدار زندگی کے لیے توشہ حاصل کرتے ہیں جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"خذ من نفسك لنفسك، وتزود من يومك لغدك"

''یعنی تم اپنے آپ سے خود اپنے ہی لیے فائدہ اُٹھاؤ، اور اپنے سے اپنے کل کے لیے زادراہ مہیا کرو'' [1]

شاعر کہتا ہے:

صاحبا عمر عزیز است غنیمت دانش

گوی خیر کہ توانی ببراز مہدانش

ہر کہ دانہ نفشاند بہ زمستان درخاک

ناامید بود از دخل بہ تابستانش

''یعنی اے دوستو! یہ عمر نہایت عزیز ہے، اسے غنیمت سمجھو، اس اچھائی کے میدان میں گوئے سبقت لے جاؤ۔ جو شخص سردیوں کے موسم میں بیج نہیں بوتا۔ وہ موسم گرما میں محصول سے مایوسی اور نااُمید ہوتا ہے۔''

فرض شناس لوگ:

اس قسم کے باخبر لوگوں کی مثال ان نوجوان طلبہ کی سی ہے جو اچھی طرح اپنا سبق یاد کرتے ہیں اور اُستاد کی باتوں کو پلے باندھتے ہیں، کیونکہ وہ وہ اپنے مستقبل کو اچھی طرح پہنچانتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر اُنہوں نے تعلیمی عرصہ کے دورانِ کچھ حاصل نہیں کیا تو آئندہ ان کی رسوائی ہوگی۔ کل کے معاشرے میں وہ تعلیم یافتہ اور لائق افراد کی طرح باعزت اور قابلِ فخر زندگی ہی نہیں بسر کر سکیں گے بلکہ ہمیشہ روحانی شکنجوں میں بھی جکڑے رہیں گے، اپنے ماضی پر افسوس کرتے رہیں گے، محرومی اور بدنصیبی کی آگ میں ہمیشہ جلتے رہیں گے اور زندگی بھر لوگوں کی حقارت و بے پرواہی کا نشانہ بنے رہیں گے۔

بامقصد زندگی:

اسلامی نقطہ نظر سے اگر انسان کی زندگی اطاعتِ الٰہی کی راہ مدارج کمال کے حصول اور صفات انسانی سے موصوف ہونے میں خرچ ہو اور رضائے الٰہی کے حُصول میں کام آئے تو وہ زندگی فضول اور بیکار نہیں ہے اور نہ ہی عبث اور بے فائدہ ہے بلکہ وہ بامقصد زندگی اور بابرکت عمر اور رُشد وسعادت کا سرمایہ بھی ہے۔ ایسی زندگی جس قدر لمبی ہو انسان کو مزید ارتقاء وتکامل کی راہوں پر گامزن رکھتی ہے۔ جو زندگی فضول اور نقصان دہ ہے اور جو عمر قابل مذمت اور بے ثمر ہے ایسی زندگی کا نہ

---

[1] غررالحکم ص ۳۹۴

ہونااس کے ہونے سے کئی درجہ بہتر ہے۔

بے مقصدزندگی:

جوزندگی باطل اور گناہ کی راہوں میں صرف ہواور اس کا مقصد صرف شہوت پرستی، شیطانی منصوبوں پر عملدارآمداوراخلاقی بے راہروی ہوتو ایسی عمرتباہی وبربادی کا سبب ہوتی ہے۔اپنے حامل کوڈُنیا میں سقوط وتباہی کی طرف لے جاتی ہےاورآخرت میں خدائی عذاب میں گرفتارکرادیتی ہے۔حضرت امام زین العابدین علیہ السلام اپنی ایک دعا کے ضمن میں اس مطلب کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

"وعمرنی ماکان عمری بذلۃ فی طاعتك فاذاکان عمری مرتعاً للشیطان فاقبض الیك قبل ان یسبق مقتك الی اویستحکم عضبك علی۔"

یعنی بارالٰہا! مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک میری عمر تیری اطاعت کی راہ میں خرچ ہوتی رہے، لیکن جب میری یہ عمر شیطان کی چراگاہ بننے لگےتو میری روح کوقبض کرلے،قبل اس کے کہ تیری ناراضگی میری طرف رخ کرے یا تیراغضب مجھ پرحاوی ہوجائے۔"[1]

روحانی شکنجہ اورخودکُشی:

مادی لوگ جو عالم آخرت کے منکر ہیں،آخرت کےثواب عذاب پرایمان نہیں رکھتے اورموت کواپنی تباہی سمجھتے ہیں، وہ خدا پرستوں کی نسبت فضول اور بیکارزندگی کی سوچ کے زیادہ مریض ہیں۔اُن کاضمیر عام طور پرغیرمطمئن اور بے آرام ہوتاہے۔اُن کی عمر کاایک حصہ غم وغصّہ میں گزرجاتا ہے۔وہ اپنی اس بےمقصدزندگی اورتھکاوٹ دینے والےروزشب سے رنج وغم کااحساس کرتے ہیں اوران میں سےبعض تو آخرکارتھک ہارکرخودکُشی پراُترآتے ہیں تاکہ کسی طرح اس کوفت سےنجات پاجائیں اورروحانی شکنجوں اور باطنی دباؤ سے چھٹکاراحاصل کرلیں اوررنجیدہ دردناک زندگی سے آسودہ خاطر ہوجائیں۔

غلط سوچ:

ایسے افرادان نوجوان طالب علموں کی مانندہیں جوتحصیل علم کے نام پرتوتعلیمی اداروں میں آیاجایاکرتے ہیں لیکن

[1] صحیفہ سجادیہ دعانمبر۲۰ (مکارم الاخلاق)

سبق نہیں پڑھتے کیونکہ وہ اپنے مستقبل سے غافل ہیں زندگی کا مذاق سمجھتے ہیں اور مستقبل کے لیے معاشرے میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں کرتے، اسی لیے درسگاہ میں روز کا آنا جانا اُن کی نگاہوں میں فضول اور بے مقصد ہوتا ہے۔ وہ اس بات کی انتظار میں رہتے ہیں کہ زلزلہ طوفان یا جنگ درپیش آجائے یا کوئی اور حادثہ رُونما ہو جائے تا کہ کسی نہ کسی طرح درسگاہ ویران اور جماعت میں تعطل پیدا ہو جائے اور اس طرح سے اُن کی اس فضول آمدورفت سے جان چھوٹ جائے۔

خلاصہ کلام نفسیاتی طور پر آخرت کے انکار اور مرنے کے بعد کی زندگی کی نفی کا اس دنیاوی زندگی فضول اور بیکار سمجھنے کے ساتھ ایک بنیادی اور گہرا رابطہ ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں اُس نکتہ پر توجہ دی گئی ہے اور خداعالم نے ان دونوں کے باہمی رابطے کو استفہام انکاری کی صورت میں ذکر فرمایا ہے کہ:

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰکُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّکُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۱۱۵﴾ (المومنون)

''یعنی تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں فضول اور بیکار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے؟'' [۱]

آخرت کی سعادت کا معیار:

جوشخص مرنے کے بعد زندگی کا یقین رکھتا ہے اور آخرت کی سعادت اور شقاوت کو اسی دُنیا میں صحیح اور غلط زندگی کا پیش خیمہ جانتا ہے دنیاوی زندگی کو قطعاً بیکار اور فضول نہیں سمجھتا، اپنے آپ کو خودسر اور غیر ذمہ دار نہیں جانتا، وہ دُنیا کو بھی حصول تعلیم اور تشکیل سیرت اور تعمیر کردار کی کلاس سمجھتا ہے۔ اور صمیم قلب سے ارادہ کرتا ہے کہ اس کلاس میں معارف الٰہیہ کا درس حاصل کرے۔ مکارم اخلاق اور انسانی صفات سے متصف ہونے کے لیے ریاضت کرے، اپنے آپ کو صحیح معنوں میں انسان بنائے تا کہ خدا کی وسیع رحمت میں شامل ہو جائے۔

خدا دیکھ رہا ہے:

اس قسم کا مومن انسان یہ بات یقین کے ساتھ سمجھتا ہے کہ اس کی تمام حرکات وسکنات کو ہمیشہ اور ہر حالت میں خدا غور سے ملاحظہ فرما رہا ہے اور دینی تعلیمات کے پیش نظر اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی آزادی اور توانائی سے غلط اور ناجائز فائدہ اٹھائے یا حدوداللہ سے آگے تھوڑا سا قدم بھی بڑھائے، کیونکہ کل بروز حساب اس کی توانائیوں اور ذخائر کے بارے میں پُوچھا جائے گا جو اس دُنیا میں اس کے اعتبار میں ہیں۔ اور ہر ایک چیز کے بارے میں اُس کی اپنی مناسبت سے

---

[۱] سورہ ۲۳ آیت ۱۱۵

سوال کیا جائے گا اور اس کی سزا ملے گی، چنانچہ سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"لاتزول قدما تعبد یوم القیامة حتی یسئل عن اربع: عن عمره فیما افناه وعن شبابه فیما ابلاه وعن علمه کیف عمل به. وعن ماله من امن اکتسبه وفیما انفقه"

''یعنی بروز قیامت کسی بندے کے قدم اس وقت تک نہیں اُٹھیں گے۔ جب تک اس سے چار چیزوں کے بارے میں سوال نہ ہو جائے۔ اس کی عمر کے متعلق کہ اُسے کہاں برباد کیا؟ اس کی جوانی کے بارے میں کہ اُسے کہاں ضائع کیا؟ اس کے اعمال کے بارے میں کہ کس طرح انجام دیے؟ اس کے مال کے بارے میں کہ کہاں سے حاصل کیا اور کہاں پر خرچ کیا؟''[1]

زندگی کا مقصد ظاہر ہوگیا:

تو گویا اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

۱۔ آخرت پر ایمان اور خدا کے ثواب وعذاب پر یقین کا انسان کی دنیاوی زندگی میں سب سے پہلا فائدہ اور اس کا ثمر اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی کا مقصد واضح ہو جاتا ہے، انسان پوری آگاہی کے ساتھ خودسازی کرتا ہے، اپنے عقائد اور اخلاق کی اصلاح کرتا ہے، زندگی کے فضول اور بے فائدہ ہونے کے وسوسے سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے اور اس کی نگاہوں میں دنیاوی زندگی ایک بامقصد زندگی ہوتی ہے۔

غرائز پر قابو:

۲۔ فطری غریزے اور خواہشات اللہ تعالیٰ کی امانت اور انسانی زندگی کا اصل سرمایہ ہوتے ہیں، غرائز ایسا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں جو خدا کی حکمت آمیز قضا کے تحت انسان کی فطرت میں داخل کر دیے گئے ہیں اور انسان کو اس کی زندگی کے مظاہر میں متحرک اور فعال بناتے ہیں۔ یہ غرائز از خود اندھے اور بے شعور ہوتے ہیں، نہ تو اچھائی اور برائی کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی خیر اور شر کو دیکھتے ہیں۔ لہٰذا اُنہیں کنٹرول کرنے اور متوازن رکھنے کے لیے عقل اور دین کی ضرورت ہوتی ہے جن کے ذریعہ وہ صحیح اور مفید راستے پر چلائے جاسکتے ہیں۔

یہ غرائز کم وبیش حیوانات میں بھی ہوتے ہیں، لیکن ان میں فرق یہ ہوتا ہے کہ حیوانات، فطری ہدایت کی بُنیاد پر

---

[1] مشکوۃ الانوار ص ۱۷۱

غرائز کواستعمال کرنے کی حدود کو جانتے ہیں اور انہیں نظام آفرینش کے مطابق جس میں فروعی اور نوعی مصلحت پائی جاتی ہے، لہٰذا وہ تکوینی منصوبے سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ لیکن چونکہ انسان آزاد پیدا کیا گیا ہے اور اپنی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تندروی پر بھی قادر ہے اور مصلحتوں کی حدود سے بھی تجاوز کر جاتا ہے، دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ اور خود پرستی اور ذاتی خواہشات کی وجہ سے کئی دوسرے جرائم کا ارتکاب بھی کرتا ہے۔

غرائز کی سرکشی اور خودفراموشی:

ہیں ایسے بہت سے لوگ جو غرائز بھڑک اُٹھنے کے وقت اپنی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے، جنسی خواہشات کو پورا کرنے دشمن سے انتقام لینے، مال و دولت کے جمع کرنے اور اپنی اس قسم کی دوسری خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بڑی حد تک اپنے آپ کو کھو دیتے ہیں، اندھے اور بہرے ہو جاتے ہیں، انسانیت اور انسانی صفات کو فراموش کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے خطرناک اور مہیب جرائم کے مرتکب ہو جاتے ہیں جو اُن کی اپنی اور دوسروں کو تباہی و بربادی اور فنا و زوال کا سبب بن جاتے ہیں۔

اجتماعی خواہشات اور ارتقاء:

''انسانی خواہشات یا انفرادی ہوتی ہیں یا اجتماعی! مثلاً انسان دوستی، وطن پرستی، عقد و ازدواج اور رشتہ داروں سے محبت، تو ان کا شمار اجتماعی خواہشات میں ہوتا ہے اور یہ جرائم کے ارتکاب سے روکتی ہیں، کیونکہ اس قسم کی آرزوئیں انسان کو مستقبل کے ساتھ محبت کا درس دیتی ہیں۔ لیکن جب مستقبل، ماحول و معاشرے اور معاشرہ کے افراد سے نفرت پیدا ہو جائے تو یہ نفرت انسان کو جرائم پر آمادہ کر دیتی ہے......)

ہمارا جسمانی اور نفسانی وجود ہوتا ہے۔ اجتماعی خواہشات ہمیں اجتماعی کاموں کی طرف لے جاتی ہیں جو کہ اجتماع (معاشرہ) کی بقا اور ارتقا کا سبب ہوتی ہیں۔ لیکن ذاتی اغراض، معاشرتی ضروریات کو مدنظر نہیں رکھتی، بلکہ ہر موقع محل پر انسان کی اپنی شخصیت، اپنا وجود اور اپنے ''من'' کے مفادات پیش نظر رہتے ہیں جو اس کی فعالیت کا اصل محور ہوتی ہیں جو اس بات کا سبب بن جاتے ہیں کہ وہ ہر کام میں اپنی ذات ہی کو مدنظر رکھے اور اپنے فرائض کو پسِ پشت ڈال دے۔ ایسی صورت میں انسان سے مختلف عنوان کے تحت جرائم سرزد ہوتے ہیں، جیسے تکبر، خوشامد، چاپلوسی اور مبالغہ آرائی کی توقع، سعادت اور کامیابی کی تلاش اور زراندوزی وغیرہ۔ لیکن جو امر مسلم ہے وہ یہ کہ مندرجہ بالا تمام اُمور جب ذات اور خودخواہی کی وجہ سے عمل میں آتے ہیں اور یہی خود پرستی انسان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ دوسروں کو قربانی کا بکرا بنائے۔ خلاصہ کلام

مجرم ایک خود پرست شخص ہوتا ہے۔''[۱]

خود پرستی اور جرائم:

''جرمن جب اپنے شوہر سے جدا ہوئی تو اُس کے بہت سے چاہنے والے تھے، لیکن چونکہ ایک بچی کی ماں تھی، لہٰذا کوئی شخص اس سے شادی کرنے پر تیار نہ تھا۔ اس کی ماہانہ آمدنی ایک سو بیس فرانک تھے جن میں سے ایک سو فرانک اسے بچوں کی نگہداشت کے سنٹر میں ادا کرنا پڑتے تھے، اور ان آخری دنوں میں وہ یہ رقم صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتی تھی، لہٰذا اسے اس سنٹر سے بھی جواب مل گیا تھا۔ وہ بچی چار سال کی تھی، جرمن نہیں چاہتی تھی کہ اس کا کوئی چاہنے والا اس بچی کو دیکھ لے، اس کی زیادہ تر یہ ہی کوشش رہی کہ اس بچی کو یتیم خانہ میں داخل کرائے۔ لیکن چونکہ بچی کو کالی کھانسی کی شکایت تھی لہٰذا اُسے وہاں پر داخلہ نہ مل سکا۔ اُس نے سوچا کہ اُسے ہسپتال میں داخل کرا دے، لیکن دن کا وقت تھا لہٰذا انجان راستے سے باہر گئی تا کہ کوئی اُسے دیکھنے نہ پائے۔ جب وہ کھیتوں کے قریب سے گزر رہی تھی تو اُسے یاد آیا کہ یہیں کہیں دلدل ہے۔ بچی نے تھوڑی سی آنکھیں کھولیں۔ ایک نظر ماں پر ڈالی ہی تھی کہ جرمن نے اُسے ہاتھوں پر بلند کر کے اس دلدل میں پھینک دیا اور خود چلتی بنی اور مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ (میں نے بچی کے پانی پر گرنے کی آواز سنی) آدھے گھنٹے بعد میں بھی اس کے ایک عاشق کے پاس آ گیا۔''[۲]

بے راہروی اور تباہی کے اسباب:

غرائز اور شہوات کی مادر پدر آزادی، معنوی سربلندی، اجتماعی زندگی، انسانی تمدن غرضیکہ انسان کی شائستہ زندگی کے شایانِ شان نہیں ہے، کیونکہ اس سے معاشرے کے نظم و نسق میں خلل پڑ جاتا ہے، بدامنی اور گڑبڑ پیدا ہوتی ہے، معاشرے میں بے راہروی اور فساد و تباہی پیدا ہوتی ہے۔ انسانیت سرکوب اور انسان پستی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مادی و الٰہی مکاتب کے پیشِ نظر دینی اور سیاسی راہنما بلکہ تمام انسانی معاشرے اس بار پر متفق القول ہیں کہ اجتماعی زندگی اور انسانی تمدن کے تقاضوں کے پیشِ نظر لوگوں پر کچھ قوانین حکم فرما ہونے چاہیں تا کہ آزادی کا توازن برقرار رہے اور خواہشات نفسانی کی تکمیل کے لیے حدود متعین ہو جائیں۔ یہ ضرورت تمدن کے تمام زمانوں میں محسوس ہوتی رہی ہے۔ اسی لیے گزشتہ زمانے سے لے کر آج تک مسلسل کچھ معیار اور اقدار یا تو مقررہ قوانین کی صورت میں یا

---

[۱] چہ می دانم ص ۱۷

[۲] جنایت ص ۵۵

آداب ورسوم کے انداز میں انسانی معاشروں میں رائج چلی آ رہی ہیں جن کے پرتو میں مختلف انسانی معاشروں میں نسبتاً نظم وضبط و برقرار چلا آ رہا ہے۔

معاشرے کی بہت بڑی مشکل:

اس بارے میں جو سب سے بڑی اور اہم مشکل درپیش ہے وہ ان مقررہ قوانین کا نفاذ ہے کہ کس قدرت کے ساتھ لوگوں کی خواہشات پر ان قوانین کو نافذ کیا جائے اور صحیح معنوں میں اُن کا اجرا کیا جائے؟ وہ کون سے عوامل ہیں جو سرکش خواہشات وغرائز کو مہار کر سکتے ہیں؟ خواہشات نفسانی کو کنٹرول کریں اور لوگوں کو ان قوانین کا پابند بنائیں؟ دوسرے لفظوں میں کس ممکن طریقے سے لوگوں کے ضمیر میں اس کی ذمہ داری کی حس کو بیدار کیا جائے، اُنہیں فرض شناسی کی راہ پر چلایا جائے اور قانون کا احترام ان کے دل میں ایجاد کیا جائے؟

نفاذِ قوانین کے وسائل:

البتہ کچھ اُمور ہیں جو کم وبیش تمام انسانی معاشروں میں پائے جاتے ہیں جو کسی حد تک غرائز کو اپنی حد پر رکھنے اور قوانین وقواعد کا احترام کرنے میں موثر ہوتے ہیں، جیسے بچپن کے دوران مین تربیت، اخلاقی اقدار کی پرورش، اجتماعی ماحول کی شائستگی، قومی نظارت اور عمومی شرم وحیا، لیکن یہ عوامل ہمیشہ اور ہر جگہ، خلوت وجلوت میں بنیادی طور پر موثر ثابت نہیں ہو سکتے اور لوگوں کو گناہ کے ارتکاب اور قانون شکنی سے باز نہیں رکھ سکتے۔ خاص کر جبکہ غرائز اپنی طغیانی پر ہوں اور مزاج میں تلاطم برپا کر کے انسان کو اندھا اور بہرہ کر دیں، تو ایسے موقعوں پر ایک زبردست عامل کی ضرورت ہے جو غرائز کو مہار کر سکیں اور انسان کو ناجائز اور خلافِ قانون کاموں سے باز رکھیں۔

مجرمین کو سزا:

آج کے ترقی یافتہ ملکوں میں قانون کے نفاذ اور امن وامان کے برقرار رکھنے کا بہترین طریقہ مجرم کو سزا دینا ہے، ان ملکوں میں مختلف جرائم کے ارتکاب پر سزا دینے کے لیے قانون مقرر ہیں اور مجرم کو قوانین مقررہ کے تحت سزا دی جاتی ہے۔ عدالتی محکمے جرم وسزا کی فائلوں کا مطالعہ کرتے، مقدمات کو نمٹاتے اور مجرمین کو مقررہ قانون کے مطابق سزا دیتے ہیں اور انتظامی محکمے پر فرض عائد ہے کہ ان سزاؤں پر عملدرآمد کرائیں۔

انتظامی اداروں کے ملازمین جو اس بارے میں کام کرتے ہیں عام طور پر جدید ترین فنی وسائل سے لیس ہوتے ہیں اور تمام ضروری اختیارات ان کے پاس ہوتے ہیں حکومت اپنی آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے اس وسیع پروگرام پر عملدرآمد

کے لیے بہت بڑا بجٹ اور افرادی قوت مہیا کرتی ہے البتہ ان ملازمین کی شبانہ روز دیکھ بھال اور سخت نگرانی کی وجہ سے جرائم میں بڑی حد تک کمی واقع ہوئی ہے اور کسی حد تک امن وامان بھی بحال ہے لیکن مجرم ذہنیت ہر روز نت نئے نیرنگ کے ساتھ جرم کا ارتکاب کرتی رہتی اور انتظامی اہلکاروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر حیرت انگیز اور وحشت ناک جرائم کی مرتکب ہوتی ہے۔

ترقی یافتہ ممالک اور ہولناک جرائم:

انگلستان میں ایک شوہر اور بیوی نے مل کر ایک چھوٹی سی معصوم بچی کو شکنجے دے دے کر مار ڈالا اس کی مرتے وقت کی چیخوں کو ٹیپ پر ریکارڈ کرلیا۔ پیرس میں پارکنگ کے حصول کے لیے ایک ڈرائیور نے دوسرے ڈرائیور کو قتل کر ڈالا۔ اٹلی میں بنکوں پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے ایک نوجوان بہن اور بھائیوں نے مل کر ایک پارٹی بنالی، جرمنی میں ایک جنبی شخص نے چند نوجوان لڑکیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کر دیا۔ گوئٹے مالا میں سفارتی افسر کو اغوا کرلیا گیا چونکہ رہائی کے لیے اس کا تاوان دینے کے لیے کوئی شخص تیار نہیں تھا لہٰذا اُسے قتل کر دیا گیا۔ برازیل میں فوج فٹ بال کے ایک کھلاڑی کی حفاظت کرتی رہی تاکہ کوئی اُسے اغوا نہ کرلے۔ امریکہ میں بہت سی ایسی عورتیں ہیں جو کار میں سوار ہونے کے بعد اور انجن کے سٹارٹ کرنے سے پہلے کار کے تمام دروازے مقفل کر لیتی ہیں۔ بہت سے صنعتی ممالک میں جب ایک عورت خرید وفروخت کے بعد مارکیٹ سے باہر آتی ہے تو بعید نہیں کہ اُس نے کوئی چیز چرا کر کپڑوں میں چھپائی ہوئی ہو۔ ہالی وڈ میں ہپیوں کی ایک جماعت نے کسی وجہ کے بغیر ایک ہی خاندان کے کئی افراد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ یہ سب کچھ اس بات کی دلیل ہے کہ جرائم کی نئی ٹیکنیک اور تمدن کی وجہ سے پیدا ہونے والے نفسیاتی خلل نے آپس میں ہم آہنگی پیدا کرلی ہے۔ تمام تاریخ میں اس قسم کے تمام جرائم، دہشت گردی، غیظ وغضب، بغیر کسی وجہ کے قتل وغارت اور جنسی انحراف وتجاوز ہرگز نہیں دیکھے گئے'' [۱]

بے ایمانی اور جرائم:

آج کے صنعتی ملکوں میں بڑھتے ہوئے یہ جرائم متعدد عوامل کی پیداوار ہیں جن میں سے اہم ترین عامل خدا کی ذات پر ایمان کا فقدان اور بارگاہ الٰہی میں پیش ہونے کے لیے احساسِ ذمہ داری کا نہ ہونا ہے۔ ان ملکوں کے اکثر وبیشتر لوگ انسان کی صرف مادی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور اس کے معنوی پہلو سے مکمل طور پر غافل اور بے خبر ہیں۔

---

[۱] روزنامہ اطاعات شمارہ ۱۲۱۱۱

سربراہانِ حکومت کی معنویات کے فروغ میں ناتوانی:

اس قسم کا ناقص نکتہ نظر جو ایک وبا کی صورت اختیار کر چکا ہے اور تقریباً تمام قومیں اس میں مبتلا ہو چکی ہیں اور حقیقت پسندی سے اس قدر دُور رکھا ہوا ہے کہ بعض ملکوں کے سربراہ اعلیٰ حکام خدا پرست اور مذہبی ہونے کے باوجود بھی معنویات کو فروغ دینے کے لیے ذرہ بھر تحریک نہیں کرتے اور نہ ہی دینی تعلیمات کی حمایت اور ایمانی توانائیوں کی تقویت کے طور پر لوگوں کے دلوں میں فرض شناسی کا جذبہ پیدا کر کے اُنہیں معنویات پر عمل پیرا ہونے اور صحیح راستہ اپنانے کی تلقین کرتے ہیں۔ بنابریں وہ مجبور ہیں کہ اپنی تمام تر توجہ مادی وسائل اور فوجی اور انتظامی امور پر مبذول کریں، اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے اسلحہ کی دوڑ میں فوجی انتظامی امور پر مبذول کریں، اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لئے اسلحہ کی دوڑ اور فوجی طاقتوں کی تقویت سے استفادہ کریں۔ اندرون ملک امن وامان کو بحال رکھنے کے لیے وضع کردہ ملکی قوانین اور پولیس فورس کا سہارا لیں۔ فطری معرفت کے احیاء اخلاقی وجدان سے استفادہ، انسانی شرافت کی بیداری، مکارمِ اخلاق اور ذاتی شرافت کو فروغ دینے کی بات تک نہیں کرتے۔

فراموش شدہ انسانیت:

گویا آج کی دُنیا انسان کے معنوی رجحانات اور روحانی پہلو سے اس قدر غافل ہو چکی ہے کہ بہت سے لوگ انسان ہونے اور انسان بن کر جینے کو فراموش کر چکے ہیں اور انسانوں کی سعادت اور فلاح کے بارے میں اخلاق حمیدہ اور انسانی صفات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔

فرانس کے سابق وزیر دفاع زول موک اقوام متحدہ کی پچیسویں سالگرہ اور تباہی کے وسائل کی نابودی کے سلسلے میں کہتے ہیں اب بھی صلح کی ضمانت وحشت کے تقابل ہی میں مضمر ہے۔ اقوام متحدہ کا ۲۵ سالہ دور دو اہم امور سے عبارت ہے ایک تو فنی پیش رفت کی تیزی خاص کر انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کی تباہی کے سلسلے میں دوسرے مذاکرات کی سستی جو صلح کے لیے انجام پاتے ہیں خاص کر ہتھیاروں کی دوڑ کو روکنے کے لیے۔ تو اس طرح سے معنویت سے خالی دُنیا ظاہر ہو چکی ہے۔ کہ جس میں حکومتوں کا دیوالیہ نکل چکا ہے۔ یا پھر صلح پر مبنی کوششوں کو قربان کر دیتی ہیں تاکہ اس طرح سے وحشت ناک اسلحہ کو حاصل کر سکیں۔"[1]

---

[1] روما کہیان شمارہ ۷۷ ۸۱

انبیاء کرام اور مکارمِ اخلاق:

انبیاء اکرام علیہم السلام خدا کی طرف سے مامور تھے کہ لوگوں کو باطنی اصلاح کریں۔اُن کے ضمیر کو باطل عقائد ،شیطانی افکار اور ناپسندیدہ اخلاق سے پاک کریں۔ان کے دلوں میں ایمان کی تخم ریزی کریں۔انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیں جو خدا کی تعلیمات کا مجموعہ ہے،مکارم اخلاق اور پسندیدہ صفات سے انہیں متصف کریں اور اُنہیں صحیح معنوں میں انسان بنائیں۔

جس معاشرہ میں لوگ ایمان دار ہوتے ہیں اور صحیح معنوں میں مکتب انبیاء کی پیروی کرتے ہیں وہاں پر قوانین کے نفاذ کا بہترین ذریعہ خدا کی ذات پر ایمان اور خدا کے حضور ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ایسے معاشرے میں لوگ متدین ہونے کی بناء پر فرض شناس اور نیکوکار پروان چڑھتے ہیں۔ایمان اور باطنی عقیدہ کی وجہ سے دوسروں کے حقوق اور حُدود کا احترام کرتے ہیں۔کسی قسم کے جرم کے ارتکاب کا تصور نہیں کرتے اور گناہ وآلودگی کے پاس سے نہیں پھٹکتے۔

ایمان اور اجتماعی امن وامان کی صورتِ حال:

ایسے معاشرے میں امن وامان کی ضامن،باطنی پولیس یعنی لوگوں کا خدا کی ذات پر ایمان ہوتا ہے اور گمراہ اور بے ایمان لوگوں کو سزا دینے جیسے معدودے چند مقامات کے علاوہ کہیں بھی ظاہری پولیس کے پہرے،سزاؤں کے قوانین اور مجرم کو سزا دینے کے قوانین اور مجرم کو سزا دینے کے قانون سے استفادے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

حق متکی بقوہ ایمان است
آنجا کہ ہیچ قوہ، مقاوم نیست
الہام بخش حضرت یزدان است
ملہم بوحی شیطان ملہم نیست
ہر جا کہ پلیس باطن ایمان است
آنجا پلیس ظاہر لازم نیست

''یعنی حق کا ایمانی طاقت پر ہی انحصار ہوتا،جہاں پر اور کوئی طاقت ہی کام نہیں دے سکتی۔حق تعالیٰ کی طرف سے اُسے الہام ہوتا ہے۔شیطانی وحی کا اس پر الہام نہیں ہوتا۔جہاں پر ایمان کی باطنی پولیس ہو

وہاں پر ظاہری پولیس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

خدا پر ایمان سے مراد:

مکتب انبیاء میں دو بنیادی اُصول موجود ہیں جن کی تمام عمارت خدائی تعلیمات اور دینی پروگراموں پر استوار ہے۔ ایک تو خدا پر ایمان اور دوسرے عالمِ آخرت پر ایمان۔ مکتب انبیاء میں خدا پر ایمان سے یہ مراد نہیں ہے کہ ایک علمی نظریہ کی صورت میں اس پر ایمان لے آئیں جب کہ فلاسفہ الٰہی کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ اسے صرف کائنات کا دانا اور صاحبِ ارادہ خالق سمجھ کر خدا پرستوں کے گروہ سے ملحق ہو جائیں اور مادی فلسفہ کی تھیوری کو باطل اور نا قابل قبول مان لیں، بلکہ اس ایمان سے مراد ایسے خدا کو ماننا ہے جو انسانوں اور جہانوں کا حقیقی مالک اور تنہا لائق عبادت ہے۔ جو سمیع اور بصیر ہے، لوگوں کی باتوں کو سنتا اور ان کے افعال دیکھتا ہے، جو کچھ ان پر گزرتی ہے اس سے واقف اور آگاہ ہے تمام لوگوں پر مکمل احاطہ رکھتا ہے ہر لمحے ان کی حرکات وسکنات کو زیر نظر رکھے ہوئے ہے اور تمام ظاہری اور باطنی حقیقتوں سے اچھی طرح واقف ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ لَبِالۡمِرۡصَادِ ﴿۱۴﴾ (الفجر)

یعنی اے معظم رسولؐ! آپ کا پروردگار ہر وقت تاڑ میں ہے اور تمام رفتار و گفتار کو دیکھ رہا ہے'[۱] '

یَعۡلَمُ خَآئِنَةَ الۡاَعۡيُنِ وَمَا تُخۡفِي الصُّدُوۡرُ ﴿۱۹﴾ (المومن)

''یعنی خداوند عالم لوگوں کی آنکھوں کی خیانت اور اسی طرح ان کی دلوں میں چھپی ہوئی باتوں کی خبر رکھتا ہے۔'[۲] '

آخرت پر ایمان سے مراد:

مکتب انبیاء میں عالم آخرت پر ایمان سے یہ مراد نہیں کہ ہم صرف مرنے کے بعد روح کی بقا کا اقرار کر لیں اور مادی فلاسفہ کے نظریہ کی نفی کریں جو کہ رُوح مجرد کا انکار کرتے ہیں، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن کا اقرار کریں اور خدا ثواب اور عذاب پر ایمان لے آئیں۔ اس بات کو تسلیم کریں کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ خدا کے حکم کے تحت تمام لوگ دوبارہ زندہ ہوں گے اور خدا کی عدالت میں پیش ہوں گے۔ اس بات پر ایمان لائیں کہ ہر شخص کا نامہ اعمال اس کے سامنے لایا جائے گا اور وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ اُس نے اپنی دنیاوی زندگی میں جو جائز و ناجائز چھوٹے اور بڑے کام

---

[۱] سُورہ ۸۹ آیہ ۱۴

[۲] سُورہ ۴۰ آیہ ۱۹

انجام دیے ہیں اس میں درج ہوں گے۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿٤٩﴾ (الکهف)

یعنی ہر شخص کا نامہ اعمال اس کے سامنے لایا جائے گا تو اس وقت گنہگاروں کو دیکھو گے وہ اس کے مضامین سے سخت ڈر رہے ہوں گے اور سہمے ہوئے کہیں گے، ہائے افسوس ہم پر، یہ کیسی کتاب ہے کہ جس میں کچھ بھی نہیں چھوڑا گیا، اس میں سب چھوٹے بڑے اعمال درج ہیں، گناہگار لوگ قیامت میں اپنے تمام اعمال کو موجود پائیں گے اور تمہارا پروردگار کسی ایک پر ظلم نہیں کرتا۔[1]

گناہگار اور نامہ اعمال:

خلاصہ کلام، آخرت پر ایمان سے مراد، روزِ حساب کو ماننا ہے جس دن کہ حکم خدا کے تحت لوگوں کے اعمال تولنے کے تمام ذرائع مہیّا ہوں گے۔ ان کے تمام چھوٹے بڑے اعمال کی اچھی طرح چھان بین ہوگی اور ہر شخص کو اس کے کیے کی سزا یا جزا ملے گی اس دن لوگوں کے درمیان فیصلہ کی تمام طاقت خداوند عالم کے ہاتھ ہی میں ہوگی، وہی لوگوں کے درمیان حق وانصاف پر مبنی فیصلہ کرے گا۔ اس کی مقدس بارگاہ میں ظلم وجور کا نام ونشان تک نہیں ہے۔

عدل وانصاف پر مبنی فیصلہ:

ارشادِ خداوندی ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ

''ہم بروزِ قیامت عدالت کا ترازو نصب کریں گے اور اس دن کے محاسبہ میں کسی ایک پر بھی ذرہّ برابر ستم نہیں ہوگا۔[2]

---

[1] سُورہ ۲۱ آیت ۴۷

[2] سورہ ۲۱ آیت ۴۷

فرض شناس لوگ:

اسلام کے حقیقی پیروکار جو روزِ جزا پر ایمان رکھتے ہیں وہ دینی تعلیمات کے تحت خود کو بارگاہ رب العزت میں جوابدہ سمجھتے ہیں۔

ہمیشہ اپنے اعمال پر نگاہ رکھتے ہیں خدائی فرائض پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور اس کی حرام کردہ چیزوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ اُن کا دامن گناہوں اور ناشائستہ کاموں سے ملوّث نہ ہو، کیونکہ اُنہیں یقین ہوتا ہے کہ اس دُنیا میں جو بھی ناروا کام انجام دیں گے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ان کے نامہ اعمال میں درج کیا جائے گا۔ قیامت کے دن اُس کے بارے میں پوچھ گچھ کی جائے گی اور اسی حساب سے اس کی سزا ملے گی۔

یہ صاحبان ایمان وعقیدہ لوگ قوتِ ایمانی کے ساتھ اپنی نفسانی خواہشات پر حکم فرما ہوتے ہیں، اپنے غرائز کو قابو میں رکھتے ہیں، اپنی شہوتوں کی باگ ڈور اپنی عقل کی ہاتھوں میں دے دیتے ہیں۔ اور معنوی اسباب و باطنی عقیدے کی وجہ سے قانون شکنی نہیں کرتے۔ گناہوں کے پاس نہیں پھٹکتے اور دوسروں کے حقوق وحدود پر ڈاکہ نہیں ڈالتے۔

مخلوق کا خالق سے حیا:

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہشام سے فرماتے ہیں۔

"یاھشام رحم اللہ من استحیا من اللہ حق الحیأ فحفظ الراس وما حویٰ والبطن وماوعیٰ وزکرالموت والبلیٰ وعلم ان الجنۃ محفوفۃ بالمکارہ والنار محفوفۃ بالشھوات"

''یعنی اے ہشام خدا رحمت کرے ایسے شخص پر جو خدا سے حیا کرتا ہے جو مخلوق کو اپنے خالق سے کرنا چاہیے۔ اور اسی حیا کی وجہ سے اپنے سر کی تمام اندرونی اور بیرونی باتوں کی حفاظت کرتا ہے۔ ظاہر میں آنکھ، کان اور زبان سے گناہوں کا ارتکاب نہیں کرتا، اور باطن میں شیطانی افکار اور گناہوں کی سوچ سے پرہیز کرتا ہے شکم کی حفاظت کرتا ہے اور اسے حرام کے کھانے پینے سے ملوث نہیں کرتا۔ موت کو یاد رکھتا ہے اور بدن کے گل سڑ جانے کو کبھی نہیں بھلاتا، اچھی طرح جانتا ہے کہ بہشت کے اطراف میں دُکھ درد اور رنج وغم ہیں اور جہنم کے اطراف میں نقصان دہ لذتیں اور پلید خواہشات اور

نامشروع شہوات ہیں۔'' [۱]

تزکیہ نفس اوردائمی سعادت:

یعنی جو شخص بہشت بریں کا طلب گار رہتا ہے اُسے دنیا میں خودسازی کی مشکلات کا سامنا کرنا چاہیے۔تزکیہ نفس کی مشقوں کو برداشت کرنا چاہیےاور خدا کی طرف سے عائد کردہ فرائض کو نبھانا چاہیےاور جسے عذاب جہنم سے بچنا ہے اسے اپنی خواہشات پر قابو پانا چاہیے، ناروا خواہشات سے پرہیز کرنا چاہیےاور غیر شرعی لذتوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔

ظلم سے اجتناب:

حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"والله لان ابیت علی حسك السعدان مسهدا اراجرفی الاغلال مصفد احب الی من ان القی الله ورسوله یوم القیامة ظالما لبعض العباد وغاصبا یشیء من الحطام"

''یعنی خدا کی قسم اگر میں تمام رات سعدان نامی خاردار جھاڑی کے تیز اورنوکیلے کانٹوں پر بیداررہ کر گزروں جب کہ میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھے ادھرادھر بھی گھسیٹتے پھریں میرے نزدیک اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ بروز قیامت اللہ اوررُسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں اس حالت میں پیش ہوں کہ میں نے کچھ لوگوں پر ظلم یا کسی کا حق غصب کیا ہوا ہو۔'' [۲]

نتیجہ یہ نکلا کہ روز جزا پر ایمان اور خدا کے ثواب وعقاب پر عقیدے کا دوسرا اثر غرائز کومہار کرنا، خواہشات کومقررہ حدود کے اندر رکھنا اور جرم وگناہ سے اجتناب کرنا ہوتا ہے۔اُسے نہ تو انتظامی پولیس کی نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ سزاؤں کے قوانین پر عملدرآمد کا خوف ہوتا ہے۔اس کا ظاہراور باطن یکساں ہوتا ہے۔ ہمیشہ اور ہر جگہ پر صرف خدا کے لیے لوگوں کے حقوق وحدود کی رعایت کرتا ہے۔گناہوں کے نزدیک نہیں جاتا اور دینی تعلیمات کے پیشِ نظر کوشش کرتا ہے کہ حق وعدالت کے دائرہ کے اندر ہی رہے۔

---

[۱] تحف العقول ص ۳۹۰

[۲] نہج البلاغہ خطبہ ۲۲

مادی زندگی اور ذمہ داریاں:

۳۔زندگی کی ضرورت ولزوم اور تمدن کی بنیادوں کا تحفظ اس بات کا متقاضی ہے کہ معاشرے کا ہر ایک فرد معاشرے کا مفید اور موثر رُکن ہو اور کسی ذمہ داری کو قبول کرے اور زندگی بسر کرنے، معاش کو تحفظ دینے اور دوسری معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرنے میں تا حدامکان کوشش سے کام لے، ایسے کام جن کی مالی اور اقتصادی لحاظ سے قدرو قیمت ہوتی ہے اور روپے پیسے کے ساتھ اُن کی قیمت لگائی جاتی ہے تمام ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں کمی اور کیفی لحاظ سے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور اسی معیار کے لحاظ سے سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا جاتا ہے اور اسی کے زیر سایہ زندگی کا پہیہ گردش کررہا ہے اور انسان کی مادی زندگی کی ضرورت پوری ہو رہی ہے۔

انسانی اقدار کی طرف رجحان:

نفس کی سربلندی اور حیات معنوی کے حصول کا تقاضا ہے کہ انسان کی مادی سرگرمیوں اور حیوانی سعی وکوشش کہ جن سے دنیاوی زندگی کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں کے ساتھ ساتھ انسانی اور روحانی کوششوں کو بھی جاری رکھا جائے مالی اور اقتصادی قدرو قیمت کے کاموں کے ساتھ ان کاموں کو بھی بجالایا جائے جن کی معنوی اور روحانی اقدار ہوتی ہیں اور نفس کی شرافت اور سربلندی کا سبب بنتے ہیں کیونکہ یہ روحانی سرگرمیاں ہی انسانیت کے وجود کو اجاگر کرتی ہیں۔ انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتی ہیں۔ اسے حیوانات کے گہرے کھڈ سے نکال کر انسانیت کی قابل فخر سربلندیوں تک لے جاتی ہیں۔

انبیاء اور انسان سازی:

جو لوگ خودشناسی کی راہوں پر گامزن ہو کر کسی حد تک حریم انسانیت تک رسائی حاصل کر چکی ہیں کم وبیش دنیا کے ہر ملک میں موجود ہیں۔ لیکن ایسے باعظمت افراد کی پرورش مادی معیار اور اقتصادی آسائشوں کی بناء پر نہیں ہوئی بلکہ نفس کے ساتھ جہاد حیوانی غرائز پر ضبط، اخلاقی اقدار کے احیاء اور انسان دوستی کی بنیادوں پر ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ انسانیت کے اعلیٰ وارفع مقام تک جا پہنچے ہیں اور یہ بذات خود انبیاء کے مکتبِ انسان سازی کا ایک پروگرام ہے۔

ہر دور میں مبعوث ہونے والے انبیاء کے فرائض میں یہ بات شامل تھی کہ وہ لوگوں کو انسان بنائیں، انسانیت کی اعلیٰ صفات سے متصف کریں اور انہیں جانثاری، فداکاری، تعاون، انصاف، ضبط وتحمل، عفو ودرگزر، انسان دوستی، مالی ایثار، جانی قربانی جیسی صفات سے آراستہ کریں اور اسلام کا عظیم الشان پیغمبر ﷺ بھی اسی اہم اور آخری مقصد کے لیے مبعوث ہوا جیسا کہ آپؐ کا اپنا ارشاد گرامی ہے:

"بعثت لاتھم مکارم الاخلاق"

"یعنی میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں تاکہ مکارم اخلاق کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں اور اس مقدس کلاس کو اپنے اختتام تک لے جاؤں۔"[1]

غلط خواہشات کا مقابلہ:

مکارم اخلاق پر عمل کرنے اور انسانی صفات کو اپنانے اور روحانی ارتقاء اور نفسانی شرافت کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بہت سے مواقع پر نفسانی خواہشات اور ہوائے نفس کی سرکوبی کریں اور حیوانی شہوات کی مخالفت کریں۔ وہی لوگ اس مہم کو سر کر سکتے ہین اور مکارمِ اخلاق کو عملی طور پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو اپنی باطنی اخلاق کریمہ کی پوری طاقت کے ساتھ حمایت کریں اور اُن کے ارادے کو تقویت پہنچائیں تاکہ اس حمایت کے بل بوتے پر اپنی خواہشات اور غرائز کو مسخر کر کے عزم راسخ اور پختہ ارادے کے ساتھ مکارم اخلاق کی راہ پر گامزن ہوں۔

حق کی سربلندی اور خدا کی جزا:

مکتب انبیاء میں رضائے الٰہی کا حصول، آخرت پر ایمان اور باری تعالیٰ کی جزا پر یقین انسانی صفات کے طاقتور حامی ہیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے سچے پیروکار حق کی سربلندی عدل وانصاف کے قیام ظلم کی بربادی، مظلوم کی حمایت، حاجت مندوں کی حمایت اور دوسری پسندیدہ وصفات کے لیے راہ خدا میں جان اور مال کے ساتھ قربانی، خدائے لایزال کی خوشنودی کے اور قیامت میں ان انجام شدہ کاموں کے لیے کئی گناہ ثواب کے حصول کا سبب ہیں۔ یہ روحانی کیفیت اور باطنی اطمینان اُنہیں تقویت عطا کرتا ہے جس سے وہ اپنی بہت سی خواہشات اور غرائز کی تکمیل سے چشم پوشی کر جاتے ہیں اور زندگی کے بہترین اور قیمتی سرمایہ تک کو راہ خدا میں خرچ کر ڈالتے ہیں۔ حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"من ایقن بالخلف جاد بالعطیة"

"یعنی جسے عوض ملنے کا یقین ہوتا ہے وہ خرچ کرنے میں دریا دلی دکھاتا ہے گویا جسے یہ یقین ہوتا ہے جو کچھ آج دے رہا ہے وہ کل اُسے مل جائے گا تو اپنی اعلیٰ سے اعلیٰ متاع کو بھی خرچ کر ڈالتا ہے۔"[2]

---

[1] مستدرک جلد ۲ ص ۲۸۲

[2] بحار الانوار جلد ۱۷ ص ۱۰۱

شہادت کا عشق:

زندگی سے محبت اور حیات سے عشق نہایت ہی طاقتور غریزہ ہوتا ہے، لوگ فطری طور پر اس بات کے لیے حاضر ہوتے ہیں کہ مقام ومنصب، جاہ وجلال، آب وخاک، گھر اور مال وغیرہ غرض ہر چیز سے چشم پوشی کرلیں تا کہ ان کی جان بچ جائے۔ اور وہ زندہ رہ جائیں لیکن یہی افراد جب اسلام کو کامل ایمان کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں حقیقی طور پر اور صحیح معنوں میں رسُول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو دل وجان سے مان لیتے ہیں اور راہ خدا میں جان نثاری اور فداکاری سے واقف ہوجاتے ہیں تو شہادت کے عاشق ہوجاتے ہیں راہ خدا میں آنے والی موت کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے ہیں اور اس بات کی آرزو میں ہوتے ہیں کہ اُنہیں میدانِ جہاد میں شہادت کی موت نصیب ہو کیونکہ مکتب دین سے وہ یہ درس سیکھ چکے ہیں کہ انسان مرنے کے ساتھ ختم نہیں ہوجاتا بلکہ ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ اور کیا ہی بہتر ہو کہ یہ منتقلی شہادت کے ذریعہ حاصل ہو اور وہ راہ خدا میں مارے جائیں اور اس خدائی اجر عظیم کے مستحق قرار پائیں جو صرف شہدا کے ساتھ مخصوص ہے۔

راہِ خدا میں موت:

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب بروز عاشورہ جنگ زوروں پر تھی اور لحظہ بہ لحظہ اس میں شدت آتی جارہی تھی تو حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے باایمان اور صاحبِ عظمت اصحاب کو مخاطب کرکے یوں فرمایا:

"عبربنی الکرام فما الموت الاقنطرۃ تعبربکم عن البئوس والضراء الی الجنان الواسعۃ والنعیم الائمۃ فایکم یکرہ ان ینتقل من سجن الی قصر۔"

"یعنی اے شریف زادو! صبر وشکیبائی سے کام لو کیونکہ موت تمہارے لیے پُل کی مانند ہے جس کے ذریعہ سے تم رنج وغم سے گزرکر وسیع بہشت اور جاودانی نعمتوں تک جا پہنچو گے۔ تم میں سے کون ایسا شخص ہے جو اس بات پر راضی نہ ہو کہ زندان کی کال کوٹھری سے نکل کر آراستہ وپیراستہ محل میں منتقل ہو؟" [1]

---

[1] نفس المھوم ص ۱۵۳

حضرت حمزہؓ کا موت کے بارے میں نظریہ:

جلال الدین محمد بلخی نے اپنی کتاب مثنوی میں یہ داستان لکھی ہے کہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا جناب حمزہؓ جوانی کے زمانے میں جب بھی میدان جنگ میں جاتے تھے زرہ پہن کر جاتے تا کہ دُشمن کے نیزوں اور تلواروں سے محفوظ رہیں لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر اسلام قبول کرلیا تو اپنے اس طریقہ کار میں بھی تبدیلی پیدا کرلی، اب جب بھی کفار اور مشرکین کے ساتھ جنگ کے لیے معرکہ کارزار میں تشریف لے جاتے تو زرہ زیب تن نہیں کرتے تھے، لوگوں نے اُن سے کہا جب آپ عنفوان شباب کی منزلوں پر تھے اور آپ کی قدرت اور طاقت بھی عروج پر تھی اس وقت تو آپ زرہ پہن کر جنگ کیا کرتے تھے۔ اب جب کہ آپ کسی حد تک بوڑھے اور کمزور ہو چکے ہیں دُشمن کا زرہ کے بغیر سامنا کرتے ہیں۔ کیا خداوند عالم قرآن مجید میں نہیں فرماتا:

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ

''یعنی اپنے ہاتھوں سے خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو[1]''

گفت حمزہؓ چونکہ بودم من جوان
مرگ می دیدم وداع این جہاں
سوی مرون کس بہ رغبت کے رود
پیش اژدرھا برہنہ کے شود
لیک از نور محمدؐ من کنون
نیستم این شہر فانی را زبوں
آنکہ مرون پیش چشمش تہلکہ است
امر لاتلقو بگرو اور بہ دست
وانکہ مرون پیش اوشد فتح باب
سارِ عُوآید مرا اُوراور خطاب۔

---

[1] آپ اس تہوارنہ انداز میں خطرات کا سامنا کیوں کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ہلاکت میں کیوں ڈالتے ہیں تو:

''یعنی جناب حمزہؓ نے جواب دیا جب میں جوان تھا تو موت کو اس دُنیا سے جدائی تصوّر کرتا تھا۔کوئی شخص موت کی طرف رضا و رغبت کے ساتھ کب جاتا ہے؟ کون اژدہے کے سامنے برہنہ ہوتا ہے؟لیکن اب محمد مصطفیٰؐ کے نُور کی وجہ سے میں اس فانی دنیا میں پریشان نہیں ہوں! جن لوگوں کی آنکھوں میں موت ہلاکت ہوتی ہے، لاتلقو کا حکم بھی اُنہیں کا دامنگیر ہوتا ہے،لیکن جن کے نزدیک موت، فتح باب (بہشت کا دروازہ کھلنے کا نام) ہے تو اسے سارِعُو (جلدی کرو) کے حکم سے خطاب ہوتا ہے۔

قیامت پر یقین اور فداکاری:

نتیجہ یہ نکلا کہ قیامت پر یقین اور جزائے آخرت پر ایمان کا تیسرا اثر فداکاری اور مکارمِ اخلاق کی راہیں ہموار کرنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔کیونکہ فداکاری اور مکارمِ اخلاق تک دست رسی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔بعض غریزی اور نفسانی خواہشات کی مکمل طور پر مخالفت کی جائے اور یہ چیز اندرونی اور باطنی اسباب کے بغیر ناممکن ہے مکتب انبیاء کے سچے پیروکار چونکہ قیامت اور اس دن کی جزا پر ایمان رکھتے ہیں لہٰذا ضرورت پڑنے پر اپنے جان،مقام و منصب اور بیوی بچوں تک کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔اعلیٰ اسلامی اور انسانی مقاصد کے حصول کے لیے کبھی بھی مشکلات سے نہیں گھبراتے اور خدا کی جزاؤں پر یقین رکھنے کی وجہ سے سخت سے سخت مصیبتوں کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں۔

انسانی فطرت اور اخلاقِ کریمہ:

یاد رہے کہ اخلاق کریمہ اور صفات حمیدہ کا شمار انسان کی اعلیٰ خواہشات میں ہوتا ہے اور وہ انسانی فطرت میں داخل ہیں، باعظمت اور صاحبِ فضیلت افراد گر چاہیں انسانی صفات اور اخلاقی کمال کے زیور سے آراستہ ہوسکتے ہیں۔آخرت اور آخرت کی سزا و جزا پر ایمان رکھے بغیر صرف فطری میلان اور طبعی کشش کی بنا پر اپنے اندر انسان دوستی اور فداکاری کو حس کی بیدار ہوائے نفس اور مخالف غرائز کو مسخر، انسانی اقدار کی طرف رجحان پیدا کرسکتے ہیں مکارم اخلاق سے مزین ہوسکتے ہیں اور معاشرتی زندگی میں عملی طور پر ان کی رعایت کرسکتے ہیں۔

اس قسم کے لوگ اگرچہ مُشرک یا غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں دینِ اسلام میں اُن کا بڑی حد تک احترام ہے اور مکارِم اخلاق اور انسانی صفات کی بنا پر اولیاء دین بھی ان کی بہت عزت اور تکریم کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب بنی طے کے قیدیوں کو مدینہ میں لایا گیا تو ان میں خاتم طائی کی بیٹی بھی تھی۔اُس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنا تعارف کراتے ہوئے

معافی اور رہائی کی درخواست کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"خلوا عنها فان اباها کان یحب مکارم الاخلاق"

''اسے چھوڑ دو کیونکہ اس کا باپ حاتم طائی مکارم اخلاق کو درست رکھتا تھا''[1]

فضیلت دوستی کی قدر و قیمت:

اخلاق کریمہ اجتماعی سربلندی اور انسانی زندگی کی علامت ہوتے ہیں اور تمام انسانی اقوام کو اپنے مکتبی افکار اور دینی عقائد سے قطع نظر اس بارے میں کوشش کرنی چاہیے اُنہیں اپنے آپ کو مکارمِ اخلاقِ سے مزین کرنا چاہیے۔ بشر دوستی اور تعاون کی بنیاد پر رہنا سہنا چاہیے تا کہ وہ اس طرح سے اپنے آپ کو کسی حد تک سعادت منداور خوش قسمت بنا سکیں۔

"لو کنا لا نرجو جنة ولا نخشی ناراً ولا ثواباولاعقابا. لکان ینبغی لنا ان نطلب مکارم الاخلاق فانها مما تدل علی سبیل النجاح"

یعنی فرض کیجئے کہ اگر ہمیں بہشت کی اُمید اور جہنم کا خوف نہ بھی ہوتا۔ ہمارا ثواب وعذاب پر بھی عقیدہ نہ ہوتا۔ پھر بھی مکارم اخلاق اس لائق تھے کہ ان پر عملدآمد کیا جائے، کیونکہ اخلاق کریمہ ان عوامل میں سے ہیں جو کامیابی اور فلاح وزرستگاری کا سبب بنتے اور انسان کو فلاح وکامرانی کی راہیں دکھاتے۔''[2]

---

[1] مستدرک جلد ۲ ص ۲۸۴

[2] مستدرک جلد ۲ ص ۲۸۳

مجلس نمبر 3

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ یَتَوَفّٰىکُمۡ مَّلَکُ الۡمَوۡتِ الَّذِیۡ وُکِّلَ بِکُمۡ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۱۱﴾

(السجدہ)

انسانی زندگی کے تین اہم دن:

انسانی زندگی میں تین دن ایسے ہیں جو دینی نکتہ نظر سے زبردست اہمیت کے حامل ہیں۔اوران دنوں میں زبردست تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ایک انسان کی ولادت کا دن، دوسرا اُس کی موت کا دن اور تیسرا قیامت کا دن۔ان تینوں ایام میں انسان ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہوجاتا ہےاوراس کی زندگی کی تمام کیفیتیں اورقوانین تبدیل ہوجاتے ہیں۔ ولادت کے دن وہ رحم مادرکوترک کرکے دُنیا میں قدم رکھتا ہے۔اس دن اس کی تمام اچھائیاں اور بُرائیاں جواُس نے دور ونزدیک سے والدین کی طرف سے ورثہ میں پائی تھیں۔ وہ بھی اورتمام پسندیدہ اورناپسندیدہ صفات جو ماں کے شکم میں اُس کے حصہ میں آئی تھیں وہ بھی اپنے ساتھ دُنیا میں لاتا ہےاوراس دُنیا میں مستقل حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔

مرنے کے بعد اپنی دنیاوی زندگی کوخیرباد کہہ کرعالم برزخ میں وارد ہوتا ہےاوردُنیا میں جواچھے یا بُرے کام انجام دیے ہیں اپنے ساتھ لے جاتا ہےاورانہیں اعمال کی بناپراپنے نفع یا نقصان ملاحظہ کرتا ہے۔

تیسرا دن وہ ہے جو وہ بحکم خداوندزندہ ہوگا اس کے جسم وجان کا باہمی ملاپ ہوگا، عالم برزخ اور خانہ قبرکوالوداع کہہ کرقیامت کے ہولناک، وحشت ناک اور ہیبت ناک عرصے میں قدم رکھے گا، نہایت ہی سخت اورطاقت فرسا حالات میں اپنے حساب وکتاب کاانتظار کرے گا پھراپنے فیصلے کاانتظار کرے گااورآخر میں اپنے کیے کی سزایا جزا پائے گا۔

یاسر خادم کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام رضاعلیہ السلام کوفرماتے ہوئے سُنا:

"ان اوحش مایکون ھذاالخلق فی ثلثة مواطن، یوم وُلدویخرج من بطن اُمه فیری الدنیا ویوم یموت فیعاین الاخرة واھلھا ویوم یبعث حیا فیری احکامالم یرھافی دارالدنیا و قد سلم اللہ علی یحییٰ (ع) فی ھذا الثلاث المواطن، وآمن روعته فقال"وسلام علیه یوم ولدویوم

یموت ویوم یبعث حیاً"(سُورہ ۱۹آیہ ۱۵) وقد سلم عیسی بن مریم علی نفسه فی هذه الثلاثة المواطن وقال"والسلام علی یوم ولدت ویوم اموت ویوم البعث حیاً(سورہ۱۹۔آیہ۳۳)

''یعنی لوگوں کے لیے تین زبردست وحشت ناک مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ جس دن وہ ماں کے پیٹ سے باہر آتے اور دُنیا کو دیکھتے ہیں دوسرا مرحلہ جس دن وہ مریں گے اور مرنے کے بعد کی دُنیا کو دیکھیں گے اور وہاں کے لوگوں اور وہاں کے لوگوں کا مشاہدہ کریں گے اور تیسرا مرحلہ جس دن دوبارہ زندہ ہو کر عرصہ محشر میں قدم رکھیں گے اور ایسے احکام کا مشاہدہ کریں گے جو دنیا میں نہیں دیکھے۔ اور خداوند عالم نے حضرت یحییٰؑ کے لیے تینوں دنوں کی سلامتی کی خبر دی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی ان تینوں مرحلوں پر اپنی سلامتی کی دُعا کی ہے۔''[1]

آخرت کی پہلی منزل:

معاد کے بارے میں سب سے پہلا موضوع جس پر توجہ مبذول کی جانی چاہیے اور حتی المقدور اس کے بارے میں تحقیق اور بحث کی جانی چاہیے موت کا مسئلہ ہے کیونکہ ہر شخص کے لیے اس کی دنیاوی زندگی پوری ہونے اور موت آ جانے کے بعد یہاں کی چند روزہ زندگی کا خاتمہ اور اس کی اخروی حیات جاوید کا آغاز ہو جاتا ہے جیسا کہ حضرت رُسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اذکروا هادم اللذات فقیل وماهو یارسول الله؟ فقال الموت فماذکره عبد علی الحقیقة فی سعة الاضاقت علیه الدنیا والافی شدة الااتسعت علیه. والموت اول منزلٍ منازل الاخرة وآخر منزل من منازل الدنیا فطوبی لمن اکرم عند النزول بأولها وطوبی لمن احسن مشایعته فی آخرها۔"

''یعنی لذتوں کے مٹانے والی چیز کو زیادہ ہمیشہ یاد رکھا کرو۔ عرض کیا گیا یا رُسولؐ اللہ! وہ کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا وہ موت ہے جو شخص صحیح معنوں میں موت کو یاد کرتا ہے۔ اگر چہ زندگی کی وسعتوں

---

[1] تفسیر برہان ص ٦٥٦

میں کیوں نہ ہو،اس کا غرور برطرف ہوجاتا ہے اور دنیا اس پر تنگ ہوجاتی ہے اور اگر سختی اور تنگی کی حالت میں ہو اور موت کو یاد کرلے تو ذہنی پریشانیوں اور فکری دباؤ سے نجات پالیتا ہے اور دُنیا اس کی نگاہوں میں وسیع اور کشادہ ہوجاتی ہے۔موت آخرت کی منزلوں میں سے پہلی اور دنیا کی منزلوں میں سے آخری منزل ہے۔وہ شخص خوش قسمت ہے جس کی پہلی منزل میں اُترتے ہی عزت وتکریم کی جائے اور آخری منزل سے نکلتے وقت خُوبصورت انداز میں الوداع کیا جائے۔''[۱]

''لکل دارٍ باب وباب دار الاخرۃ الموت۔''

''ہر گھر کا ایک بیرونی دروازہ ہوتا ہے اور آخرت کے گھر کا یہ دروازہ موت ہے۔''[۲]

باوجود یکہ موت خدا کی قضا اور قدر کے تحت ایک حتمی اور ناقابلِ تردید حقیقت ہے پھر بھی بہت سی زندگی کی محبت اور لمبی چوڑی آرزوؤں کے پیشِ نظر اس سے غافل ہیں اور دنیاوی امور میں اس قدر سرگرم ہیں کہ گویا اُنہیں اس بات کا باور ہی نہیں کہ موت بھی اُن کے پاس آئے گی،ان کی جان لے گی۔اور اُن کی زندگی کا چراغ گُل کردے گی۔

شک کے مشابہ یقین:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''لم یخلق اللہ عزوجل یقیناً لاشکّ فیه اشبه بشكٍ لایقین فیه من الموت''

''یعنی خداوند عالم نے کوئی یقین ایسا پیدا نہیں کیا جس میں شک ہو اور وہ موت ہے،جو ایسے شک کے مشابہ ہے جس میں یقین نہیں''[۳]

حکمت اور مصلحت کا تقاضا:

اس میں شک نہیں کہ موت سے غفلت سے اس دُنیا کے چلانے اور آباد کرنے میں بہت بڑا ہاتھ ہے یعنی اگر انسان اس طرح پیدکیا جاتا کہ کبھی بھی موت سے غافل نہ ہوتا اور ہمیشہ اس کی یاد تشویش اور اضطراب میں مبتلا رہتا تو کسی بھی صُورت

[۱] بحار الانوار جلد ۳ ص ۱۶۸

[۲] شرح ابن ابی الحدید جلد ۲۰ ص ۳۴۵

[۳] خصال صدوق ص ۱۴

میں دنیا سے اس کی محبت اور لگاؤ نہ ہوتا جو دُنیا کی آبادی اور رونق کا سبب ہے بلکہ وہ روحانی طور پر ایسے بیمار کی مانند ہوتا جو ناقابلِ علاج مرض میں مبتلا ہوتا ہے، ڈاکٹر جس کے علاج سے عاجز آ جاتے ہیں اور وہ خود زندگی سے مایوس ہو چکا ہوتا ہے ظاہر ہے کہ اس قسم کی بیماری کی وجہ سے ایسے مریضوں سے مسرت اور نشاط وسرور کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ اُن کے رات دن پریشانی میں گزرتے ہیں اُن کی زندگی غم واندوہ کا شکار ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ مضطرب اور پریشان رہتے ہیں۔

جو روایت ابھی ذکر ہوئی ہے وہ بھی شاید اسی چیز کو بیان کرتی ہے۔ کیونکہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے آغازِ کلام میں خدا کی تخلیق کی بات کی ہے گویا آپؑ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ حکمت اور مصلحت کا یہ تقاضا تھا کہ لوگوں کی تخلیق ہی ایسی بنیادوں پر ہو کہ موت جیسا حتمی اور یقینی امر بھی اُن کی نگاہوں میں مشکوک رہے تاکہ وہ زندگی اور دُنیا جہان کی آبادی کے سلسلے میں دلچسپی کا مظاہرہ کرتے رہیں، مایوس اور نااُمید نہ ہو جائیں اور موت کی یاد انہیں زندگی کی محبت سے روک نہ دے، لیکن اس کے باوجود اپنے اور موت کے درمیان لمبا عرصہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے اور حقیقت میں نگاہوں کو لمبی اور پُوری نہ ہونے والی آرزوؤں سے اندھا نہیں کر دینا چاہیے۔ حضرت علیہ السلام فرماتے ہیں:

"من رای الموت بعین یقنیه رأه قریباً ومن رای الموت امله رأه بعیدا۔"

''یعنی جو شخص موت کو یقین کی نگاہوں سے دیکھتا ہے تو اسے قریب پاتا ہے۔ اور جو آرزوؤں کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اُسے دُور سمجھتا ہے۔'' [1]

اخلاقی تباہی سے حفظِ ماتقدم:

انسان کو غفلت موت کی افراط سے بچانے، مادی اور دنیاوی اُمور میں زیادہ روی سے روکنے، اخلاقی پستی، بے راہروی اور تباہی سے باز رکھنے کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اس کی فطری غفلت کو تربیتی طریقوں کے ذریعہ متوازن رکھا جائے اور اس کی ایسے انداز میں تربیت کی جائے کہ گاہ گاہ جان بوجھ کر اور ارادہ واختیار سے موت کو خاطر میں لے آئے۔ اس حتمی انجام سے نصیحت حاصل کرے تاکہ وہ خود کو گناہوں اور دوسروں کے حقوق کو سلب کرنے سے بچائے رکھے۔

موت کی یاد اور باطنی اصلاح:

اسلام کے عظیم الشان پیشواؤں نے اپنے اخلاقی پروگراموں میں اس بات پر زیادہ توجہ دی ہے اور متعدد روایات کے ضمن میں اپنے پیروکاروں کو اس بات کی بار بار ہدایت کی ہے کہ موت کو زیادہ یاد رکھا کریں اور انہیں اچھی طرح یہ باور

---

[1] فہرست غرارص ۳۷۳

کرادیا ہے کہ موت کی یاد مومن اور باخبر لوگوں کے لیے مفید اور موثر ہے۔اُن کے اخلاق کی اصلاح کرتی ہے اُنہیں گناہوں اور باطنی نجاستوں سے روکتی اور اُن کی فلاح وسعادت کے اسباب فراہم کرتی ہے جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ذکر الموت یمیت الشھوات فی النفس ویقلع منابت الغفلة ویقوی القلب بمراعداللہ ویرق الطبع ویکسر اعلام الھویٰ ویطفی نارا الحرص ویحقر الدنیا وھومعنی ماقال النبی ﷺ فکر ساعة خیر من عبادته سُنة۔"

''موت کی یاد ناجائز شہوتوں کوانسان کے ضمیر میں مارڈالتی ہے،غفلت اور بے خبری کو جڑ سے اکھاڑ دیتی ہے۔دل کو خدائی وعدوں کے ذریعہ تقویت عطا کرتی ہے،دل میں رقت اور نرمی پیدا کرتی ہے۔ہوا اور ہوس پرستی کی علامتوں کو مٹادیتی ہے۔حرص کی آگ کو بجھا دیتی ہے اور دُنیا کوانسان کی نگاہوں میں چھوٹا اور حقیر بنا کر پیش کرتی ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کا مطلب بھی یہی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا: ایک گھنٹے کی سوچ بچار ایک سال کی عبادت سے افضل ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"من ا کثرمن ذکر الموت رضی من الدنیا بالیسیر۔"

''یعنی جوشخص موت کو زیادہ یاد رکھتا ہے وہ ضروریاتِ دُنیا کی تھوڑی سی چیز پر بھی راضی ہوجاتا ہے۔''[1]

عیب کے پردے ہٹتے ہیں:

موت کے سر پر پہنچ جانے اور فرشتوں کو دیکھ لینے کے ساتھ ہی غیب کے پردے ہٹ جاتے ہیں،مرنے والے پر عالم برزخ آشکار ہوجاتا ہے اور وہ خود کو درپیش آنے والے حالات سے باخبر ہوجاتا ہے،چنانچہ ابنِ عباس کہتے ہیں:

"مامن مومن یحضرہ الموت الاعرضت علیه الجنة قبل ان یموت فیریٰ موضعه فیھا۔"

یعنی ہر مرنے والے مومن کو احتضار کے وقت اور موت سے پہلے بہشت کا نظارہ کرایا جاتا ہے اور ہر

---

[1] نہج البلاغہ کلمہ ۳۴۹

شخص وہاں پر اپنا مقام دیکھ لیتا ہے۔''[۱]

مومن اور جنت کا نظارہ:

ابی بصیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کا مطلب پوچھا۔

''فلولا اذابلغت الحلقوم (سے لے کر) ان کنتم صادقین'' (تک[۲])

تو امام علیہ السلام نے فرمایا:

"انہا اذابلغت الحلقوم ثم اری منزلہ من الجنۃ فیقول، ردونی الی الدنیا حتیٰ اخبر اھلی بما اری فیقال لہ لیس الی ذالك من سبیل۔"

''یعنی جب مومن کی روح اُس کے گلے تک پہنچ جاتی ہے اور ابھی تک اس کی زندگی کا مکمل خاتمہ نہیں ہوتا اُسے بہشت میں موجود اُس کا مقام دکھایا جاتا ہے۔ وہ اُسے دیکھتے ہی جوش میں آجاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے دنیا میں واپس لے چلو تا کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اپنے افرادکنبہ کو بتاؤں، لیکن جواب ملتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا اور اب واپسی کی راہیں مسدور ہو چکی ہیں۔''[۳]

فرشتوں کا دیدار:

اس سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ محتضر (مرنے والے) کو پہلے مرحلے میں جو چیز نظر آتی ہے اور اس سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے اس کا عالم بعدازمرگ سے رابطہ شروع ہو چکا ہے۔ وہ فرشتوں کا دیدار اور اُن کے ساتھ ہونے والی باہمی گفتگو ہے۔ اس نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن مجید نے متعدد مقامات پر فرشتوں کا نام لیا ہے اور اُن پر ایمان لانا مومنین کے عقائد کی جزو قرار دیا ہے، اور اس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ مرتے وقت ملک الموت اپنے ساتھیوں سمیت محتضر کے پاس آتا ہے۔ اور مرنے والا اُنہیں دیکھتا بھی ہے۔ نیز اس امر کو سامنے رکھتے ہوئے کہ قرآن حدیث کی رُو سے مرنے کے بعد کے تمام مراحل اور اُمور فرشتوں ہی کے سپرد ہیں خواہ قبر میں سوال وجواب ہوں، قبر کا عذاب ہو، صور کا پھونکنا ہو، حساب وکتاب کی جانچ پڑتال ہو یا کئی اور دوسرے امور۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معاد سے متعلق بحث کے سلسلہ میں موت کے

---

[۱] لآلی الاخبار ص ۳۷۸

[۲] سورہ ۵۶ آیات ۸۳ تا ۸۷

[۳] کافی جلد ۳ ص ۱۳۵

مسئلہ پر روشنی ڈالنے سے پہلے فرشتوں کے بارے میں کچھ گفتگو ہوجائے اور اُن کی کچھ صفات اور خصوصیات کو بیان کیا جائے اور اُن کے فرائض کے متعلق کچھ گفتگو ہوجائے تاکہ قارئین محترم دینی نقطہ نظر سے فرشتوں کو اچھی طرح سے پہچان سکیں اور معاد کی بحث کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرلیں۔

مکتب انبیاء میں فرشتوں کا تصوّر:

۱۔فرشتے اللہ تعالیٰ کی اور مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں، حق تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اپنے انبیاء علیہم السلام کو اس بات سے باخبر کیا اور مکتب انبیاء میں فرشتوں کے وجود کا صراحت کے ساتھ ذکر آیا ہے۔اسلام کے پیروکاروں پر فرض ہے کہ وہ اس عقیدہ کو ضروریات دین سے سمجھیں اور خدا کی وحی اور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق فرشتوں کے وجود پر ایمان لائیں اور عقیدہ رکھیں۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ(البقرہ)

''رسولؐ خدا ان تمام چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اُن پر نازل کی گئی ہیں، اسی طرح اُن کے ایماندار پیروکار بھی خدا اُس کے فرشتوں، آسمانی کتابوں اور خدا کے رُسولوں پر ایمان اور عقیدہ رکھتے ہیں۔''[۱]

فرشتوں کی فرض شناسی:

(۲)فرشتے خدا کی زندہ، صاحب ادراک، عاقل وعالم اور آگاہ واطاعت گزار مخلوق ہیں اپنے اعمال کے بجالانے میں مکمل ارادہ اور اختیار رکھتے ہیں، خدا کی طرف سے جو فرائض بھی اُنہیں سونپے گئے ہیں وہ بطریق احسن انجام دیتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام اُن کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"وملائكته خلقتهم واسكنتهم سمٰواتك فليس فيهم فترة ولا عندهم غفلة ولا فيهم معصية هم اعلم خلقك بك واخوف خلقك منك واقرب خلقك اليك واعلمهم بطاعتك ولا يغشاهم نوم العيون ولا

---

[۱] کافی جلد ۳ص ۱۳۵

سھو العقول ولا فترۃ الابدان۔"

''یعنی اور وہ فرشتے کہ جنہیں تُو نے خلق فرمایا اور تمام آسمانوں میں اُنہیں سکونت بخشی، اُن میں نہ تو سُستی ہے اور نہ کمزوری، وہ اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوتے، گناہوں کا ارتکاب نہیں کرتے، تیری مقدس ذات کی سب سے زیادہ معرفت رکھتے ہیں، سب مخلوق سے بڑھ کر تجھ سے ڈرتے ہیں۔ معنوی لحاظ سے تجھ سے سب سے زیادہ نزدیک ہیں اور تیری اطاعت وفرمانبرداری کو سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ نہ تو نیند کا پردہ اُن کی آنکھوں کو ڈھانپتا ہے نہ عقلی بھول چوک کا شکار ہوتے ہیں اور نہ ہی سُستی اور جسمانی توانائی میں مبتلا ہوتے ہیں۔''[1]

انبیاء اور وحی کا فرشتہ:

(۴) فرشتے عالم غیب کی مخلوق ہیں اور جب تک انسان زندہ ہے اور مادی نگاہ رکھتا ہے اُنہیں اُنہیں دیکھ سکتا۔ یہ صرف خدا کے رُسول ہی تھے جو خدا کی اجازت سے دُنیا میں وحی کے فرشتے کو دیکھا کرتے تھے، اُن سے باتیں کیا کرتے تھے اور خدا کی وحی اُن سے وصول کیا کرتے تھے، جیسا کہ زرارہ جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں:

"قال الرسُول الذی یاتیہ جبریل فیکمہ ویراہ کما یریٰ احدکم صاحبہ۔"

''یعنی رُسول وہ ہوتا ہے جس کے پاس جبرئیل آتا ہے، اس کے ساتھ باتیں کرتا ہے اور وہ اسے ویسے ہی دیکھتا ہے جیسے تم میں سے کوئی شخص اپنے ساتھی کو دیکھتا ہے۔''[2]

فرشتوں کے ذمہ کام:

۵۔ فرشتوں کے مختلف گروہ ہیں اور اُن کے درجات اور مراتب میں بھی فرق ہے اور خداوند عالم کی طرف سے اُن کے مقررہ مقام ومرتبہ کے مطابق اُن کے مخصوص فرائض متعین ہیں۔ کچھ تو اُن میں خدا کی وحی اور الہام، اسی طرح تشریعی ثواب وعقاب کے نفاذ کے لیے ہیں اور کچھ کائنات کے تکوینی نظام کو چلانے پر مقرر ہیں قرآن مجید کی متعدد آیات میں ان کی ذمہ داریاں اور سپرد کاموں کا تذکرہ موجود ہے۔ مزید معلومات کے لیے اس فصل میں بھی اور آئندہ فصلوں میں بھی مناسب مواقع پر اس بات کی طرف اشارہ ہوگا۔

---

[1] کتاب السماد العالم ص ۲۲۷

[2] بحارالانوار جلد ۷ ص ۲۹۴ سُورہ ۷ آیت ۵۴

کائنات کا نظام اور فرشتے:

خداوند عالم کی طرف سے بعض فرشتوں کے ذمہ جو کام ہیں ان میں سے ایک اہم ترین آسمان کے قدرتی اُمور اور کائنات کے نظم ونسق کو چلانا ہے، خداوند عالم نے قرآن پاک میں ایسے فرشتوں کو ''مدبر'' کے نام سے یاد کیا ہے اور اُن کی قسم بھی اٹھائی ہے۔

اس نکتہ کی یاد آوری بھی ضروری ہے کہ آسمان کے قدرتی اُمور اور کائنات کا نظم ونسق دراصل خداوند عالم کے ارادہ اور اختیار ہی میں ہے یعنی تمام عالم وجود کا مالکِ حقیقی وہی ہے اور تمام کائنات کی فرمانروائی اور قابل اطاعت وعبادت بھی وہی ذات ہے۔ وہ خود فرماتا ہے۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾

''آگاہ رہو کہ عالم وجود کی ملکیت بھی اور تمام کائنات کی مطلق فرمانروائی بھی اس ذات والا صفات سے مخصوص ہے، وہ ہر قسم کے عیب ونقص سے پاک تمام اچھائیوں کا سرچشمہ اور عالمین کا پروردگار ہے۔''[1]

نظم کائنات کو چلانے میں فرشتے واسطہ ہیں:

اسی لیے کائنات کے حکیمانہ نظام کی حقیقی اور اصلی مدبر وہی لایزال ذات ہے اور مدبر فرشتے جو کہ حکم خدا کے مطابق کائنات کے اُمور کی تدبیر کے ذمہ دار ہیں، درحقیقت اس کا ایک واسطہ اور رُسول ہیں جو اس کے تکوینی امور کو بجا طور پر انجام دیتے ہیں اسی لیے خداوند کریم نے قرآن مجید میں تدبیر اُمور کی نسبت کبھی تو اپنی ذات کی طرف دی ہے اور فرمایا ہے:

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ،[2]،

''آسمان سے زمین تک کے آفاقی حکیمانہ نظام کا مدبر ہے۔''

اور کبھی کائنات کے اُمور کی تدبیر کی نسبت ان فرشتوں کی طرف دی ہے جو خالق اور مخلوق کے درمیان واسطہ ہیں، چنانچہ فرماتا ہے: ''فالمدبرات امرا'' ''یعنی ان فرشتوں کی قسم جو کائنات کے امور کی تدبیر کرتے ہیں۔''[3]

---

[1] سُورہ ۷ آیت ۵۴

[2] سورہ ۳۲، آیت ۵

[3] سورہ ۷۹، آیت ۵

حاملین عرش:

صفیحہ کاملہ میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے ان فرشتوں کا تذکرہ کیا ہے جو حاملین عرش ہیں اور کائنات کے اُمور کو چلانے پر مقرر ہیں۔امام عالی مقام خدا کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں:

"اللهم وحملة عرشك الذين لايفترون من تسبيحك ولايسأمون من تقديسك ولا يستحسرون من عبادتك ولايرثون التقصيرعلى الجد فى امرك ولا يغفلون عن الوله اليك...والهابطين مع قطر المطر اذاانزل والقوام على خزائن الرياح والمؤكلين بالجبال فلا تزول والذين عرفتهم مثاقيل المياه وكيل ما تحويه لواعج الامطار وعوالجهاد......"

''یعنی اے بارالہا! جو حاملین عرش تیرے درود کے مستحق ہیں وہ فرشتے ہیں جو تیری تسبیح سے کمزور سست نہیں ہوتے تیری تقدیس سے عاجز نہیں آتے اور تیری عبادت سے تھکتے نہیں۔ یہ فرشتے اپنے فرائض کی انجام دہی میں جدوجہد کی بجائے کوتاہی کو اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی کبھی تیری عظمت کے سامنے جذبہ اور حیرت سے غافل ہوتے ہیں............

بارالہا! ان فرشتوں پر درود بھیج جو مینہ برستے وقت بارش کے قطرات کے ساتھ ہی نیچے آتے ہیں، وہ ایسے فرشتے ہیں ہواؤں کے چلنے کے اسباب وعوامل جن کے فرمان ہیں۔ایسے فرشتے ہیں جو پہاڑوں پر نگرانی کے ذمہ دار ہیں۔ایسے فرشتے ہیں جنہیں تُو نے پانی کے ثقل اور بارشوں کے مُضر اور تباہ کن مواکے وزن سے آگاہ فرمایا ہے اور ان کے تسلسل سے تو نے انہیں مطلع کر دیا ہے۔[1]

عرش کے معانی:

حضرت امام سجاد علیہ السلام اس دُعا کے آغاز میں عرش کا نام لے کر بارگاہ رب العزت میں عرض کرتے ہیں''اللهم وحملة عرشك' روایات میں عرش کے متعدد معانی بیان کئے گئے ہیں جن مُں سے بعض روایات کے مطابق ایک معنی ہے آفاقی جرم جو اس قدر وسیع ہے کہ کرُسی، آسمانوں، زمینوں اور کہکشاؤں جیسے اپنے تمام متعلقات سمیت اس میں

---

[1] صحیفہ سجادیہ

سما جائے اور لغت میں بھی اس کے بہت سے معنی ہیں جن میں سے ایک عمارت اور محل بھی ہے۔

عرش پر غلبہ:

پس معلوم ہوا کہ عرشِ الٰہی کا معنی کائنات کا محل اور آفاق کا مجموعہ ہے یا دوسرے لفظوں میں عرش نام ہے کائنات کے تمام عالم وجود کا جو مشیت ایزدی کے ساتھ معرضِ وجود میں آچکا ہے۔ قلمرو تخلیق میں قرار پانے والی تمام کائنات کا نظم ونسق اور اُسے سنبھالنا اصلی اور بنیادی طور پر تو ذات پروردگار کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ وہی اس کا مالک اور ساری کائنات میں اسی کا فرمان بغیر کسی چون وچرا کے واجب الاجراء ہے اور عرش پر اس کا ہی تسلط اور غلبہ ہے جو تمام کائنات کا مجموعہ ہے۔ جیسا کہ خود اُس کا ارشاد ہے:

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝٥ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝٦

''یعنی رحمان اللہ عرش پر حکم فرما ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں اور ان دونوں کے درمیان اور زمین کے نیچے چھپا ہوا ہے غرض سب کچھ اسی رحمان کے ساتھ مخصوص ہے۔''[1]

فرشتوں کا مقام ومنصب:

تدبیر اُمور کرنے والے فرشتے، خدا کے برگزیدہ رسُول اور واسطے ہیں اور اسی نے کائنات کے اُمور چلانے پر مامور کیا ہوا ہے۔ ان سنگین فرائض کو بخوبی انجام دینے کے لیے خدا نے انہیں ضروری علم اور معلومات فراہم کردی ہیں اور خلقت کے اسرار اور پیچیدگیوں سے آگاہ کردیا ہے۔ یہ فرشتے عرشِ الٰہی کے اُمور کو چلانے کے ذمہ دار ہیں اور باری تعالیٰ کے حُکم کے مطابق اس سنگین بوجھ کے حامل قرار پائے ہیں۔

خلاصہ کلام قرآن وحدیث کی رُو سے فرشتے زندہ، صاحب ادراک، عقل، علم، ارادہ اور اختیار کے مالک ہیں۔ خداوندعالم نے اُنہیں مختلف گروہوں میں پیدا کیا ہے اور ہر ایک گروہ کے لیے ایک حد مقرر کردی ہے، مقام بتادیا ہے اور ذمہ داری متعین کردی ہے۔ وہ سب کے سب خدا کے اطاعت گزار اور فرمانبردار ہیں۔ اس کے احکام کو مکمل واقفیت کے ساتھ سرانجام دیتے ہیں۔ ہرگز ہرگز اپنے فرائض منصبی سے پہلوتہی نہیں کرتے اور قرآن مجید کے پیروکاروں نے یہی عقیدہ مکتبِ اسلام سے سیکھا ہے اور صدیوں سے اسی پر قائم چلے آرہے ہیں۔

---

[1] سورہ ۲۰ آیت ۵،٦

غلط تاویل:

بعض حکماء ور فلاسفہ کے تصوّر کے مطابق ملائکہ سے مراد عقول مجروہ، نفوس فلکیہ اور طبیعت کی گہرائیوں میں نہفتہ تو انائیاں ہیں۔ اور فرشتوں کے بارے میں جو آیات اور احادیث ذکر ہوئی ہیں اپنے گمان کے مطابق انہیں معانی میں ان کی تاویل کرتے ہیں۔ یہ تاویل نہ تو علمی لحاظ سے کوئی قدر و قیمت رکھتی ہے اور نہ ہی مذہبی لحاظ سے علمی لحاظ سے تو اس لیے کہ کچھ فلاسفہ نے گذشتہ زمانے میں اپنے وہم وگمان کے مطابق کائنات کی تخلیق کا ایک نقشہ اپنے ذہنوں میں تیار کیا اور بعض سوالات کا جواب دینے کے لیے مجبور ہوئے کہ عقول مجروہ اور نفوس فلکیہ جیسی اصطلاحوں کا سہارا لیں اور اس طرح سے اپنی مشکلات کا حل پیدا کریں۔ اور معلوم ہے جب تک کوئی مفروضہ عملی طور پر ثابت نہ ہوجائے اس وقت تک صرف مفروضہ اور نظریہ ہی رہتا ہے اور اسے ایک واقعی اور علمی مطلب کے عنوان سے پیش نہیں کیا جا سکتا اور دینی لحاظ سے اس لیے بے اہمیت ہے کیونکہ اسلامی مدارک میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ فرشتے عاقل، عالم، صاحب ارادہ اختیار ہیں۔ جو کام بھی انجام دیتے ہیں پوری سمجھ اور صراحت کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ لیکن یہ حضرات کہتے ہیں کہ زمین کے فرشتے وہ طاقتیں ہیں جو موجودات کی طبیعت (نیچر) میں مخفی ہیں جیسے زمین کی قوتِ کشش اور معدے کی قوت ہاضمہ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا قوت کشش یا قوت ہاضمہ صاحب علم وعقل ہیں؟ آیا وہ اپنے ارادے اور اختیار سے عمل کرتی ہیں؟ آیا جو کام وہ انجام دیتی ہیں اس سے واقف اور آگاہ ہیں؟ صاف سی بات ہے کہ ان سوالوں کا جواب منفی ہے، طبعی طاقتیں جو غیر عاقل اور جبر کے تحت مصروف عملِ ہیں وہ ان فرشتوں کے علاوہ ہیں جو صاحب علم وعقل ہیں جن کا تذکرہ قرآن وحدیث میں ہے اور جن کا کام ارادہ اختیار کے تحت ہوتا ہے۔

فرشتوں کا ادراک اور آگاہی:

عالمِ آخرت پر یقین کی طرح فرشتوں کے وجود پر ایمان بھی خدا کی وحی اور معصوم انبیاء کے اعلان کی وجہ سے ہے۔ جس طرح مرنے کے بعد کی دُنیا، میزان وحساب اور خدا کی سزا اور اجزا تک رسائی نہیں ہوسکتی اور نہ ہی وہ مستقبل طور پر ان چیزوں کی نفی یا اثبات کرسکتی ہے، اسی طرح فرشتوں کی ذات وصفات اور خصوصیات بھی عقل وخرد کی قلمرو سے باہر ہیں اور انسانی عقل بطور مستقل ان کی نفی یا اثبات نہیں کرسکتی۔

دین اور عقل سے بالاتر مسائل:

بالفاظِ دیگر بعض اُمور ایسے ہیں جن کا تعلق عقل سے ہے یعنی انسان اپنی عقلی طاقت سے ان کا ادراک کرکے ان پر

مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے اور بعض امور عقل کے خلاف ہوتے ہیں یعنی انسان اپنی عقل وفکر کی بنا پر اُنہیں ناممکن سمجھتا ہے اور ان کے باطل ہونے کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ لیکن بعض امور عقل وفکر کی بنا پر اُنہیں ناممکن سمجھتا ہے اوران کے باطل ہونے کا فیصلہ کر دیتا ہے لیکن بعض امور عقل سے بھی بالاتر، ہوتے ہیں یعنی انسانی، عقل کی وہاں تک رسائی ہو ہی نہیں سکتی اور عقل مند انسان اپنی عقلی طاقت کے بل بوتے پر نہ تو اُن کا اثبات کر سکتا ہے اور نہ ہی نفی۔ معاد اور فرشتوں کے وجود کا تعلق بھی اسی تیسری قسم سے ہے اور یہ اُمور عقل وخرد سے بالاتر ہیں۔ مکتب انبیاء علیہم السلام کے پیروکاروں نے خدا کی وحی اور مقدس ومعصوم انبیاء کے فرمان کے مطابق ان دو غیبی اُمور کو قبول کیا ہوا ہے اور ان پر ایمان لا چکے ہیں۔

فرشتوں کے وجود کی تائید:

جس اہم نکتے پر یہاں زیادہ توجہ کرنی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے دور کے دانشور سائنسی ترقی کی وجہ سے تخلیق کائنات کے بعض مخفی اُمور سے واقف ہو چکے ہیں جن میں سے کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جو فرشتوں کے وجود کی تائید کرتی ہیں جن کا تذکرہ مکتبِ انبیاء میں موجود ہے۔ واضح لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ انسان کے اندر زندگی جاوید کی تمنا پائی جاتی ہے اور یہی تمنا عالم آخرت کی زندگی جاوید کی تائید کرتی ہے، اسی طرح نظام خلقت اور کتاب طبیعت میں کچھ ایسے لطیف اُمور ملتے ہیں جو مدبر، آگاہ اور صاحبِ علم فرشتوں کے وجود کی تصدیق کرتے ہیں۔ مطلب کی وضاحت کے لیے ہم یہاں پر ان میں سے کچھ چیزوں کی طرف بطور نمونہ اشارہ کریں گے۔

حیاتی عوامل کے پیشِ نظر مقصد ہوتا ہے:

''ڈاکٹر الیکس کارل کہتے ہیں: اعضاء بدن کا باہمی تعلق دو چیزوں کے ذریعہ برقرار ہے۔ ایک تو اندرونی ماحول اور دوسرے اعصابی ڈھانچہ جس سے ہر ایک عضو دوسرے اعضاء کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور دوسرے اعضاء اس کے ساتھ ان کی باہمی ہم آہنگی اُصولی طور پر کسی ہدف کی تلاش میں ہوتی ہے۔ اگر ڈالسٹوں VITALISTS اور مکینیکل انجینئرز MECHANICAL ENGINEERS کے بقول جسمانی ساخت کے باہوش ہونے کو بھی مان لیں تو بھی معلوم ہوتا ہے کہ زندگانی کیفیت ہدف کے حصول کے لیے اپنی راہیں خود تلاش کر لیتی ہے۔ زندگی کے عوامل کو مقصد کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ شاید کہ اس ساخت کے لیے زمان اور مکان کو جو اصل مفہوم ہوتا ہے کہ ایک مفہوم ہوگا کیونکہ وہ اچھی طرح سے دُور کو نزدیک کی مانند اور مستقبل کو حال کی طرح درک کرتے ہیں۔ مثلاً حمل کے آخری ایام میں عورت کے بیرونی جنسی اعضاء کی نرم ساخت فرید اور پھیلنے کے قابل ہو جاتی ہے اور کیفیت کی یہ تبدیلی چند دن بعد زچگی کے دوران متولد ہونے والے بچے کی راہ

آسان بنادیتی ہے اور پھر پستان کے خلیے CELLULOSE بڑھ جاتے ہیں اور خود یہ عضو بڑا ہو جاتا ہے۔ زچگی سے پہلے ہی اپنا کام شروع کر دیتا ہے، دُودھ بناتا اور خود کو بچے کی غذا کے لیے آمادہ کر لیتا ہے۔ یقینا یہ سب کچھ آئندہ کے واقعات کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور مستقبل ان کے پیش نظر ہوتا ہے۔ اور پھر بچہ دانی میں بچے کی نشوونما کی مدت کے دوران میں رحم کی ساخت ایسی صُورت اختیار کر لیتی ہے گویا وہ آئندہ کے واقعات کو ابھی سے جانتی ہے۔ اور دو مختلف مکانوں میں اعضاء کی ہم آہنگی اچھی طرح دیکھنے میں آتی ہے۔''[1]

''اعمال حیاتی کی مقصد پر نگاہ کا اس وقت بھی اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے جب خُون بہنے کا موقع ہو، پھر پتہ چلتا ہے کہ جریانِ خُون کی ساخت کس حد تک اپنے مقصد کو پیش نظر رکھتی ہے، کیونکہ پہلے تو تمام رگیں سُکڑ جاتی ہیں۔ اس طرح سے باقی ماندہ خُون کا نسبی حجم زیادہ ہو جاتا ہے اور بہنے کے لیے خُون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ اس طرح تمام دقیق اور مائع چیزیں جو اعضا اور عضلات میں موجود ہوتی ہیں وہ بھی بال جیسی باریک رگوں سے گزر کر گردشِ خُون کے مدار میں داخل ہو جاتی ہیں اور پھر دوسری طرف بیمار سخت پیاس کا احساس کرتا ہے اور وہ جو پانی بھی پیتا ہے فوراً جذب ہو جاتا ہے اور خُون کے پلازما BLOOD PLASMA کو اپنی سابقہ حالت پر لوٹا دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ خون کے گلوبیونز اپنے ان اعضا سے نکلنا شروع ہو جاتے ہیں جہاں پر محفوظ تھے۔ آخر کار ہڈیوں کا گودا خونی خلیے CELLULOSE بنانا شروع کر دیتا ہے اور خونی ساخت کے عمل کو اختتام تک پہنچاتا ہے۔ بنابریں سارے کا سارا بدن فزیکل PHYSICAL فزیوکیمیکل PHYSICAL CHEMICAL طور پر جسمانی ساخت میں ہم آہنگی کا مظاہرہ کرتا اور کوششوں میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ ہم اس ہم آہنگی اور باہمی وابستگی کو دیکھتے تو ہیں لیکن اس کی وجوہات اور اسباب کی کوئی توجیہہ نہیں کر سکتے۔''[2]

ناقابلِ تفسیر ہم آہنگی:

مادی حضرات اس حیران کُن ہم آہنگی، ہم بستگی اور نظم وضبط کو طبعی ساخت کا نتیجہ اور خلیوں CELLULOSE کی مخصوص صفات کا ثمرہ جانتے ہیں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ بدن کے خلیے لاکھوں کروڑوں سال کے طبعی اُتار چڑھاؤ اور اتفاقی رودادوں کی وجہ سے یہ صُورت اختیار کر چکے ہیں جو بے شعور طبیعت کے اندر اتفاقی صُورت میں رُونما ہوئے ہیں۔ اور پھر خلیوں کے ہر گروہ کی صفات اور خصوصیات وراثت کی صُورت میں بعد کے گروہوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔

---

[1] انسان ناشناختہ ص ۱۹۰

[2] انسان ناشناختہ ص ۱۹۱

خلیوں کی طبعی خصوصیات:

بہت سے خدا پرست بھی مادی حضرات کی مانند یہی نظریہ رکھتے ہیں اور اس ہم بستگی اور نظم وضبط کو خلیوں کی طبعی صفات اور فطری ساخت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ صرف اتنے سے فرق کے ساتھ کہ وہ کہتے ہیں خلیوں کی ساخت اور ان کی مخصوص صفات، اتفاق اور تصاوف کا نتیجہ نہیں بلکہ حکمتوں والے خالق نے اُنہیں خلق ہی اسی طرح کیا ہے کہ جس گروہ کی زندگی کے لیے جو صفات اور خصوصیات ضروری تھیں اسے انہیں صفات وخصوصیات سے نوازا ہے، اسی طرح جو صفات بدن کے خلیوں کی مختلف انواع کی زندگی کے لیے ضروری تھیں اور مجموعی طور پر بدن میں ان کی ہم آہنگی کی جتنی ضروریات تھیں اُنہیں عطا کی ہے۔

نوبل انعام یافتہ مشہور ماہر حیاتیات اور فریالوجسٹ ڈاکٹر کارل خود بھی ایک خدا پرست دانشمند ہیں۔ حکمتِ خدا کی بھی مانتے ہیں اور خلیوں کی ساخت اور اُن کی تمام جہات کو اپنے علمی معیار پر پرکھا تو یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ ''ہم یہ ہم بستگی اور ہم آہنگی دیکھتے تو ہیں لیکن اس کے اسباب کی کوئی توجیہ نہیں کرسکتے۔''

نظم کے محافظ فرشتے:

مکتب اسلام کے نقطہ نظر سے یہ باقاعدہ ہم آہنگی وارتباط اور یہ آگاہانہ نظم وانضباط جو کائنات کے نظام کا ایک نہایت ہی چھوٹا سا حصہ ہے مدبر فرشتوں کی وجہ سے ہے جو صاحبانِ علم وعقل اور باارادہ واختیار ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے عالم نے ان فرشتوں کو تمام کائنات کا عظیم نظام چلانے کے لیے منتخب کرلیا ہے۔ اُنہیں ضروری علم ومعرفت سے آراستہ کیا ہے اور تمام عالم وجود کے نظام کو منظّم رکھنے کی ذمہ داری اُنہیں کے سپرد کی ہے۔

بدن میں خلیّوں کے فرائض:

بدن کے پیچیدہ خلیوں کی دُنیا کے نظام میں بہت باریک اور دقیق نکات اور مطالب نہایت ہی توجہ کے مستحق ہیں۔ پہلا یہ کہ جسم کے اندر کئی مختلف قسم کے خلیّوں کے انواع واقسام کے فرائض ہیں اور خداوند حکیم نے ہر ایک قسم کو اس کے اپنے مخصوص فرائض سے آگاہ کردیا ہے۔ اور ان کے پروگراموں کو ان کی سرشت میں رکھ دیا ہے۔ اور فطری طور پر اُنہیں اپنے کام کی ادائیگی سے آگاہ کردیا ہے۔ دوسرے یہ کہ مختلف قسم کے خلیے اپنی مختلف صفات وخصوصیات کے ساتھ ایک اکائی کی نسل سے معرضِ وجود میں آتے ہیں اور پھر بتدریج گروہوں کی صُورت میں ایک دوسرے سے جُدا ہوجاتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ان علیوں کی ہم بستگی خاص اور ضروری مواقع پر پیدا ہوجاتی ہے جو بذاتِ خود حیاتیات کے اہم ترین مسائل میں سے ایک

ہے اور آج کی دانش اپنی تمام تر ترقیوں کے باوجود اس کی گہرائی کونہیں سمجھ سکی اور خلیوں کی ہم بستگی کے اسرار ورموز سے واقف نہیں ہوسکی۔ان حقائق کوکسی حد تک واضح کرنے کے لیے یہاں پر آج کی علمی روشنی کے پرتو میں مذکورہ تینوں صورتوں کو قدرے تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔

خلیّوں کی مخصوص صفات:

''پہلا یہ کہ خلیوں کی بھی جانوروں کی طرح مختلف نسلیں ہوتی ہیں البتہ ان کی شناخت ان کی علمی اور بناوٹی خصوصیات سے ہوتی ہے۔جسم کے مختلف پہلوؤں اور اعضاء کے خلیے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں جیسے غدودوں کی گلٹیوں GLANDS تلی SPLEEN اور جلد SKIN کے خلّیے۔''

''اگر مختلف خلیوں کی تجربہ گاہوں میں پرورش کریں اور اُن کا تجزیہ کریں تو پتہ چلے گا کہ جراثیم کی مانندان کی بھی مختلف نسلیں ہیں۔خلّیوں کا ہرایک قبیلہ اپنی مخصوص صفات کا حامل ہوتا ہے کہ اگر وہ کئی سالوں تک بھی کسی زندہ موجود سے جدار ہیں پھر بھی ان صفات کومحفوظ رکھتے ہیں۔خلیوں کی مختلف نسلیں اپنی مخصوص رفتار، اجتماعی کیفیت بڑھنے پھیلنے کی مقدار پیدا ہونے والے مواد اور اپنی مخصوص غذا سے پہچانی جاتی ہے۔خلّیوں کے مختلف گرہوں کے اپنے مخصوص قوانین ہوتے ہیں یعنی ہرگروہ کاتعلق کسی خاص عضو سے ہوتا ہے۔''[1]

خلیوں کی ہدایت تکوینی:

اگر تجربہ گاہوں میں ان خلیوں کی EPITHELIAL TISSUE کوجسم سے باہر کئی ماہ تک حفاظت کی جائے اور ان پر تجربات کئے جائیں تو معلوم ہوگا کہ وہ بڑھ چکے ہیں اور چنی ہوئی موزائیک (اینٹوں) کی مانند ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ اور پہلو بہ پہلو قرار پاچکے ہیں جس طرح کہ جسم میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح بدن سے باہر رہ کر سفید سالمے GLOBULE بیرونی جراثیموں اور سُرخ سالموں کو چٹ کر گئے ہیں جبکہ جسم کا کوئی واسطہ بھی نہیں ہے تا کہ اسے ان مضر عوامل سے محفوظ رکھیں۔''

''زندہ عوامل کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ فطری طور پر اپنے فرائض کو پہچانتے ہیں جسم سے باہر موجود خلیے اپنی ساخت کے مخصوص طریقہ کار کوخود ہی اپناتے ہیں جبکہ اس بارے میں ان کا نہ تو کوئی ہدایت کنندہ ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی ہدف۔مثلاً اگر خون کے ایک قطرے کوکسی مائع پلازما میں ڈالیں تو چند سُرخ گلوبیولز اپنی کششِ ثقل کی وجہ

---

[1] انسان ناشاختہ ص ۲۸

سے نیچے چلے جائیں گے اور ایک ننھی سی ندیا کی صُورت اختیار کرلیں گے اور بہت ہی جلد اس ندیا کے اطراف میں ایک کنارہ بن جائے گا جو جھلی FIBRIN کے سلسلے کے ذریعہ ڈھک جائے گا اور ندیا ایک نلی کی صُورت اختیار کرلے گی جس میں سُرخ سالمے عبور کرنا شروع کردیں گے۔ پھر سفید سالمے اس نلی کی سطح پر پھیل جائیں گے اور اپنے اجتماع کے ذریعہ اسے گھیرلیں گے اور بال جیسی باریک رگوں کا منظر پیش کریں گے۔ اس ترکیب کے ذریعہ خُون کے سالمے گردشِ خون کا سلسلہ ایجاد کرلیں گے، حالانکہ نہ تو وہاں پر دل موجود ہوتا ہے اور نہ ہی گردشِ خون سے متعلق دوسرے کوئی لوازمات جن کی گردش خُون کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔''[۱]

فرعون کو موسیٰ کا جواب:

خلیوں کی ہرایک نوع کے لیے جانوروں کی مختلف انواع کی طرح اپنی مخصوص صفات ہیں اور خداوندِ عالم نے ان کی پیچیدہ ساخت میں تمام لطافتیں اور باریکیاں ودیعت کردی ہیں اور اُنہیں ضروری سرمایہ سے لیس کردیا ہے اور فطری طور پر اُنہیں طبعی ذخائر سے بہرہ مندی کا درس بھی دیا ہے۔ وہ جامع اور کامل گفتگو جو جناب موسیٰؑ بن عمران نے فرعون سے کی تھی اور قرآن مجید نے اسی کا حوالہ دیا ہے اسی حقیقت کو بیان کرتی ہے اور تمام برّی وبحری، نباتی وحیوانی حتّیٰ کہ ایسے خلیے بھی اسی آیت شریفہ میں داخل ہیں جو الیکٹرونی ذرائع کے بغیر نہیں دیکھے جاسکتے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

قَالَ فَمَنۡ رَّبُّكُمَا يٰمُوۡسٰى ۝۴۹ قَالَ رَبُّنَا الَّذِىۡۤ اَعۡطٰى كُلَّ شَىۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝۵۰

''یعنی جب حضرت موسیٰؑ اور جناب ہارونؑ فرعون کی دعوت دینے پر مامور ہوئے اور فرعون کی محفل میں تشریف لائے تو اُس نے موسیٰ اور ہارون کو خطاب کرکے کہا: تم دونوں کا خدا کون ہے؟ تو موسیٰ نے جواب دیا ہمارا پروردگار ہے جس نے ہر شئے کو اس کی لیاقت کے مطابق عطا کیا اور پھر اسے اپنی عطاؤں سے استفادے کے طریقے کی ہدایت کی ہے۔'[۲]'

جسمانی ساخت اور خلیّوں کی ساخت میں مماثلت:

''دوسرا''، ہم جانتے ہیں کہ انسان کا بدن ابتدا میں ایک خلیّے سے تشکیل پاتا ہے اور جنین کے شکم مادر میں نشوونما پانے کے ساتھ ہی وہ خلیہ اول تو دوحصوں میں پھر ان میں سے ہر ایک دو دو حصوں میں تقسیم ہوتے جاتے ہیں اور تقسیم کا یہ

---

[۱] انسان ناشناختہ ص ۱۰۶

[۲] سُورہ ۲۰، آیات ۴۹، ۵۰

سلسلہ اس کی انتہائی اور آخری نشوونما تک جاری رہتا ہے باوجودیکہ جنین اپنی ساخت کے لحاظ سے نشوونما کے دوران ہر لحہ پیچیدہ ہوتا جاتا ہے لیکن اپنے اصلی تخم کی سادگی کو بحال رکھتا ہے۔ خلیے بھی اپنی بے شمار قسموں میں ڈھانچے یا عضو کی صورت میں اپنی اصل اکائی کو فراموش نہیں کرتے اور ابھی سے اپنے مستقبل کی ذمہ داریوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔"[۱]

"ہر عضو کی تشکیل خاص طریقوں سے انجام پاتی ہے جو نہایت ہی عجیب وغریب معلوم ہوتے ہیں۔ اس کام کے لیے جس طرح کسی مکان کے بنانے کے لیے عمارتی مواد کی ضرورت ہوتی ہے خلیاتی مواد کام نہیں آتے اور حقیقت یہ ہے کہ یہاں پر عمارتی تعمیرات کا مسئلہ نہیں۔ اگرچہ جس طرح مکان اینٹوں سے تیار ہوتا ہے اسی طرح جسم بھی خلیوں سے بنتا ہے۔ لیکن ساخت کے لحاظ سے چونکہ دونوں آپس میں ملتے جلتے ہیں، لہٰذا مثال کے لیے ہم مکان کی مثال پیش کرتے ہیں جو صرف ایک اینٹ سے بنایا جائے۔ وہ اینٹ ایسی ہو کہ جو دریا کے پانی، اس کے معدنی نمک اور فضا میں موجود گیسوں سے دوسری اینٹیں از خود تیار کرے پھر کسی انجینئر اور راج کی موجودگی کے بغیر ان اینٹوں کو ایک دوسرے پر رکھے۔ دیواریں اُٹھائے پھر اُنہیں کھڑکیوں کے لیے شیشوں کی صُورت میں تبدیل کرے۔ خلاصہ کلام اعضاء کی ساخت پریوں کے ان افسانوں سے ملتی جلتی ہے جو بچوں کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔"[۲]

خلیّوں کے مواد اور تعداد کا فرق:

خلیّوں کی تقسیم اور ایک خلیہ سے تمام بند کی تشکیل ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اور اہم مسئلہ بھی ہے اور وہ یہ کہ ہر ایک عضو کے خلیّوں کی تعداد اور مواد دوسرے عضو کے خلیوں کی تعداد اور مواد سے مختلف ہیں۔ مثلاً کلیجہ اور کان کا پردہ ہر ایک خلیّوں سے بنائے گئے ہیں لیکن جو مواد جگر کے لیے استعمال ہوا ہے وہ کان کے پردے کے مواد سے مختلف ہے۔ اور پھر خلیّوں کی جو تعداد جگر کی ساخت کے لیے کام آتی ہے وہ کان کے پردوں کی تعداد سے کئی درجے زیادہ ہے، اسی طرح انسان کا مغز اور آنکھ کے ڈھیلے پر شفاف جھلی، دونوں، خلیوں سے بنائے گئے ہیں، لیکن مغز کے خلیّوں اور ترکیبی مواد کا آنکھ کی جھلی کے خلیّوں اور مواد میں بہت فرق ہے۔ اور ان کی تعداد بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ آخر کون سی ایسی عاقل اور صاحب ادراک قوت ہے۔ جو خلیوں کی تقسیم کے پس پردہ موجود ہے؟ اور خلیوں کی ترکیبی مواد اور ساخت ہوتی ہے اتنا ہی اُسے دیتی ہے نہ کم نہ زیادہ۔ غرض ہر پہلو کو مدنظر رکھ کر حساب وکتاب اور اندازے کے مطابق تقسیم کی گئی۔

---

[۱] انسان ناشناختہ ص ۱۰۳

[۲] انسان ناشناختہ ص ۱۰۳

اعضاءواعصاب کی ہمکاری:

تیسرا یہ کہ ہمکاری اور ہم بستگی صرف بدن کے مختلف اعضا ہی کے درمیان موجود نہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عضو کی مختلف قسمیں بھی ایک مقررہ ہدف کے لیے اپنی تمام قوتیں یکجا کر لیتی ہیں۔ مثال کے طور آنکھ ہی کو لے لیجئے۔ جب مغز اپنے اندر موجود مواد کو بینائی کے اعصاب اور آنکھ کے پردے کی اندرونی طرف روانہ کرتا ہے تو جلد کا وہ حصہ جو آنکھ کی اگلی سطح پر واقع ہے جسے کارینا Vesicule کہتے ہیں وہ صاف وشفاف اور عدسی صُورت اختیار کر لیتا ہے۔ صُورت حال کی یہ تبدیلی ''ویژوول بینائی Optique یعنی آنکھ کے اس حصّہ سے ترشح کی وجہ سے ہوتی ہے جس کا مغز کے ساتھ تعلق ہوتا ہے، لیکن یہ تفسیر مقصد کے حل کرنے میں معاون ثابت نہیں ہوسکتی۔ ہمیں یہ بات معلوم نہیں کہ ویژوول بینائی جو ایک خاص مادہ ہے وہ خُون میں کیونکر ٹپکتا ہے جس سے جلد شفاف ہو جاتی ہے اور وہ کیونکر جلد کی حساس، عصبی سطح کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ زندہ عدسہ کی صُورت اختیار کر لے اور اس سے نُور اندر داخل ہو اور بیرونی دُنیا کی چیزوں کی تصویروں کو اپنے اندر جگہ دے کر محفوظ کر لے۔ ہم اس قسم کی ہم آہنگی کو دیکھتے تو ہیں لیکن اس کی وجوہات کو نہیں سمجھ سکتے کہ اس کی توجیہہ کریں۔''[1]

خلیّوں کی ہدایت تکوینی:

آج کی علمی دُنیا تو یہ کہتی ہے کہ جسم کے مختلف خلیے جانوروں کی مختلف قسموں کی مانند ہیں اپنی ایک مخصوص ساخت کے حامل ہیں۔ ہر نوع اللہ تعالیٰ کی تکوینی ہدایت کی وجہ سے اپنے فرائض کو پہچانتی اور اپنے فطری راستوں پر گامزن ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب نسلی خلیے شکم مادر میں جاگزیں ہو جاتے ہیں تو وہ کون سی ایسی باشعور اور بافہم طاقت ہے جو ان کی تقسیم کی نگرانی کراتی ہے؟ کون سی طاقت ان کے نظم ونسق اور حساب وکتاب کی پڑتال کرتی ہے؟ کون سی ایسی قدرت ہے جو خلیّوں کی تعداد کا اندازہ لگاتی اور جس نوع کے لیے جس قدر خلیّوں کی ضرورت ہے اسی تعداد سے اُسے تقسیم کرتی ہے؟ ایسے میں کون سی ایسی عالم اور صاحبِ حکمت طاقت ہے جو مختلف خلیّوں کی مختلف قسموں کے درمیان ضروری مواقع پر ہم آہنگی اور ہم بستگی ایجاد کرتی ہے۔ اُنہیں ایک دوسرے سے تعاون پر آمادہ کرتی ہے اور اس طرح انسانی زندگی کی حفاظت کرتی ہے؟ سائنس کے پاس ان سوالوں کے تسلی بخش جواب نہیں ہیں۔ لیکن مکتب انبیاء ان سوالات کے قانع اور تسلی بخش جواب دیتا ہے اور باشعور، صاحب ارادہ واختیار اور آگاہ فرشتوں کو خلیّوں کی پیچیدہ دُنیا

---

[1] انسان ناشناختہ ص ۱۹۱

سمیت کائنات کے امور کو چلانے کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔

عالمی سطح پر تولیدات کا موازنہ:

ایک اور اہم مسئلہ جو نہایت ہی توجہ کا مستحق ہے اور انسان کی توجہ کو انسانوں اور جانوروں کی آفرینش کی طرف مبذول کراتی ہے وہ ہے عالمی سطح پر نر اور مادہ کی پیدائشی سطح کے درمیان توازن اور تعاون کی برقراری جو عالمی سطح پر انسان کے لڑکے اور لڑکیوں اور جانوروں کے نر اور مادہ کے درمیان موجود ہے۔ جو مرکز پُوری سوجھ بُوجھ کے ساتھ اس توازن کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور عالمی سطح پر انسانی اور حیوانی تولیدات کے اعداد و شمار کو کنٹرول کرتا ہے وہ کہاں ہے؟ وہ کون سی ایسی قدرت ہے جو تاریخ کے مختلف ادوار میں اس تناسب کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور انسانوں میں مرد اور عورت اور جانوروں میں نر و مادہ کے توازن کو بحال کیے ہوئے ہے۔؟

نر اور مادہ کے جنسی خلیّے:

ہمیں ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا کہ ہماری جنسی اور شعوری ساخت میں جنسی خلیّے اور جینز کے مرکزی حصے جو ہمیں آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملتے ہیں کیونکر اپنا حصّہ حاصل کرتے ہیں؟ اور کسی فرد کی ساخت حدود تک تخم کے ساتھ وابستہ ہے۔ جنین کی جنس نر و مادہ کے خلیوں کے ملاپ کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے متعین ہوجاتی ہے۔ وہ کون سا تخم ہے جو آئندہ کے لیے لڑکا بنے گا جس کا لڑکی کے تخم سے ایک کروموسوم کم ہوتا ہے؟ اور کون سا لڑکی بنے گا؟ اسی کیفیت کی بنا پر مرد کے جسم کے خلیّے عورت کے جسم کے تمام خلیّوں سے مختلف ہوتے ہیں۔"[1]

آیا یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ دو حصّوں میں نسلی تخم کی تقسیم بے شعور اتفاق کی پیداوار ہے جس سے لڑکا اور لڑکی پیدا ہوتے ہیں اور لڑکی کے تخم میں لڑکے کے تخم سے ایک کروموسوم زیادہ ہوتا ہے۔ اور بے شعور اتفاق تاریخ کے تمام ادوار میں یہ حکمت بھرا عمل دیتا چلا آرہا ہے اور سارے جہان میں زن و مرد اور نر مادہ کے توازن کو برقرار رکھے ہوئے ہے؟

تولیدات کے توازن کی برقراری:

آیا یہ بات قابل قبول ہے کہ عالمی سطح پر اس تناسب کی حفاظت خلیّوں کی اپنی ذاتی صفات کے بل بوتے پر ہے؟ اور یہ نسلی تخم ہی ہوتے ہیں جو اپنی فطری خصوصیات اور طبعی صفات کی وجہ سے ساری کائنات میں اپنا رابطہ اور ہم آہنگی

---

[1] انسان ناشناختہ ص ۲۴۳

برقرار رکھے ہوئے ہیں اور صدیوں سے انسانوں کے اندر لڑکے اور لڑکی کے اور جانوروں کے اندر نر اور مادہ کے توازن کو سنبھالے ہوئے ہیں؟

آیا سائنس اس بات کا جواب دے سکتی ہے کہ کون سی ایسی حساب دان طاقت ہے جو ساری کائنات میں انسانی اور حیوانی تولیدات کو مدِنظر رکھے ہوئے ہے؟ اور مکمل سوجھ بوجھ کے ساتھ نسلی تخم کو نر اور مادہ پیدا کرنے والے دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے جس سے تمام ملکوں میں عورتوں اور مردوں کا توازن برقرار ہے؟

فرشتے یا خدائی رابطے:

اسلامی مکتب کے پیروکار اپنی دینی تعلیم کے پیشِ نظر یہ کہتے ہیں اور نا قابلِ فہم طاقت جو نسلی تخم کو لڑکی اور لڑکا بنانے والے دو گروہوں میں تقسیم کرتی ہے اور تولیدی توازن کو برقرار رکھے ہوئے ہے وہ صاحب عقل و ادراک فرشتے ہیں جو خالق اور مخلوق کے درمیان واسطہ اور رابطہ کا کام دیتے ہیں۔ محکم خالق کے تحت تمام کائنات میں تقسیم اُمور کے ذمہ دار ہیں۔ خداوندِ عالم نے قرآن پاک میں ان کا نام لے کر قسم اُٹھائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَالْمُقَسِّمَاتِ اَمْراً ''یعنی ان فرشتوں کی قسم جو خدا کی طرف سے کائنات کے اُمور تقسیم کرتے ہیں۔[1]

انسانی عضو کی نارسائی:

تو اس تمام بحث اور گفتگو کا نتیجہ یہ کہ عالمِ آخرت پر یقین رکھنے کی طرح فرشتوں کے وجود پر ایمان لانا بھی قرآن وحدیث کی رُو سے ہے۔ انسانی عقل و خرد اس کی نفی یا اثبات میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی البتہ جس طرح انسانی فطرت ہے کہ وہ حیات ابدی کو دوست رکھتی ہے اور اسی سے قیامت کے وجود اور آخرت کی حیاتِ ابدی کی تائید ہوتی ہے اس طرح آفرینش کے بعض اسرار جو سائنسی ترقی کی وجہ سے آشکار ہوئے ہیں فرشتوں کے وجود کی تائید کرتے ہیں اور اس حقیقت کو تقویت بخشتے ہیں کہ اس ظاہری دُنیا کے پس پردہ کچھ ایسی ان دیکھی مخلوقات ہیں جو کائنات کے اُمور کی تقسیم اور تدبیر کی ذمہ دار ہیں۔ اور کائنات کے تخلیقی نظام کو علم و آگاہی اور ارادہ و اختیار سے چلا رہی ہیں اور مکتبِ اسلام ایسی ان دیکھی مخلوق کو ''ملائکہ'' کا نام دیتا ہے۔

موت و حیات کا اصلی مالک:

مکتب اسلام میں جو اُمور ملائکہ کی طرف منسوب ہیں اور وہاں پر فرشتوں کا نام آتا ہے۔ ان میں سے ایک اور مسئلہ

---

[1] سُورہ ۱۵۔ آیت ۴

ارواح کے قبض کرنے اور اُنہیں اس جہاں سے دائمی جہان کی طرف منتقل کرنے کا بھی ہے، اس بارے میں بہت سی آیات اور بے حد روایات ملتی ہیں۔ جن میں سے بعض کی طرف یہاں پر اشارہ کیا جاتا ہے۔

نظام آفرینش میں موت اور زندگی دو اہم تکوینی اُمور ہیں جن کا اصلی اور حقیقی مالک تو خود اللہ ہی ہے جو طبیعت (نیچر) کے بے جان عناصر کو زندگی عطا کرتا ہے، مردہ مواد کو زندہ کرتا ہے اور وہی خود زندہ مخلوق کو موت دیتا اور زندگی کی توانیاں ان سے سلب کر لیتا ہے۔ قرآن مجید اس بارے میں کہتا ہے:

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢﴾

یعنی آسمانوں اور زمین کا حقیقی مالک وہی ہے وہی زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے‘[1]‘

موت کے فرشتے کی ذمہ داری:

ملک الموت اور اس کے اعوان وانصار کا رُوح قبض کرنے میں اوّلین اور اصلی کردار نہیں ہے بلکہ وہ ثانوی طور پر خدا اور مخلوق کے درمیان واسطہ ہیں اور یہ فریضہ اُنہیں خداوند عالم کی طرف سے تفویض ہوا ہے۔ اسی لیے خداوند عالم قرآن مجید میں قبض رُوح کی نسبت کبھی تو اپنی طرف دیتا ہے، کبھی ملک الموت کا کام بتاتا ہے اور کبھی چند فرشتوں کی طرف منسوب کرتا ہے۔ جیسا کہ:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا

’’یعنی یہ خدا ہی ہے جو موت کے وقت لوگوں کی ارواح کو قبض کرتا ہے۔‘[2]‘

موت اور خدا کی طرف بازگشت:

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿١١﴾

’’یعنی اے پیغمبر گرامی! لوگوں سے کہہ دیجئے کہ موت کا جو فرشتہ تمہاری رُوح کو قبض کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے، تمہاری جان لیتا ہے پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹ جاؤ گے۔‘[3]

---

[1] سورہ ۵۷ آیت ۲

[2] سورہ ۳۹، آیت ۴۲

[3] سورہ ۳۲ آیت ۱۱

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ تَوَفَّتۡہُ رُسُلُنَا وَھُمۡ لَا یُفَرِّطُوۡنَ﴿۶۱﴾

''یعنی جب کسی کی موت کا وقت پہنچ جاتا ہے تو ہمارے فرشتے جو ہمارے ایلچی ہیں اس کی رُوح کو قبض کر لیتے ہیں اور وہ اس بارے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔''[۱]

الَّذِیۡنَ تَتَوَفّٰىھُمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ طَیِّبِیۡنَ ۙ یَقُوۡلُوۡنَ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمُ ۙ ادۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ﴿۳۲﴾

''یعنی متقی وہ لوگ ہیں کہ رحمتِ الٰہی کے فرشتے ایسی حالت میں ان کی رُوح کو قبض کرتے ہیں جن کی زندگی پاکیزگی اور سچائی کے ساتھ گزری ہے۔ وہ اُنہیں کہتے ہیں تم پر سلام ہو، بہشت میں داخل ہو جاؤ کیونکہ یہی تمہارے اچھے اعمال کی جزا ہے۔''[۲]

ایک زندیق کو حضرت علیؑ کا جواب:

پہلی آیت میں خدا کو قابض ارواح بتایا گیا ہے، دوسری آیت میں ملک الموت کو اور دوسری چند آیات میں قبض رُوح کی نسبت فرشتوں کے ایک گروہ کی طرف دی گئی ہے۔ ایک زندیق نے آیات کے اس فرق کو آیات کے تناقض پر محمول کرتے ہوئے قرآن شریف پر اعتراض کیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس کے اعتراض کے جواب میں آیات قرآنی سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا۔

''فھو تبارکؑ وتعالیٰ اجل واعظم ومن ان یتولیٰ ذالك بنفسه، وفعل رُسُله وملائکته فعله لانهم بامره یعلمون فاصطفی جعل ذکره من الملائکة رسولا وسفرة بینه وبین خلقه وھو الذین قال الله فیھم ''الله یطظفی من الملأئکة رسلا ومن الناس''(سُورہ ۲۳ آیه ۷۵) فمن کان من اھل الطاعة تولت قبض رُوحه ملائکة الرحمة ومن کان من اھل المعصیة تولی قبض روحه ملائکة النقمه والملکالموت اعوان من ملائکة الرحمة ومن کان میں اھل معصیة تولی قبض روحه ملائکة النقمه ولملك الموت اعوان

[۱] سُورہ ٦ آیت ٦١

[۲] سُورہ ١٦ آیت ٣٢

من ملائكة الرحمة والنمة يصدرون عن امره وفعلهم فعله وكل ماياتونه منسوب اليه واذا كان فعلهم فعل ملك الموت وفعل ملك الموت فعل الله لانه يتوفى الانفس على يد من يشاء ويعطى ويمنع ويثبت ويعاقب على يد من يشاء وان فعل امنانه فعله۔"

''یعنی خداوند عالم کی ذات اس بات سے اعلیٰ وارفع ہے کہ بذات خود کسی کی رُوح کو قبض کرے اور خدا کی طرف سے مامور فرشتے جو کام انجام دیتے ہیں وہ خدا ہی کا کام ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اسی کے فرمان کے مطابق عمل کرتے ہیں، خداوند عالم نے فرشتوں کے درمیان میں سے کچھ فرشتوں کو اپنے اور بندوں کے درمیان رُسول اور سفیر مقرر کیے ہیں اور اس تقرر کا قرآن مجید نے اعلان فرمایا ہے۔ جو لوگ اہل اطاعت ہوئے ہیں اُن کی رحمت کے فرشتوں کے ذریعہ قبض رُوح کی جاتی ہے اور جو گناہگار اور مصیبت کار ہوتے ہیں عذاب کے فرشتے ان کی رُوح قبض کرتے ہیں۔ ملک الموت کے ساتھ رحمت اور عذاب کے کچھ فرشتے اعوان وانصار کی صورت میں ہوتے ہیں جو اسی کا کام انجام دیتے ہیں اور اس کی بجائے خود رُوح کو قبض کرتے ہیں۔ اُن کا کام ملک الموت کا کام شمار ہوتا ہے اور وہ جو کام بھی انجام دیتے ہیں ملک الموت کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ بنابریں ملک الموت کے معاونین کا کام ملک الموت ہی کا کام شمار ہوتا ہے اور ملک الموت کا کام خدا کا کام شمار ہوتا ہے۔ اور خدا ہی ہے جو جس کے ذریعہ چاہے اپنے بندوں کی رُوح کو قبض کرے۔ جس کے ذریعہ چاہے و معاف کردے محروم کردے یا کسی کو سزا اور جزا دے۔ درحقیقت خدا کے امین بندوں کا کام ہی خدا کا کام ہوتا ہے۔''[1]

ایک دوسرے سے جُدا دو جہان:

مرنے سے پہلے کا جہان کہ ہم اب جس میں رہ رہے ہیں مرنے کے بعد کے جہان سے مختلف ہے جس میں ہم مرنے کے بعد جائیں گے۔ یہ دو مختلف اور ایک دوسرے سے جدا جہان ہیں۔ جب تک ہم اسی دُنیا کے اندر موجود ہیں مرنے کے بعد کے جہان سے بے خبر ہیں اور جب مرنے کے بعد اُس جہان میں منتقل ہو جائیں گے تو دُنیا سے کٹ جائیں گے، اور پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس عالم سے اُس عالم کی طرف انتقال بڑی جلدی اور مختصر سی مدّت میں انجام پاتا ہے۔ اور محتضر (مرنے والا)

[1] بحارالانوار جلد ۳ ص ۱۳۰

مرنے کے بعد ایک یا چند لمحوں میں اس دارِفانی کو الوداع کہہ کر جاودانی لیکن ان جانے عالم کی طرف قدم رکھے گا۔

خواب اور بیداری کا عالم:

ذہن کو قریب کرنے اور مطلب کو واضح کرنے کے لیے مرنے سے پہلے کی دُنیا عالمِ خواب سے اور مرنے کے بعد دوسرے عالم میں منتقل ہونے کو عالم بیداری سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، عالمِ خواب اور عالمِ بیداری دو مختلف اور متفاوت جہان ہیں۔سویا ہوا انسان اپنے خواب کے مشاہدات میں سرگرم ہے۔اور بیدار دُنیا اور بیدار لوگوں کی کائنات سے بالکل ناآگاہ اور بے خبر ہے۔وہ سونے کی حالت میں نہ تو بیدار عوام کو دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی اپنے اطراف میں گزرنے والے واقعات کو جانتا ہے۔لیکن جونہی اُسے پکارا جاتا ہے یا از خود بیدار ہوتا ہے تو ایک ہی لحہ میں آنکھ کھول کر عالمِ خواب اور خواب دیکھنے کی کیفیت سے بالکل منقطع ہو جاتا ہے اور بیدار لوگوں کی دُنیا اور زندگی کے عالم سے ملحق ہو جاتا ہے،جس طرح سویا ہوا انسان ایک ہی لمحہ میں آنکھیں کھول کر عالم خواب سے کٹ جاتا ہے اور عالم بیداری میں منتقل ہو جاتا ہے۔اسی طرح محتضر (مرنے والا شخص) پلک جھپکنے کے عرصہ میں اس دُنیائے فانی کے ماحول سے نکل کر عالم جاودانی میں جا پہنچتا ہے۔اور یہ تشبیہ احادیث کی کتابوں میں پیشوایانِ دین کے فرامین میں بھی بیان ہوئی ہے۔

"عنه علیه السلام الناس نیام اذا ماتوا انتبهوا"

''یعنی لوگ سوئے ہوئے ہیں جب مریں گے تو بیدار ہوں گے۔''[1]

بیداری کی پہلی علامت:

بیدار ہونے کی سب سے پہلی علامت جو ایک لحہ میں ظاہر ہوتی ہے اور انسان کو بتاتی ہے۔کہ نینداور خواب کو دُنیا سے بیدار ہو کر عالمِ بیداری اور زندوں کی دُنیا میں منتقل ہو چکا ہے۔آنکھ کا کُھلنا،افراد،اشیاء کا دیکھنا اور خوشگوار اور ناخوشگوار مناظر کا مشاہدہ کرنا ہے۔

خدا سے مُلاقات کی محبت کا کیا معنی ہے:

جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ محتضر (مرنے والے) کے لیے بھی دُنیا سے انتقال اور عالم بعداز مرگ میں ورود یہ سب کچھ ایک لحہ یا اس سے بھی کم عرصہ میں وقوع پذیر ہوتا ہے اس کی سب سے پہلی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ عالم

---

[1] لئالی الاخبار ص ۳۸۶

غیب کے مناظر اور رحمت یا عذاب کے آثار کو مشاہدہ کرتا ہے۔ چنانچہ عبدالصّمد بن بشیر حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام کے کسی صحابی سے روایت کرتا ہے کہ:

"قلت اصلحك الله من احب لقاء الله احب الله لقائه، ومن ابغض لقاء الله ابغض الله لقائه؟ قال نعم! قلت فوالله انا لنكره الموت! فقال ليس ذالك حيث تذهب انما ذالك عند المعاينة از ارای مايحب فليس شيیء احب اليه من ان يتقدم والله تعالىٰ يحب لقائه وهويحب لقاء الله حيئنذٍ وازارای مايكره فليس شيئٍ ابغض اليه من لقاءِ الله والله يبغض لقائه۔"

"یعنی میں نے آپ سے پُوچھا کہ آیا یہ بات صحیح ہے کہ جو شخص خدا کی ملاقات کو پسند کرتا ہے خدا بھی اُس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے؟ اور جو شخص اس کی ملاقات کو اچھا نہیں سمجھتا خدا بھی اس کی ملاقات کو اچھا نہیں سمجھتا؟ امام نے فرمایا ایسا ہی ہے! میں نے کہا ہم موت کو اچھا نہیں سمجھتے جو خدا سے ملاقات کا ذریعہ ہے، پھر تو خدا بھی ہمیں دوست نہیں رکھتا ہوگا۔ امام علیہ السّلام نے فرمایا بات وہ نہیں ہے جس کی طرف تمہارا ذہن گیا ہے اور تمہاری فکر نے رسائی حاصل کی ہے! یہ محبت اور نفرت تو اس لمحہ سے متعلق ہے جسے محتضر (مرنے والا) مرنے کے بعد کے عالم میں دیکھتا ہے اگر تو نیک لوگوں سے ہے اور خوشگوار اور دلپذیر مناظر کو دیکھتا ہے دُنیا کی کوئی چیز اس کے نزدیک اس بات سے اس قدر محبوب نہیں ہوتی کہ وہ وہاں جلد پہنچنے کی کوشش کرے اور مشاہدہ شدہ چیز کو جتنا جلدی ہو سکے پالے۔ ایسے شخص کی ملاقات کو خدا بھی پسند کرتا ہے۔ لیکن اگر مرنے والا بے ایمان اور گناہگار ہے اور عذاب کے مناظر کو دیکھتا ہے تو اس کے نزدیک خدا کی مُلاقات سے بڑھ کر اور کوئی چیز قابلِ نفرت نہیں ہوتی، لہٰذا خدا کو بھی اس کی مُلاقات سے دُشمنی ہوتی ہے۔"[1]

دُنیا میں خودسازی کرنا:

مکتب اسلام کی تعلیمات کے مطابق انسان کے لیے یہ دُنیائے فانی، فرائض کی انجام دہی اور خودسازی کا گھر اور اسلامی و انسانی فرائض کی بجا آوری کا مقام ہے اور عالمِ آخرت حساب و کتاب کا گھر اور خدا کی جزا و سزا کا ماحول ہے۔ اسی

[1] کافی جلد ۳ ص ۱۳۴

بات کو حضرت علی علیہ السلام نے یُوں ارشاد فرمایا ہے۔

"وان الیوم عمل ولا حساب وغداً حساب ولا عمل۔"

''یعنی آج عمل کا دن ہے حساب کا نہیں اور کل حساب کا دن ہوگا عمل کا نہیں۔''[1]

دنیاوی زندگی کا آخری مرحلہ:

آج کو کل سے، دُنیا کو آخرت سے فرائض کی انجام دہی کے گھر کو سزا و جزا کے گھر سے جُدا کر دینے کی مدّت ایک لمحہ سے زیادہ نہیں۔ یہی وقت ہوتا ہے جب مرنے والے کی آنکھوں سے پردے ہٹا دیے جاتے ہیں، ان دیکھا عالم دکھائی دینے لگتا ہے اور رُوح اپنی آخرت کی منزلوں میں پہنچ جاتی ہے۔ جو شخص اس لمحہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کی دنیاوی زندگی کی بساط لپٹ جاتی ہے۔ عمل کی فرصت ختم ہوجاتی ہے، فرائض کی بجا آوری کے دن پورے ہوجاتے ہیں، محاسبہ کا وقت پہنچ جاتا ہے اور سزا و جزا کا زمانہ شروع ہوجاتا ہے۔

"عن ابی بصیر ابی جعفر علیه السلام: قال کنا عنده وعندحمران اذ دخل علیه مولی له فقال جعلت فداك عکرمة فی الموت وکان یریٰ رای الخوارج وکان منقطعاً الی ابی جعفرؑ۔ فقال لنا ابوجعفر انظر ونی حتی ارجع الیکم فقلنا نعم، فمالبث ان رجع فقال، اما انی لو ادرکت عکرمة قبل ان تقع النفس موقعها لعلتمه کلمات ینتفح بها ولکنی ادرکته وقد وقعت النفس موقعها، نقلت جعلت فداك وما ذاكَ الکلام؟ قال هود والله ما انتم علیه فلقنوا موتاکم شهادة ان لا اله الا الله والرلایة۔"

''یعنی ابو بصیر کہتے ہیں اور کچھ دوسرے ساتھی حضرت امام محمد باقر علیہ السّلام کے حضور میں بیٹھے ہوئے تھے اور حمران بھی ہمارے ہی ساتھ تھے کہ اچانک امام علیہ السلام کا ایک نوکر داخل ہوا اور آ کر بتایا کہ عکرمہ احتضار کی (مرنے کی) حالت میں ہے اور زندگی کے آخری لمحات گزار رہا ہے۔ عکرمہ وہ شخص تھا جو خوارج کے نظریات اور عقائد کی حمایت کرتا تھا، لیکن امام محمد باقر علیہ السلام کی طرف بھی باطنی جھکاؤ رکھتا تھا۔ جونہی امامؑ نے یہ بات سُنی اُٹھ کھڑے ہوئے اور ساتھیوں سے فرمایا مجھے اجازت دو تاکہ میں ہوکر

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۴۲

آ جاؤں، یہ کہا اور جلدی سے باہر چلے گئے، لیکن تھوڑی ہی دیر میں واپس آ گئے اور فرمایا اگر میں بروقت پہنچ جاتا اور اس کی رُوح اپنے روحانی مقام اور مرنے کے بعد کے عالم میں نہ پہنچی ہوتی تو میں اُسے چند کلمات تعلیم دیتا جن سے اسے فائدہ پہنچتا، لیکن میں نے اُسے اس وقت دیکھا جب اس کی رُوح دُنیاوی سرحدوں کو پار کر کے روحانی حدود میں پہنچ چکی تھی (ابو بصیر کہتے ہیں) میں نے عرض کی آپ اُسے کون سے کلمات تعلیم دینا چاہتے تھے؟ تو امام نے فرمایا، بخدا وہی جن کا تم عقیدہ رکھتے ہو، یعنی میں چاہتا تھا کہ اُسے ولایت علیؑ کے بلند مقام و مرتبہ کی جانب متوجہ کراؤں اور خوارج جس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اُس سے اُسے باخبر کرتا! تا کہ وہ خوارج کے باطل عقیدہ چھوڑ دے اور اپنے اندر حضرت علیؑ کے بارے میں جو غلط نظریہ رکھتے ہیں اُسے چھوڑ دے اور دُنیا کو پاک و پاکیزہ دل کے ساتھ خیر باد کہے۔ پھر امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا تم اپنے دوستوں اور دینی بھائیوں کو کلمہ توحید و ولایت کی تلقین کیا کرو۔‘‘[1]

فرشتوں کا دیدار:

مرنے والا، انتقال کے ابتدائی مراحل میں جو کہ دنیاوی زندگی کے خاتمہ اور اخروی حیات کے آغاز کی علامتیں ہیں، جو چیزیں ملاحظہ کرتا ہے ان میں سے ایک فرشتوں کا دیدار بھی ہے، جو خدا کی طرف سے رُوح قبض کرنے پر مامور ہوتے ہیں۔ جب تک انسان دُنیا میں زندہ رہتا ہے اور اشیاء عالم کو اپنی دُنیاوی آنکھوں سے دیکھتا ہے، فرشتوں کی دُنیا سے بے خبر ہوتا ہے۔ ملک الموت اور اس کے ساتھیوں کو نہیں دیکھ سکتا۔ اُن کی آمد و رفت سے بے خبر ہوتا ہے اور رُوح قبض کرنے کی کیفیت سے بھی لاعلم ہوتا ہے۔

جنین کا قبض رُوح:

اسی سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

’’هل تحس به از ادخل لا امر هل تراه اذا توفیّٰ احداً؟ بل کیف یتوفی الجنین فی بطن امه ایلج: علیه من بعض جوارحها ام الروح اجابته باذن ربها ام هو ساکن معه فی احشائها؟‘‘

---

[1] کافی جلد ۳ ص ۱۲۳

''آیا جب موت کا فرشتہ کسی گھر میں آتا ہے تو تم اسے محسوس کرتے ہو؟ آیا جب وہ کسی کی روح کو قبض کرتا ہے تو تم اسے دیکھتے ہو؟ ملک الموت جنین کی رُوح کو کیسے قبض کرتا ہے؟ آیا وہ ماں کے کسی عضو کے ذریعہ سے اندر جاتا ہے؟ یا جنین کی رُوح حکمِ خدا سے ملک الموت کے بلاوے پر باہر آجاتی ہے؟ یا موت کا فرشتہ بچہ کے رحمِ مادر میں موجود ہوتا ہے۔؟''[۱]

مرنے والا روحانی دباؤ کا شکار ہوتا ہے:

مرنے والا جب ملک الموت کو دیکھتا اور مرنے کے بعد کے عالم کو ملاحظہ کرتا ہے تو اُسے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کی زندگی کی بساط لپیٹی جاچکی ہے اور اُخروی جہان کی سرحد پر پہنچ چُکا ہے، تو اس موقع پر وہ سخت پریشان اور مضطرب ہوتا ہے اور زبردست رُوحانی دباؤ کا شکار ہوتا ہے۔ دینی پیشواؤں سے بیان ہونے والی روایات کے مطابق انسان پر یہ گھڑی نہایت ہی سخت اور دشوار ترین گھڑیوں میں سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اشد ساعات بن ارم ثلاث ساعات، الساعة التی یعاین فیها ملك الموت والساعة التی یقوم فیها من قبره والساعة التی یقف فیها بین یدی الله تبارك وتعالیٰ فاما الی الجنة واما الی النار۔"

''یعنی اولادِ آدم پر تین نہایت ہی سخت اور کٹھن مرحلے آتے ہیں، پہلا اس وقت جب وہ ملک الموت کو دیکھتا ہے، دوسرا اس وقت جب اپنی قبر سے اُٹھے گا اور تیسرا اس وقت جب اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوگا پھر یا تو جنت میں جائے گا یا جہنم میں۔''[۲]

گناہگاروں کی توبہ:

گناہگاروں کی توبہ کی قبولیت اور ان کے گناہوں کی بخشش بندوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی مہربانیوں میں سے ہے۔ تمام انبیاء نے گناہگاروں کو توبہ واستغفار کی تعلیم دی ہے۔ اُنہیں خدا کی بخشش کی خوشخبری دی ہے اور گناہوں کی معافی کی امید دلائی ہے، تاکہ وہ کسی وقت رحمتِ الٰہی سے مایوس ہوکر اس کے فیضِ رحمت سے محروم نہ ہوجائیں۔

---

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۱۲

[۲] خصال صدوق ص ۱۱۹

افکارواعمال کی اصلاح:

ہم جانتے ہیں کہ جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے تو ایک طرف تو اس کا باطن تاریک اور ضمیر آلودہ ہوجاتا ہے۔اور دوسری طرف اپنے ناپاک افکار کو عملی جامہ پہناتا اور عملاً گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔بنابریں یہ کہنا چاہیے کہ توبہ افکار اور اعمال دونوں کی اصلاح کرتی ہے اور جو شخص توبہ کرنا چاہتا ہے اُسے سب سے پہلے اپنے دل کو پاک کرنا چاہیے، اپنی سابقہ سرپیچیوں اور بدعملیوں سے بارگاہ رب العزت میں معذرت کرنی چاہیے اور آئندہ کے بارے میں بھی اس کا یہی قصد ہو کہ پھر کبھی گناہ کے بارے میں نہیں سوچے گا اور گناہ کے افکار سے اپنے باطن کو آلودہ نہیں کرے گا۔دوسرے مرحلہ پر اس بات کا خاص خیال رکھے کہ عملی طور پر گناہوں کا ارتکاب نہیں کرے گا گناہوں کی محفلوں میں نہیں جائے گا۔لااُبالی اور بدقماش لوگوں سے میل جول نہیں رکھے گا، نفسانی خواہشات کی رسی ڈھیلی نہیں چھوڑے گا اور اپنے اعضاو جوارح کو خدا کی نافرمانی کے لیے کام میں نہیں لائے گا۔

ضمیر کی پاکیزگی اور گناہ سے بچاؤ:

ایک قابلِ توجہ نکتہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ظاہری اور جسمانی اعمال ہمارے باطنی اور روحانی فرمان کے ماتحت انجام پاتے ہیں۔جو شخص ریاضت اور کوششوں کے ذریعے اپنے نفس کو رام کرتا ہے، گناہ کی سوچ کو اپنے دل سے دور کردیتا ہے اور اپنے ضمیر کو پاک اور منزہ بنادیتا ہے تو اُس کے اعضاء وجوارح بھی مجبوراً گناہ سے بچ جاتے ہیں کیونکہ بدن ''فاعل بالتسخیر'' ہے۔یعنی جب تک مرکز سے ارتکاب گناہ کا حکم دریافت نہ کرے، اس وقت تک کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا اور نہ ہی گمراہی اور آلودگیوں کی طرف رغبت پیدا کرتا ہے۔لیکن اس بات کی طرف بھی دھیان رہے کہ اس بچاؤ کی بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان اپنے ارادہ کی کمزوری اور لغزش کے اسباب خود فراہم نہ کرے، ہاتھوں کو گناہ کی طرف نہ بڑھائے اور آنکھوں کو گناہ کے مناظر نہ دکھائے، کیونکہ جس طرح نفس، بدنی اعمال کی اچھائی اور بُرائی میں موثر ہوتا ہے اسی طرح جسمانی اعمال بھی نفس کے جائز وناجائز ارادوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ؎

زدست دیدہ ودل ہر دوفریاد
کہ ہرچہ دیدہ بیند دل کندیاد

(یعنی آنکھ اور دل دونوں سے بچو، کیونکہ جو کچھ آنکھ دیکھتی ہے دل اُسے یاد کرلیتا ہے)

گناہوں پر پشیمانی اور سعادت کا حصول:

بنابریں جو شخص صحیح معنوں میں توبہ کرتا ہے تو وہ اپنے تمام وجود کی گہرائیوں سے اپنے گذشتہ گناہوں سے شرمساری اور ندامت کا اظہار کرتا ہے، خدا کی بارگاہ سے معافی مانگتا ہے اور آئندہ کے لیے بھی خود کو اطاعتِ الٰہی کا پابند سمجھتا ہے۔ اگر اپنے اس عہد و پیمان پر ثابت قدم رہتا ہے تو اس کی بقیہ زندگی خواہ کتنی ہو سلامتی اور سعادت کے ساتھ گزرتی ہے۔ اور اگر یہ رُوحانی صُورتحال مرض الموت میں پیدا ہوتی ہے اور مرنے سے چند روز یا چند گھنٹے یا چند منٹ حتّٰی کہ چند لمحات پہلے یعنی جب جان لبوں تک پہنچ جائے اور موت کے فرشتے کو بھی دیکھ لے اور توبہ کرلے تو وہ اپنے گناہوں سے پاک صاف ہو کر صحیح اور نورانی دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور میں جا پہنچے گا۔ جیسا کہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

مرنے سے پہلے حقیقی توبہ:

"من تاب قبل موته بسنة قبل الله توبة، ثم قال السنة لكثير، من تاب قبل موته بشهر قبل الله توبته، ثم قال ان الشهر لكثير، من تاب قبل موته بجمعة۔ ثم قال ان جمعة لكثير، من تاب قبل موته بيوم قبل الله توبته، ثم قال ان يوما لكثير من تاب قبل ان يعاين قبل الله توبته۔"

"یعنی جو شخص مرنے سے ایک سال پہلے توبہ کرلے تو خدا اس کی توبہ کو قبول کرے گا۔ پھر فرمایا کہ ایک سال بہت ہے۔ جو ایک ماہ پہلے توبہ کرلے خدا اس کی توبہ قبول کرلے گا۔ پھر فرمایا ایک مہینہ زیادہ ہے جو ایک ہفتہ پہلے توبہ کرلے تو خدا اس کی توبہ قبول کرلے گا۔ پھر فرمایا ایک ہفتہ بھی زیادہ ہے، جو مرنے سے ایک دن پہلے توبہ کرلے اس کی توبہ قبول ہو جائے گی۔ آخر میں فرمایا ایک دن بھی زیادہ ہے، جو شخص ملک الموت کو دیکھنے سے پہلے توبہ کرے تو بھی باری تعالیٰ اُس کی توبہ قبول فرمالے گا۔"[1]

---

[1] مشکوٰۃ الانوار ص ۱۱۰

مجلس نمبر 4

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٨٥﴾ (قرآن مجید)

جب ہم موت کے بارے میں سوچتے ہیں اور زندگی کو خاطر میں لاتے ہیں تو سوچ میں پڑ جاتے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ موت ہمارے ساتھ کیا کرے گی اور مرنے کے بعد ہماری کیا حالت ہوگی؟ اگر اس بارے میں جستجو اور کاوش کریں اور تحقیق اور چھان بین کرنا شروع کریں تو کئی قسم کے طرز فکر کا سامنا کریں گے۔ ایک تو مادی فلاسفہ اور ماوراء طبیعت کے منکرین کا نظریہ ہے اور دوسرے خدا پرست فلاسفہ کا نظریہ جو روح کی بقا اور مرنے کے بعد کی زندگی کا نظریہ رکھتے ہیں۔ البتہ انہی خدا پرست فلاسفہ کا ایک اور گروہ بھی ہے جو رُوح کی بقاء کی تائید نہیں کرتے کیونکہ وہ بقاء رُوح کے نظریہ کے حامیوں کے دلائل کو قانع نہیں سمجھتے۔ اور پھر مکتب انبیاء اور انبیاء کی خدائی تعلیمات کے نظریہ کو بھی دیکھتے ہیں جو پُورے وثوق کے ساتھ وحی کے ذریعہ سے یہ اعلان کر چکے ہیں کہ مرنے کے بعد انسان کی رُوح ایک اور عالم کی طرف منتقل ہوجاتی ہے اور وہیں پر بعینہ زندہ اور پائندہ رہتی ہے۔ یہاں پر مطلب کی وضاحت کے لیے ان افکار اور نظریات کی مختصر طور پر تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

۱۔ مادی فلاسفہ تصور کرتے ہیں کہ کائنات کی تمام ہیت و بود صرف مادہ اور مادیات ہی میں منحصر ہے، نہ تو اس مادی دنیا میں کوئی غیر مادی وجود ہے اور نہ ہی مادی دُنیا کے ماورا کوئی اور دوسرا غیر مادی عالم ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس جہان میں انسان بھی کرۂ ارضی کی دوسری مخلوق کی مانند سو فیصد مادی مخلوق ہے۔ انسانی زندگی طبعی فعل و انفعال اور مادی عناصر کے تجزیہ و ترکیب کی معلول ہے اور اس کی موت بھی کُتے بلی کی سی موت ہے۔ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے تمام وجودی پہلو ختم ہوجاتے ہیں۔ اس کے سارے کے سارے اعضاء اور ظاہری و باطنی اجزاء رفتہ رفتہ تحلیل ہو کر طبعی ذخائر سے جا ملتے ہیں اور رُوح جاودانی کے نام سے اس کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

۲۔ خدا پرست فلاسفہ کائنات کو عالم مادہ میں منحصر نہیں سمجھتے اور نہ ہی مادی موجودات پر منحصر جانتے ہیں۔ وہ خالقِ کائنات کو مانتے ہیں جو مادہ کا بھی خالق ہے جس نے تمام عالم وجود کو ''ہستی'' کو خلعت سے نوازا ہے، اور اس کی مقدس ذات کو مادی عناصر اور طبعی نقائص سے منزہ و مبرا جانتے ہیں۔ انسانی روح کے بارے میں ان فلاسفہ کے دو گروہ ہیں۔

پہلا گروہ روحیون'' کا ہے جو علمی و فلسفی دلائل اور تجرباتی نفسیات شناسی کی وجہ سے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انسان کے اندر ایک جاودانی رُوح ہے جب انسان مرجاتا ہے اور اس دُنیا سے اُٹھ جاتا ہے تو اس کی رُوح ایک اور عالم میں منتقل ہوجاتی ہے اور اپنی ہمیشہ کی زندگی میں مشغول ہوجاتی ہے۔ ان فلاسفہ کا عقیدہ ہے کہ بقائے نفس کے اثبات اور رُوح بشر کی جاودانی زندگی کے لیے بہت سے دلائل ہیں، لیکن اُن کے عقیدہ کے مطابق انسان نے ابھی اس ناشناختہ راز سے پردہ اٹھایا ہے اور مستقبل میں مزید دلائل اور شواہد اصل کرے گا۔

کورسی مارلیسن کی باتیں:

''کورسی مارلیسن کہتے ہیں کہ: حیوانات کے درمیان سے عقلمند اور مفکر انسان کا ظاہر ہونا اس سے زیادہ اہم اور گہرا معاملہ ہے کہ ہم اس بات کا تصور کریں کہ اس کا ظہور مادی تغیرّ وتبدل کا نتیجہ ہے اور کسی خالق کا ہاتھ اس کی تخلیق میں داخل انداز نہیں ہے درگرنہ انسان ایک مکینیکل آلہ ہوگا جسے کوئی دوسرا ہاتھ چلا رہا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس مشین کو کون چلا رہا ہے؟ جو ہاتھ اسے متحرک کررہا ہے وہ کہاں ہے؟ آج تک سائنس اس کی تاویل نہیں کرسکی اور نہ ہی اسے پہچان سکی ہے۔ البتہ یہ نُکتہ مسلم ہے کہ خود اس چلانے والے کا وجود مادہ سے مرکب نہیں ہے۔''

''اب تک جو پیش رفت ہوئی ہے وہ صرف اس حد تک کہ ہم یہ تصّور کریں کہ خداوند عالم نے اپنی معرفت کی ایک تھوڑی سی جھلک ہم پر ڈالی ہے۔ اسی بنا پر ہم یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ خداوندِ عالم نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔''

''انسان اب بھی تخلیقی دُنیا میں بچپن کے دور سے گزر رہا ہے۔ اور اس کے ابدی پہلو سے واقفیت حاصل کررہا ہے۔''[1]

''لینڈ مین کہتے ہیں: ہر شخص کے اندر عقل جہان پنہاں ہے اور تمام افعال کی حقیقی محرک ہے، ہماری رُوح کا ہمارے ساتھ تعلق نہیں ہے بلکہ عقل جہان کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ عقل جہان سے جدائی عارضی ہے اور اس کی طرف ہر شخص کی بازگشت یقینی ہے۔''

ہمیشہ روشن چنگاری:

مسٹر MALEBRANCHE مدتوں کے مطالعہ کے بعد اس نکتہ کی یاد دہانی کراتے ہیں کہ ہماری رُوح اس چنگاری کی مانند ہے جو ازلی آگ کے الاؤ سے جدا ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک اپنی اصل تک نہ لوٹ جائے وہ کبھی نہیں بجھتی اور ہر موجود کی بازگشت اُسی کی طرف ہے۔''

---

[1] رازآفرینش انسان ص ۱۴۹

''بقاءروح کی تھیوری کے پیروکار کافی تعداد میں اور عظیم عقول نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی ہے۔ کہ جسم کے ساتھ رُوح نہیں مرتی بلکہ اُسے بقا حاصل ہے۔''[1]

کچھ فلاسفہ رُوح کی بقا کو نہیں مانتے:

خدا پرست فلاسفہ اور دانشوروں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بدن کے مرجانے کے بعد رُوح کی بقاء کو تسلیم نہیں کرتے اور نہ ہی اس نظریہ کی تائید کرتے ہیں۔ البتہ اُن کا یہ عقیدہ اس لیے نہیں کہ ماوراء مادہ کے عالم کو نہیں مانتے، بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ''روحیون'' کے دلائل اس بارے میں ناکافی ہیں، لیکن ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ ممکن ہے کہ مستقبل میں سائنسی پیش رفت کی وجہ سے جسم کے مرنے کے بعد رُوح کی بقا ثابت ہوجائے اور علم کسی کو اس کی نفی کی اجازت نہ دے۔

رُوح کی سربلندی اور بقا:

''مشہور و معروف دانشور خدا پرست جناب کارل تقریباً نصف صدی پہلے اپنی کتاب میں لکھ چکے ہیں کہ اب تک کوئی ایسی عملی دلیل نہیں ملی جو مرنے کے بعد روح کی بقا پر دلالت کرے۔ لیکن کوئی شخص یہ دعویٰ بھی نہیں کرسکتا کہ مستقبل میں کوئی ایسا علم وجود میں نہیں آئے گا جو اس کا اثبات کرے۔ ماوراء الطبیعۃ METAAPHYSICS علوم کی کیفیت کا مسلسل مطالعہ روحانی خصوصیات کی پہچان میں ہماری امداد کرے گا۔ جس طرح کسی مرض کے آثار کی تحقیقات اس بات کا سبب بن گئی کہ ہم نے بہترین NEUROPHYSIOLOGY کو پہچان لیا۔''[2]

باوجودیکہ منطق'' بدن کی مکمل فنا کو، روح کی بقاء سے بہتر قبول کرتی ہے، لیکن پھر بھی بہتر یہی ہے کہ ابدیت کے مفروضہ کو تسلیم کرلیں، کیونکہ فنائے شعور کی تفسیر اس کی بقاء کی برتری کس لیے ہے کہ جسے طبیعت بقائے نسل کے ساتھ انجام دیتی ہے؟ انفرادی زندگی کا انتہائی مقصد صرف یہی نہیں کہ نسل کو باقی رکھا جائے۔ کیونکہ زن و مرد میں تولیدی طاقت کے ختم ہوجانے کے بعد بھی کافی طویل عرصے تک ان کے درمیان روحانی برتری کے رشتے برقرار رہتے ہیں۔ اگر اس کے علاوہ کچھ اور ہوتا تو انفرادی یا نسلی ارتقاء فطرت وطبیعت کا مذاق بن کر رہ جاتا۔ زندہ مادہ نے صدیوں سے روحانی تجلّی کے لیے جو زبردست

---

[1] انسان شناس فلسفی ترجمہ ڈاکٹر صدر نبوی ص ۱۰۸

[2] راہ ورسم زندگی ص ۱۴۳

کوششیں جاری رکھی ہیں اگر جسم کے ساتھ انسان کی رُوح بھی ختم ہوجائے تو پھر یہ کوششیں بے معنی ہوں گی۔‘‘[1]

۳۔مکتب انبیاء کے نزدیک انسان دوحیثیتوں کی حامل مخلوق ہے ایک تو مادی اور جسمانی حیثیت اور دوسری معنوی اورروحانی حیثیت۔ مادی لحاظ سے وہ دوسرے حیوانوں کی مانند ہے ان جیسی زندگی بسر کرتا ہے۔ بچے پیدا کرتا ہے، جوان اور بوڑھا ہوتا ہے۔لذتوں اور تکلیفوں کو محسوس کرتا ہے انجام کار مرجاتا ہے۔اور کارگاہ تخلیق میں تحلیل ہوجاتا ہے۔

لیکن معنوی لحاظ سے اس کے اندر خدائی رُوح ہے جو انسانیت کا معیار اور عقل واختیار کی قرارگاہ جو حیاتِ ابدی کی حامل ہے۔انسان کے مرنے کے ساتھ ہی اس کے جسم سے جُدا ہوکر دوسرے عالم میں منتقل ہوجاتی ہے اور ایسے حالات میں زندہ رہتی ہے جن کی تفصیل ہم سے مخفی ہے، البتہ اپنی حیاتِ جاوید کو جاری رکھتی ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

’’الانسان خلق من شان الدنیا وشان الاخرۃ فازاجمع اللہ بینھما صارت حیاتہ فی الارض لانہ نزل من شان السمآء الی الدنیا فاذافرق اللہ بینھما صارت تلك الفرقۃ الموت تروشان الاخرھی الی السماء وذالك انہ یفرق بین الارواح والجسدفردت الروح النور الی القدس الاولیٰ القدس الاولیٰ وترك الجسد لانہ من شان الدنیا فیصیر رفاتا ویبلی ویرجع کل الی جوھرۃ الاول وتحرکت الروح بالنفس فما کان من نفس المومن فھونورموید بالعقل وما کان من نفس الکفافر فھونا موید بالنار فھذہ صُورۃنارفھذہ صورۃ نوراوالموت رحمۃ من اللہ لعبادہ المومنین ونقمۃ علی الکافر۔

’’یعنی انسان دُنیا کی شان اور آخرت کی شان سے پیدا کیا گیا ہے۔ جب خداوند عالم ان دونوں شانوں کو ملادیتا ہے تو کرۂ ارضی پر اس کی زندگی کے وسائل فراہم ہوجاتے ہیں کیونکہ اس کی آسمانی نشان دُنیا میں نازل ہوئی ہے۔ جب یہ دونوں شانیں ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہیں یعنی موت آجاتی ہے۔رُوح اور نور کو قدس اعلیٰ کی طرف لوٹادیتی ہے اور جسم جو کہ دُنیا کی شان ہے کہ کرۂ ارضی میں رہ

---

[1] راہ ورسم زندگی ص ۱۴۳

جاتا ہے، زمین میں منتشر ہوجاتا ہے، گل سڑ جاتا ہے اور اس کے مواد طبیعی مراکز سے ملحق ہوجاتے ہیں، لیکن رُوح اسی طرح متحرک اور پائیدار ہوتی ہے مومن کا نفس نوری ہوتا ہے اور عقل اس کی تائید کرتی ہے اور کافر کا نفس آتشی ہوتا ہے جس کی تائید شیطانی ہوش کرتا ہے پس یہ ناری صورت ہے اور وہ نُوری صورت ہے۔ اور موت مومنین کے لیے اللہ کی رحمت اور کفار کے لیے خدا کا عذاب ہے۔"[۱]

رُوح ناشناختہ حقیقت:

قرآن مجید نے آج سے چودہ سو سال پہلے روح کے بارے میں گفتگو کی ہے اور اس کا خدا سے متعلق ایک امر کے عنوان سے تعارف کرایا ہے اور صاف صاف بتا دیا ہے کہ انسان کی معلومات اس مخفی اور نامعلوم راز کے بارے میں نہایت ہی محدود اور کم ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾

"یعنی اے رُسول گرامیؐ، لوگ آپؐ سے رُوح کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو آپؐ اُن سے کہہ دیں کہ رُوح امرِ خدا سے ہے اور تمہیں اس بارے میں تھوڑے سے علم کے سوا اور کچھ نہیں دیا گیا۔"[۲]

موجودہ دور اور انسانی رُوح:

آج کے ترقی یافتہ دور میں رُوح کی گہرائی اور حقیقت کی شناخت کے بارے میں بھی دانشوروں کی صُورتِ حال وہی ہے جو زمانہ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تھی۔ نہ تو ماہرین نفسیات" اس چیز کی حقیقت سے آشنا ہوسکے ہیں جسے وہ "نفس" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور نہ ہی "روحیون" رُوح کی حقیقت تک رسائی حاصل کرسکے ہیں اور اسی چیز کو نفسیات کی کتابوں میں بڑی صراحت کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔

پیچیدہ اور لاینحل مسئلہ:

برطانوی ڈاکٹر اور ماہر نفسیات ڈاکٹر اولیسٹس چزرکہتے ہیں، بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے مغز کے مشینی اعمال

---

[۱] بحار الانوار جلد ۳ ص ۱۲۴

[۲] سورہ ۱۷، آیت ۸۵

کا مجموعہ اسی ''من'' یا ''میں'' یا ''خود'' کی تشکیل دیتا ہے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ وہ مغز کے ساتھ ساتھ ایک اسرار آمیز چنگاری بھی ہے جو موت کے وقت ہمارے جسم سے نکل جاتی ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ عظیم فلاسفہ نے اس کی رُوح، اس کی ماہیت اور بدن میں اس کے مقام کے بارے میں کافی غور وفکر سے کام لیا ہے۔ اسی طرح اس بارے میں بھی خوب غور کیا ہے کہ آیا وہ باقی ہے یا فانی! لیکن یہ پیچیدہ مسئلہ ابھی تک لاینحل ہے اور دانشور بھی تک اس کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''ان آخری چند سالوں میں بہت سے مفکرین نے یہ طے کیا ہے کہ اس کا دوسرے پہلو سے جائزہ لیں اور اس کا مطالعہ کریں۔ اور وہ یوں کہ رُوح کا مسئلہ چونکہ نہایت ہی پیچیدہ اور مبہم ہے، لہٰذا اسے ایک طرف کر کے صرف اور صرف ''ذہن'' یا ''نفس'' کے بارے میں تحقیق کی جائے جو جذبات، احساسات، عقائد وافکار کا مجموعہ ہے۔''[1]

وحی اور انبیاء کا کلام:

رُوح کی حقیقت جو بھی ہو، مادی اور الٰہی فلاسفہ اس کے نفی اور اثبات میں جو بھی دلائل دیں انبیاء کے مکتب پر اس کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور مکتب انبیاء کے سچے پیروکاروں کے ایمان کو ڈانواڈول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ تمام انبیاءؑ وحی کی روشنی میں تاریخی طور پر مسلسل اس بات کا اعلان کرتے آرہے ہیں کہ انسان مرنے کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اس کی روح عالمِ غیب اور ایسے جہان میں منتقل ہو جاتی ہے جسے ہم نہیں پہچانتے اور وہیں پر باقی اور جاوداں ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

"الروح لایوصف بثقل والاخفة وهی جسم رقیق البس قالبا کثیفا، قیل افتیلا شی الروح بعد خروجه عن قالبه امر هوباق؟ الی یوم ینفخ الصور۔"

''یعنی رُوح کو نہ تو بوجھل پن سے موصوف کر سکتے ہیں اور نہ ہی ہلکے پن سے۔ روح، بدن سے خارج ہوتی ہے تو کیا وہ ختم ہو جاتی ہے یا کہ باقی رہتی ہے؟ تو امامؑ نے فرمایا صور پھونکے جائے کے دن تک وہ ویسے ہی زندہ اور پائندہ ہے۔''[2]

---

[1] رشد وزندگی ص ۱۳۴

[2] تفسیر صافی ص ۲۹۳

رُوح یا معیارِ انسانیت:

قرآن مجید میں دو کلمے ''روح'' اور ''نفس'' چند مقامات پر استعمال ہوئے ہیں اور اُن کے متعدد معانی ہیں۔ ان میں سے ایک معنی وہ رُوح ہے جو خدائی پھُونک کے ساتھ آدمی کے بدن میں پھُونکی گئی ہے۔ اور انسانیت کا معیار قرار پائی ہے۔ بدن کے مرجانے کے بعد روح اور نفس کے اُن معانی کو بیان کیا جائے قرآن مجید میں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(۱) ''یوم یقوم الروح والملائکۃ صفاً''

''یعنی جس دن بزرگ فرشتہ روح القدس اور دوسرے فرشتے منظم صف میں کھڑے ہوں گے[۱]۔

یہاں پر ''روح'' بمعنی فرشتہ ہے۔

(۲) وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ

''یعنی پھر اس نطفہ کو اچھی طرح آراستہ کیا اور اپنی روح سے اس میں پھُونکا''[۲]

یہاں پر ''روح'' بمعنی قرآن ہے۔

(۳) ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ

''یعنی پھر اس نطفہ کو اچھی طرح آراستہ کیا اور اپنی روح سے اس میں پھونکا۔[۳]

نفس کے معانی:

(۴) تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ

''یعنی حضرت عیسیٰؑ نے عرض کیا بارِ الٰہا! جو کچھ میری ذات میں مخفی ہے اُسے تو جانتا ہے، لیکن میں تیری ذات کے غیب سے آگاہ نہیں ہوں۔''[۴]

یہاں پر ''نفس'' بمعنی ذات کے ہے

وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ

---

[۱] سورہ۴۲آیت ۵۲

[۲] یہاں پر ''روح'' بمعنی انسانی جان ہے۔

[۳] سورہ ۳۲ آیت ۹

[۴] سُورہ آیت ۱۱۶

''یعنی جارح اور سرکش نفس، انسان کو بدکاری اور بُرائی کا حکم دیتا ہے، مگر یہ کہ خداوندِ عالم اپنے فیض ورحمت کو شاملِ حال کردے۔''[1]

یہاں پر ''نفس'' کا معنی خواہشات اور غرائز ہے۔

یَاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ﴿۲۸﴾

مومن کی روح کے بدن سے نکلنے کے موقع پر اُسے خطاب ہوتا ہے۔''اے ایمان کے ساتھ مطمئن نفس! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جا، کہ تُو خدا سے راضی اور خدا تجھ سے راضی ہے۔''[2]

یہاں پر ''نفس'' سے مراد انسانی رُوح ہے۔

مرنے والے کی رُوح کو حاصل کرنا:

قرآن مجید نے بہت سے مقامات پر مختضر کی رُوح قبض کرنے کے بارے میں گفتگو کی ہے اور اس عمل کو بیان کرنے کے لیے ''توفیٰ'' کے مادہ کو استعمال کیا ہے جس کے بارے میں راغب، مفردات میں کہتے ہیں:

''توفیة الشی بذله وافیا واستیفائوہ تناوله وافیا۔''

یعنی کسی چیز کو پورا پورا کسی کے حوالے کرنا ''توفیہ'' ہے اور کسی چیز کا مکمل طور پر حاصل کرنا ''استیفاء'' ہے۔[3]

''توفی'' کا لفظ استعمال کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مونث پر مامور فرشتے سے کوئی چیز صحیح سالم اور کسی کمی بیشی کے بغیر حاصل کرتے ہیں۔ البتہ حاصل کی جانے والی یہ چیز متوفی کا جسم نہیں ہوسکتا، کیونکہ فرشتے اسے اٹھا کر اپنے ساتھ نہیں لے جاتے وہ تو متوفی کے پسماندگان ہی کے پاس پڑا رہتا ہے اور پھر اسے مٹی میں دفن کردیا جاتا ہے اور اس کے ذرات خاک میں مل جاتے ہیں۔

فرشتے اور متوفی کے درمیان گفتگو:

اور پھر آیات اور روایات سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ موت کے فرشتے اس حاصل کی جانے والی چیز کے

---

[1] سُورہ ۱۲ آیت ۵۳

[2] سورہ ۱۲ آیت ۵۳

[3] مفردات راغب (مادہ وفی)

ساتھ باتیں کرتے ہیں، حالات دریافت کرتے ہیں اور وہ اُنہیں جواب بھی دیتی ہے۔ بنا بریں وہ چیز زندہ اور ادراک کرنے والی ہو اور فرشتوں کے سوالوں کا جواب دے سکے اور اُن سے گفتگو بھی کر سکے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴿97﴾

''یعنی جن لوگوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اپنے بارے میں ظلم روا رکھا موت کے فرشتے اُنہیں مکمل طور پر اپنی تحویل میں لے لیں گے اور اُنہیں کہیں گے دُنیا میں تمہاری کیا حالت تھی؟ تو وہ جواب دیں گے، زمین میں ہماری توہین وتحقیر کی جاتی تھی، ہمیں خوار اور ناچیز سمجھا جاتا تھا اور ہم اپنی ترقی اور برتری کے لیے کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتے تھے، تو فرشتے اُنہیں کہیں گے کہ آیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی تاکہ تم ہجرت کر جاتے اور خود کو کفر اور جہالت کے ماحول سے نجات دلاتے؟ ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور نہایت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔''[1]

خدائی رُوح اور فرشتوں کا سجدہ:

موت کا فرشتہ جس چیز کو مختصر سے مکمل طور پر اپنی تحویل میں لے گا وہ اس کی رُوح ہے وہی رُوح جو انسان پیکر میں خدا کی امانت ہے۔ انسانوں کی انسانیت اسی سے وابستہ ہے اور انسان کی شخصیت اور عظمت کا جس پر دار و مدار ہے۔ غرض وہ رُوح ایسی چیز ہے جو خدا کی ملکیت ہے اور جب خدا نے اسے آدم میں پھونکا تو تمام فرشتوں کو حکمِ الٰہی ہوا کہ اسے سجدہ کریں اور اس کے سامنے تعظیم بجالائیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿29﴾

''جب میں اس کے موزوں اور متوازن پیکر کو تیار کرلوں اور اس میں اپنی رُوح پھونک دوں تو اس کے لیے سجدہ ریز ہو جانا[2]۔

---

[1] سورہ ۴ آیت ۹۷

[2] سورہ ۱۵ آیت ۲۹

منتخب رُوح:

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے اس آیت کے بارے میں سوال ہوا تو آپؑ نے فرمایا:

"روح اختاره الله واصطفٰیه وخلقه و اصنافه الی نفسه وفضله علی جمیع الارواح فنفخ منه فی آدم۔"

''یہ وہ رُوح ہے جسے خدا نے منتخب کرلیا ہے اور چُن لیا ہے، اسے خلق فرمایا ہے اور اپنی طرف اس کی نسبت دی ہے اور اسے تمام ارواح پر فضیلت دی ہے اور یہی برگزیدہ اور بافضیلت رُوح آدم میں پھونکی۔''[1]

یہ روح حیاتِ جاوید کی مالک ہے۔ بدن تو مرجاتا ہے لیکن یہ روح نہیں مرتی، جب جسم موت اور ویرانی کی زد میں ہوتا ہے تو رُوح اُسے چھوڑ کر ایک اور عالم میں چلی جاتی ہے۔

جاں قصدِ رحیل کرد گفتم کہ مرد: گفتا چہ کنم خانہ فرو می آید

(یعنی رُوح و جان نے جب کوچ کا ارادہ کیا تو میں نے کہا کہ مت جاؤ۔ اُس نے کہا کیا کروں کہ مکان گرنے والا ہے)

زندہ مخلوق کی خصوصیت:

اگرچہ انسان اب تک زندگی کے راز کو نہیں سمجھ سکا اور حیات کی حقیقت کو نہیں پہچان سکا لیکن اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ اس کائنات کی زندہ مخلوق مثلاً نباتات اور حیوانات میں ایسی خصوصیات اور صفات پائی جاتی ہیں جن سے مُردہ مخلوق بے بہرہ ہے۔ زندہ مخلوق غذا کھاتی ہے، اشیاء کو جذب اور ہضم کرتی ہے، پروان چڑھتی اور نسل کشی کرتی ہے، زندہ مخلوق خالقِ کائنات کی ہدایت تکوینی کے پیش نظر اپنی غذا کی پہچانتی، غذا کے حصول اور اس کے استعمال کے طریقہ کار کو جانتی اور زندگی کے راہ ورسم اور اپنے نفع نقصان کو تشخیص دے سکتی ہے، زندہ مخلوق میں ایسی طاقت وتوانائی ہوتی ہے جس سے وہ اس زندگی کی کشمکش میں استفادہ کرتی ہے۔ بیرونی رکاوٹوں کا مقابلہ کرتی اور اپنی زندگی کو خطرات سے بچاتی ہے زندہ مخلوق میں ڈھل جانے کی قوت ہوتی ہے۔ جس سے وہ اپنے آپ کو زندگی کے ماحول میں ڈھال لیتی ہے، حالات کے دھارے کو پہچانتی اور اس طرح سے اپنی زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔

---

[1] تفسیر صافی ص ۲۹۳

زندگی کی توانائیاں:

''کورسی ماریسن کہتے ہیں، انسان اب تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ حیات کسے کہتے ہیں؟ زندگی کا نہ تو وزن ہے نہ جسم اور نہ ہی کوئی ہندسی صورت، حیات میں بہت سی توانائیاں اور طاقتیں پائی جاتی ہیں۔ کیونکہ طاقتور اور تنومند درخت کی جڑیں پروان چڑھتے وقت سخت چٹانوں میں بھی دراڑیں ڈال دیتی ہیں۔ جب عظیم درخت بن جاتا ہے۔ تو صدیوں تک زمین کی کششِ ثقل کے باوجود بھی یہ جڑیں اسے صحیح سالم صورت میں برقرار رکھتی ہیں۔ روزانہ ہزاروں لیٹر پانی زمین سے حاصل کر کے اسے درخت کے پتوں اور پھلوں کی صورت میں فراہم کرتی ہیں۔ روئے زمین پر سب سے زیادہ قدیم مخلوق پانچ ہزار سالہ ایک درخت ہے اور یہ طولانی عمر اس زمین کی زندگی کے ایک لمحہ کے برابر ہے۔''[1]

نباتات اور حیوانات میں زندگی کی جو سرگرمیاں انسان میں بھی پائی جاتی ہیں اور انسان جو کائنات کی زندہ مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے ان دونوں مخلوقات کی روح کا حامل بھی ہے۔ اور ظاہری بات ہے کہ نہ تو بناتی روح کو دوام حاصل ہے اور نہ ہی حیوانی رُوح کو۔ جب درخت خُشک ہوجاتا ہے یا حیوان مرجاتا ہے تو ان کی نباتی اور حیوانی رُوح کا بھی خاتمہ ہوجاتا ہے اور ان کی سرگرمیوں کا دورانیہ بھی اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

مادیون کا غلط تصّور:

مادہ پرستوں کو انسان کے بارے میں زبردست غلط فہمی بھی یہیں سے پیدا ہوئی ہے کیونکہ وہ انسان کے معنوی اور روحانی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہیں اور اُن کا یہ تصور ہے کہ انسانی زندگی بھی دوسرے جانوروں کی زندگی کی مانند صرف ایک ہی حیثیت کی حامل ہوگی اور موت کے آجانے سے اس کا بالکل ہی خاتمہ ہوجاتا ہے۔

''انسان شناسی A N T H R O P O L O G Y اپنی زندگی کے اوائل میں طبیعیون NATURALOISTS اور نظریہ ''اصالت نژاد'' کے حامیوں کے زبردست تعصّب کا شکار ہی ہے۔ ان عقائد کے پیروکار انسان کی صرف جسمانی زاویہ سے پہچاننا چاہتے تھے اور اس سے متعلقہ دوسری فکری جہات کو تعصب کا شکار رہی ہے۔ ان عقائد کے پیروکار انسان کی صرف جسمانی زاویہ سے پہچاننا چاہتے تھے اور اس سے متعلقہ دوسری فکری جہات کو تعصب آلود منطق کی بھینٹ چڑھاتے رہے کہ اتفاقاً بیسیویں صدی کے درمیانی عرصے میں قدیمی تاریخی دور کے انسانوں کے کچھ ڈھانچے دریافت ہوئے اور اس دریافت نے انسان کے بارے میں سائنسدانوں کے عقیدہ کو

---

[1] رازآفرنیش انسان ص ۴۸

مزید پختہ بنا دیا۔ ان قدیم انسانوں اور ان کی طرح کے دوسرے انسانوں کے ڈھانچوں کی دریافت نے دانشوروں خاص کر سائنسدانوں کی خصوصی توجہ انسان کی طبعی تاریخ کی جانب مبذول کرا دی۔ اور انسان کے بارے میں تحقیقات کی وجہ سے جو تھوڑے بہت حقائق ان کو ملے، ان سے ان لوگوں نے حقائق کی کڑیوں کو آپس میں ایک دوسرے سے ملا یا اور انسان کی طبعی تاریخ مرتب کی۔

انسان اور بندر کا رشتہ:

''اسی تحقیقات کے دوران اسی طبعی تاریخ کے حوالہ سے انسان کے بندر کے ساتھ رشتہ ثابت کرنے کے دعوے شروع ہو گئے۔ ہم جانتے ہیں کہ انسان کی صرف اور صرف طبعی اور جسمانی زاویہ ہی سے نہیں پہچانا جا سکتا، بلکہ اس مہم کے لیے ایک وسیع اور غیر متناہی علمی نقطہ نظر کی ضرورت ہے، کیونکہ انسان ایک ایسا غیر متناہی وجود ہے جس کے اسرار کی اصل حقیقت کو واضح کرنے کے لیے تمام انسانی معلومات بھی نا کافی ہیں۔''

''انسان شناسی کے سلسلے میں جن علوم نے سائنس کی امداد کی ہے وہ طبی نقطہ نظر سے انسان شناسی کا علم ہے۔ اس علم نے انسان کو گوشت و پوست، ہڈیوں، اعصاب، رگوں اور مختلف میکانزم رابطوں میں محدود کر دیا ہے۔ جبکہ بعد کی علمی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ انسان سے مختلف موضوع کا حل اس قدر سادہ اور معمولی نہیں۔''[1]

انسان کی خصوصی رُوح:

انسان کے اندر حیوانی رُوح کے علاوہ ایک اور رُوح بھی پائی جاتی ہے جو صرف اس کے ساتھ ہی مخصوص ہے جسے قرآن مجید نے ''خدائی رُوح'' سے تعبیر کیا ہے۔ اور جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اس رُوح کی حقیقت دُنیا کے تمام لوگوں پر مخفی ہے خواہ وہ عالم ہیں یا جاہل، اور اس امرِ الٰہی کی گہرائیوں سے کوئی بھی واقف نہیں ہے، لیکن بعض تحقیق طلب اور جستجو کے دلدادہ مسلمانوں نے مناسب موقعوں پر دینی پیشواؤں سے اس کی بعض اوصاف اور خصوصیات کے بارے میں سوالات کیے اور ان کے جوابات بھی حاصل کیے جن سے رُوح کے کچھ مسائل اور مطالب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ۔

رُوح کی نسبت خدا کی طرف:

محمد بن مُسلم کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے خدا کے اس قول کے بارے میں

---

[1] انسان شناسی فلسفی ص ۷

دریافت کیا:

"ونفخت فیه من روحی۔" (جب میں اس میں رُوح پھونکوں) یہ رُوح پھونکنا کیسا ہے؟ تو امام علیہ السلام نے فرمایا:

"ان الروح متحرك كالريح وانما سُمى روحا لانه اشتق اسمه من الريح وانما اخرجه على لفظة الريح لان الارواح مجانسة الريح وانما اضافه الى نفسه لانه اصطفاه على سائر الارواح كمال قال لبيت مين البيوته بيتى والرسول خليلى ، واشباه ذالك وكل ذالك مخلوق، مصنوع، محدث، مربوب مدبر۔"

"یعنی روح بھی ہوا کی لہروں کی مانند متحرک ہے، اور اُسے "رُوح" اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی لہر ہوا کی لہروں سے ملتی جُلتی ہیں اور خدا نے اسے اپنی طرف اس لیے نسبت دی ہے کہ اسے دوسری ارواح سے منتخب کرلیا ہے، جس طرح کہ خانہ کعبہ کو اپنا گھر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل کہا ہے۔ اسی طرح کی بہت سی دوسری چیزیں ہیں جن کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، یہ سب خدا کی مخلوق، اس کی پیدوار، ایجادشدہ، ملکیت اور تدبیر یافتہ ہیں۔"[1]

غیرمرئی لہریں:

اس رویت میں دو نقطے شایانِ توجہ ہیں۔ پہلا تو یہ کہ امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "رُوح" بھی "ریح" یعنی ہوا کہ لہروں کی مانند متحرک ہے۔ آج سے چودہ سو سال قبل لوگوں کو غیرمرئی لہروں کا مفہوم سمجھانے کے لیے ہوائی لہروں کی تشبیہ سے بڑھ کر کوئی اور بہتر بات نہیں تھی۔ لیکن آج سائنسی ترقی، نور کی پہچان اور برقی ذرائع کی فروانی کی وجہ سے لہروں کا تصور لوگوں کے لیے آسان ہو چکا ہے۔ کیونکہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ برقی لہریں ہی ہیں جو ریڈیو اور ٹیلی فون کی آواز کو دُور دراز تک لوگوں کے کانوں تک پہنچاتی ہیں۔ اور برقی لہریں لوگوں کی صورتوں اور مختلف اور گوناگوں مناظر کی تصاویر کی ٹیلی ویژن کی سکرین پر لے آتی ہیں۔

---

[1] کافی جلد۱ ص ۱۳۳

رُوح اور نُور کی مشابہت:

بعض دانشور کہتے ہیں کہ جو رُوح، انسان کے مرجانے کے بعد بھی باقی رہ جاتی ہے۔اور بدن کے متفرق ہوجانے کے ساتھ فنا نہیں ہوجاتی، ممکن ہے کہ وہ نُوری لہروں کی مانند ہو کہ جس کا ڈھانچہ اور مسکن تو ختم ہوجاتا ہے، لیکن وہ بدستور باقی رہتی ہے اور اپنی زندگی کے سفر کو مسلسل جاری رکھے ہوئے ہے۔

''ڈاکٹر کارل کہتے ہیں کہ یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ وہ رُوح جو جسم سے جُدا نہیں ہوتی وہ بغیر جسم کے کیونکر زندہ رہ سکتی ہے؟ اس عظیم راز کو سمجھنے کے لیے شاید سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال کی مدت درکار ہو، انتظار رکھنی چاہیے کہ اس راز کو سمجھنے کے لیے شاید مغز سے رُوح کی تراوش کو یوں سمجھا جائے جس طرح بلب BULB کے اندر موجود تاروں کے ذریعہ روشنی پھیلتی ہے۔جس طرح روشنی تاروں کے ذریعہ وجود میں آتی ہے اسی طرح فکر مغز سے تراوش کرتی ہیں۔لیکن نور کی FUCHSINE کرنیں بلب کے شیشے سے نکل کر فضا میں پھیل جاتی ہیں اور اپنے بے پایان سفر کا آغاز کردیتی ہیں۔جب بلب بجھا دیا جاتا ہے تو یہ پھیلی ہوئی FUCHSINE کرنیں ختم نہیں ہوجاتیں۔''

''کیلی فورنیا کے ستارہ شناسوں ASTROLOGERS نے اپنی عکاسی PHOTOGRAPHY کے صفحات پر ایسے ستاروں کی شعاعوں کو محفوظ کیا جو آج سے تقریباً چالیس کروڑ نُوری سال پہلے تباہ ہوچکے ہیں۔اسی لیے یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے مغز کی معنوی توانائیاں، زمان و مکان کے ماوراء کی دُنیا میں ہمارے مرنے کے بعد بھی چراغ کی روشنی کی مانند باقی رہیں اور اپنا سفر جاری رکھیں۔[1]

امام جعفر صادقؑ کی ایک زندیق سے گفتگو:

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ تیرہ سو سال قبل روح اور چراغ کو روشنی کی باہمی مشابہت کے بارے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور ایک زندیق شخص کے درمیان گفتگو ہوئی ہے کہ ایسے یہاں درج کیا جائے۔زندیق نے کہا:

"اخرنی عن السراج اذا نطفی این یذھب نورہ۔"

''یہ فرمایئے کہ جب چراغ بُجھ جاتا ہے تو اس کی روشنی کہاں چلی جاتی ہے۔؟''

امام نے فرمایا:

یذھب فلا یعود۔''چلی جاتی ہے اور واپس نہیں آتی۔

---

[1] راہ ورسم زندگی ص ۱۴۵

اس جواب میں امام علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ فنا ہوجاتی ہے بلکہ فرمایا کہ چلی جاتی ہے لیکن واپس نہیں آتی۔
دراصل زندیق یہ چاہتا تھا کہ امام کے فرمان کے ذریعہ معاد کی نفی پر استدلال قائم کرے۔ لہٰذا اس نے کہا:

''پھر اس میں کیا حرج ہے کہ آپ کہیں انسان بھی چراغ کی مانند ہے۔ جب مرجاتا ہے تو اس کی روح بھی واپس نہیں آتی جس طرح کہ چراغ کی روشنی واپس نہیں آتی۔''

امام نے جواب دیا:

''تمہارا یہ موازنہ غلط ہے کیونکہ چراغ میں جلنے کا مواد ہوتا ہے جسے بہرصُورت جلنا چاہیے اور اس کو جل کر ختم ہوجانا چاہیے تاکہ روشنی کے شعلے اس سے ساطع ہوں، لیکن رُوح جسم میں بذاتِ خود ایک مستقل چیز ہے جو جسم کی موت کے ساتھ اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور خداوندِ عالم بروز قیامت اسے دوبارہ زندہ کرے گا، اور رُوح پھر اُس سے آن ملے گی۔''[1]

رُوح خدا کا معنیٰ:

محمد بن مُسلم کی روایت سے دوسرا نکتہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس رُوح کا تعلق خدا کی ذات سے ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے مکتب کے پیروکار اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں کہ تمام ہستی اور جو کچھ اس کے درمیان ہے جن میں سے کرۂ زمین کی تمام زندہ مخلوقات کی ارواح بھی ہیں سب وحدہٗ لاشریک خالق کی تخلیق ہیں، لیکن جو روح خدا نے انسان میں پھونکی ہے اس میں نہایت ہی اہم خصوصیات موجود ہیں جو دوسری ارواح میں نہیں ہیں، اسی لیے خداوند عالم نے اپنی پیدا کردہ تمام ارواح سے اسے منتخب کیا ہے اور اپنی طرف نسبت دی ہے۔ جس طرح خانہ کعبہ کو اپنا گھر کہا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل منتخب کیا ہے۔

انسانی شرافت کا سرمایہ

یہ روح ہی ہے جو انسان کی کرامت، شرافت اور بزرگواری کا سرمایہ اور انسانوں کی انسانیت کا معیار ہے۔ یہ روح ہی ہے کہ خداوند عالم نے جس کے لیے اس قدر باعظمت کائنات کو مسخر کردیا ہے اور اس کے لیے سربلندی، ارتقاء اور تکامل کی راہیں کھول دی ہیں۔ یہ روح ہی تو ہے جس کے ذریعہ خداوند عالم نے انسان کو آزادی اور خودمختاری کی نعمت سے نوازا ہے اور اسے اپنے اوامر کی ادائیگی اور دینی فرائض کی انجام دہی سے سرفراز فرمایا ہے۔ یہ روح ہی ہے کہ جس کی وجہ سے انسان کو نہ

[1] احتجاج طبرسی حصّہ دوم ص ۹۶

صرف اس کائنات کی زندہ مخلوق پر برتری عطا کی گئی ہے بلکہ اسے فرشتوں پر بھی فوقیت عطا ہوئی ہے اور مسجود ملائکہ قرار پایا ہے۔جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام ایک مفصل حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں:

انسانی روح کی فوقیت

فلما اراد الله ان ينفخ فيه الروح خلق الله تعالیٰ روح آدم ليست كالا رواح وهی روحا فضلها الله علی جميع ارواح الخلق من الملائكة وغيرها۔ فلما خلق الله تعالیٰ روح آدم امر بغمسها جميع الانوار ثم امرها ان تدخل فی جسد آدم۔

جب خداوند عالم نے آدمؑ کے پیکرِ خاکی میں روح پھونکنے کا ارادہ تو آدمؑ کی روح کو پیدا کیا۔ یہ روح دوسری عام روحوں کی طرح نہیں ہے، بلکہ یہ وہ روح ہے جسے خدا نے فرشتوں سمیت اپنی ذی روح اور زندہ مخلوقات کی ارواح پر فضیلت دی ہے۔اور جب خدا نے آدم علیہ السلام کی خلق فرمایا تو حکم دیا کہ اسے تمام انوار میں غوطہ دیا جائے اور اسے تمام روشنیوں اور معلومات سے نوازا جائے، پھر حکم دیا کہ اسے آدم کے جسدِ خاکی میں داخل کیا جائے۔[1]

کمال مطلق کی صلاحیت:

یہ رُوح ہی ہے جس میں کمال مطلق اور بے انتہا ترقی کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔اگر انسان اپنی عقل سے کام لے جو کہ انسانی رُوح کا پرتو ہے، اسے اپنا راہنما قرار دے اور مستقل ارادے کے ساتھ انسانیت کی راہیں طے کرے جن میں مادیت اور معنویت دونوں پائی جاتی ہیں تو فرشتوں سے بھی برتر ہوگا اور سربلندی اور ارتقاء کے مدارج کو پالے گا جن کی وہ لیاقت رکھتا ہے، لیکن اس کے برعکس اگر وہ اپنی آزادی سے غلط فائدہ اُٹھائے، عقل وانسانیت کو پسِ پُشت ڈال دے، شہوات وغرائز کا بے دام غلام بن جائے تو جانوروں سے بھی پست تر ہوگا اور اسفل السافلین میں جا گرے گا۔

انسان دوحیثیتوں کا حامل ہے:

دوسرے لفظوں میں حیوانات، خدائی حکم کے تحت صرف ایک حیثیت کے حامل خلق کئے گئے ہیں ان میں صرف

---

[1] تفسیر برہان ”فاذا سویتہ ونفخت فیہ من روحی“ کی آیت کے ذیل میں ص ۵۴۹

جسمانی اور مادی پہلو ہی ہوتا ہے۔اس لیے قوت وضعف، کمال ونقص اور خوشی وغمی جیسے حالات ان میں صرف ایک ہی حیثیت سے ہوتے ہیں۔لیکن انسان دوحیثیتوں کے ہوتے ہیں۔ایک جسمانی اور دوسرے روحانی، جسمانی قوت وضعف اور روحانی قوت وضعف، مادی وحیوانی لذات اور معنوی ورُوحانی لذت۔سعادت مند انسان وہ ہوتا ہے جو اپنی ساری زندگی میں جسم اور رُوح کے توازن کو برقرار رکھے۔تخلیقی پروگرام کے مطابق زندگی بسر کرے۔انسانی اور حیوانی پہلوؤں کو متوازی طور پر مدِنظر رکھے اور ایک دوسرے پر قربان نہ کرے، چنانچہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

روح اور بدن کے حالات:

"ان للجسم ستة احوال الصحة والمرض الموت والحيوة والنوم واليتفظة وكذالك الروح۔ فيحواتها علمها، وموتها جهلها ومرضها شكها، وصحتها يقيتنها ونومها غفلتها ويفظتها حفظها۔"

''جسم کی چھ حالتیں ہوا کرتی ہیں، صحت اور بیماری، موت اور زندگی، نینداور بیداری۔اسی طرح رُوح کی بھی چھ حالتیں ہوتی ہیں۔اس کی زندگی علم اور دانائی ہے، اس کی موت جہالت اور نادانی ہے اس کی بیماری شک اور شبہ ہے، اس کی صحت اطمینان اور یقین ہے۔اس کی نیند غفلت اور بےخبری ہے اور اس کی بیداری توجہ اور آ گاہی ہے۔''[1]

مقتولین بدر سے رسُولؐ اللہ کا خطاب:

جنگِ بدر میں مُسلمانوں نے قریش کے کچھ سرداروں اور مکہ والوں کو موت کے گھاٹ اُتارا اور اُن کی لاشوں کو ایک کنوئیں میں ڈال دیا۔انس بن مالک کہتے ہیں کہ اصحابِ رُسولؐ نے نصف شب میں سُنا کہ رُسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، امیہ بن خلف، ابوجہل بن ہشام کی اور کنوئیں میں پڑی ہوئی دوسری لاشوں کو مخاطب کرکے فرمایا:

"هل وجدتم ما وعدبكم حقا، فانى وجدت ماوعدنى ربى حقاً فقال المسلمون يارُسول الله تناوى قوما قد جيفرا؟قال ماانتم باسمع لما اقول منهم ولكنهم لايستطيعون ان يجيبونى۔"

---

[1] السماء والعالم ص ۳۹۸

''آیا تم نے اپنے ربّ کے اس برحق وعدہ کو پالیا ہے جو اُس نے تم سے کیا تھا؟ البتہ میں نے تو اپنے رب کے اس برحق وعدہ کو ضرور پالیا ہے جو اُس نے مجھ سے کیا تھا! مسلمانوں نے کہا: یارسُول اللہ! آپ تو ایسے لوگوں سے خطاب کررہے ہیں جو مردار ہوچکے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا: تم میری باتوں کو ان سے زیادہ نہیں سن سکتے، لیکن وہ میری باتوں کا جواب نہیں دے سکتے۔''[1]

انبیاء کرام:

تمام انبیاء نے رُوح کی بقا کے بارے میں بتایا ہے اور انسان کی پائیدار زندگی کی خوشخبری دی ہے۔ مکتب انبیاء پر ایمان لانے والے ہر زمانے میں خواہ وہ ماضی ہو یا حال مرنے کے بعد کی زندگی اور خدا کی سزا و جزا پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن جو لوگ مذہب سے بیگانہ ہیں وہ ہمیشہ اندرونی کشمکش کا شکار رہتے ہیں اور دوٹوک انداز میں مرنے کے بعد کی زندگی کی نفی نہیں کرسکتے۔

موت زندگی کا آغاز ہے:

''یہ ٹھیک ہے کہ آج بہت سے لوگ مذہب پر ایمان کو خیرباد کہہ چکے ہیں، لیکن ان میں سے بہت سے لوگ اب بھی موت کے راز کے بارے میں سوچتے اور اضطراب کے عالم میں خود سے پُوچھتے ہیں کہ آیا روحانی ترقی جو انسانی زندگی کا اصل مقصد ہے اور آیا معنوی خزانے جو حق کے بزرگوں اور پاک لوگوں کے ذریعہ جمع کیے جاچکے ہیں ان کو بھی فنا ہوگی؟ مذہبی نقطہ نظر سے موت زندگی کے خاتمہ کا نام نہیں ہے، بلکہ زندگی کا آغاز ہے، بدن کے فنا ہوجانے سے رُوح بجائے اس کے کہ بدن کے ساتھ رُوح بھی فنا ہوجائے اُلٹا وہ اپنی بلندیوں کے سفر پر روانہ ہوجاتی ہے اور اپنی شخصیت کو دکھو دینے کی بجائے خدا سے جاملتی ہے۔''

مکتبِ انبیاء اور بے پناہ سعادت:

تقریباً دوہزار سال کے عرصہ میں کروڑوں کی تعداد میں مرد اور عورتیں اطمینان کے ساتھ موت کے ہم آغوش ہوچکے ہیں۔ جن کا عقیدہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد وہ اپنے عزیزوں، نیک لوگوں اور فرشتوں اور خدا سے جاملیں گے۔ حتیٰ کہ مسیحیت نے بھی انسان کو روح کی بقاء کی خوشخبری ہی نہیں دی، بلکہ نیک لوگوں کو خدا سے جا ملنے اور بے انتہا سعادتوں کی

---

[1] سیرت ابنِ ہشام ا، ۲ ص ۶۳۹

خوشخبری بھی سنائی ہے۔ بنابریں رازِ مرگ کے سلسلے میں انسان کے اضطراب کے بارے میں مذہب سائنس کے جواب سے کہیں زیادہ واضح اور قانع کنندہ ہے۔ مذہب انسان کو وہ جواب دیتا ہے جو اس کا دل مانگتا ہے۔'' [۱]

عام طبیعت میں ''حیات'' ایک نہایت ہی پیچیدہ اور غیر معلوم مخلوق ہے۔ اور موجودہ ترقی یافتہ دور میں دُنیا بھر کے دانشور اپنی تمام معلومات اور علم کے باوجود اب تک اس راز سے پردہ نہیں اُٹھا سکے اور یہ نہیں سمجھ سکے کہ ایک زندہ چیز کس طرح معرضِ وجود میں آتی ہے اور ایک بے جان اور مردہ مادہ کیونکر طبیعت کی آغوش میں خلعتِ حیات سے نوازا جاتا ہے۔ زمانہ ماضی میں کبھی کبھی خبر ایجنسیاں اس قسم کی خبر نشر کیا کرتی تھیں کہ فلاں سائنسدان اپنی لیبارٹری میں ایک زندہ مخلوق بنانے میں سرگرم عمل ہے اور اپنے تجربے کے نتائج سے عنقریب دُنیا کو آگاہ کرے گا۔ لیکن کچھ مُدت کے بعد اس قسم کی آواز بالکل ختم ہوجاتی، کیونکہ اسے ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا۔ اور وہ مردہ مواد سے زندہ مخلوق بنانے میں عاجز آجاتا۔

الیکٹرونی مغز اور زندہ مخلوق کا موازنہ:

''اگر الیکٹرانی مغز کی مانند انسان کی بنائی ہوئی مشینری کا خدا کی ایک عام اور سادہ سی مخلوق کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو اس کی ایک مذاق سے زیادہ اور کچھ اور اہمیت نہیں ہوگی۔ اور جو چیز اشکال کا سبب بنتی ہے وہ یہ کہ پیچیدگی اس مادے میں پائی جاتی ہے کہ جس کے مواد نہایت ہی باریک ہوتے ہیں۔ سالموں MOLECULES کے اندازے کے مطابق۔ اور یہ سالمے اس طرح ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں کہ کوئی بھی کیمیادان CHEMIST وہاں تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا۔ [۲]

''اس پیچیدہ مواد کو کس چیز نے یہ نظم عطا کیا ہے؟ کیونکہ ایسے مواقع پر نظم وضبط کی اہمیت اسی قدر ہے جس قدر خود جسم کی ساخت کی۔ کیونکہ کسی زندہ چیز کو وجود میں لانے کے لیے سالموں کی ایسی پیچیدہ اور منظم صورت اختیار کرنی چاہیے کہ جس سے ایک فعال مشینری وجود میں آجائے اور وہ خودبخود پروان چڑھے اور بنتی رہے۔'' [۳]

مادہ پرستوں کے نزدیک زندگی کیا ہے:

مادہ پرستوں کے نقطہ نظر سے زندہ چیزوں میں حیات صرف مادہ کے زمانی اور مکانی رابطے اور اُن کی باہمی وضعی کیفیت وابستگی اور پیوستگی کا نام ہے۔ وہ زندگی کے استقلال اور اصلیت کے قائل نہیں ہیں۔ اس پیچیدہ اور تعجب آور چیز کو عالم

---

[۱] راہ ورسم زندگی ص ۱۴۲

[۲] شناخت حیات ص ۱۱

[۳] شناخت حیات ص ۲۶

اور صاحبِ حکمت خالق کی مخلوق نہیں سمجھتے۔ اُن کا نظریہ یہ ہے کہ اس کائنات کی تمام زندہ مخلوق چاہے وہ نباتات ہوں یا حیوانات اور اُن کی تخلیق میں جو منظم حساب و کتاب اور حکمت کارفرما ہے۔ سب مادہ کی حرکت کا نتیجہ اور اندھے اور بے شعور اتفاق کی پیداوار ہے۔

''ڈاکٹر تقی ارانی مردہ مادہ کے ذی روح ہونے اور روح کی تعریف میں یُوں کہتے ہیں: اگر مادہ کے اجزاء مخصوص زمانی اور مکانی رابطہ پیدا کرلیں تو وہ ذی روح بن جاتے ہیں اور روح انہی اجزاء ذی رُوح کے رابطہ کا نام ہے۔ اور جب یہ مخصوص رابطہ زبردست تبدیلی پیدا کرلے تو مادہ بے رُوح ہوجاتا ہے۔''[۱]

ڈاکٹر ارانی کی تشبیہ:

ڈاکٹر ارانی زندہ چیزوں کو جو کہ حیاتیاتی خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔ گھڑی جیسی ایک بے روح اور جماداتی ایجاد سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ: اس کے اجزاء ثابت زمانی فاصلوں اور مساوی مکانی فاصلوں کو طے کرتے ہیں۔ جس سے وہ صحیح وقت پر گھنٹہ بجاتی ہے اور اپنا معلوم کام انجام دیتی ہے۔ اگر اس کی مخصوص تنظیم اور اجزائی رابطے کو ختم کردیا جائے، تو اجزا تو وہی رہیں گے، لیکن ان کا باہمی ارتباط ختم ہوجائے گا جس کی وجہ سے وہ کام کرنا چھوڑ دے گی۔

پھر ڈاکٹر صاحب روحیّون اور ماوراء مادہ کے حامیوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور اُن کے نظریہ کو غلط ٹھہراتے ہوئے موجودہ زمانہ کے مادی سوچ رکھنے والوں MATERIALISM DIALECTICS کے نظریہ کو صحیح قرار دیتے ہیں اور سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

اصالتِ رُوح کی نفی:

''سابق میں روح کے موضوع کے بارے میں انسان غلط فہمی کا شکار تھا اور اسے مادہ سے ماورا ایک خاص چیز تصوّر کرتا تھا، لیکن آج مادی سوچ رکھنے والے MATERIALISM DIALECTICS اسے مادہ کے ارتباط میں تلاش کرتے ہیں۔ ایک طرف تو مادہ کو رُوح کا پیدا کرنے والا سمجھتے ہیں اور دوسری طرف حکمت ماوراء الطبیعۃ METAPHYSICS کے نظریہ کے برخلاف روح کے خصوصی وجود کا انکار کرتے ہیں۔''[۲]

ڈاکٹر ارانی نے اپنے مقصود کو ایسے الفاظ میں بیان کیا ہے کہ بے خبر قاری پہلے تو یہ تصور کرتا ہے کہ یہ صرف کل کے

---

[۱] پیسکولوجی ص ۳۱

[۲] پسیکولوجی ص ۳۲

لوگ تھے جو جاودانی روح کا نظریہ رکھتے تھے اور اسے مخصوص اور مادہ کے ماوراء چیز سمجھتے تھے، گویا آج نہ تو اس نظریہ کا کوئی نام ونشان ہے اور نہ ہی اس کے حامل موجود ہیں، دوسرے یہ کہ یہ صرف مادی سوچ رکھنے والے MATERIALISM DIALECTICS ہی ہیں جو آج رُوح کی تلاش مادہ کے ارتباط میں کرتے ہیں اور رُوح کے بارے میں حکمت ماوراء الطبیعۃ METAPHYSICS کے برخلاف اس کے مخصوص وجود کے قائل نہیں ہیں، گویا میٹریالزم ڈیالٹکس سے پہلے اس بارے میں کسی نے اس نظریہ کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی رُوح کے مادی پہلو کے قائل تھے۔

غلط اور خلافِ واقعہ تصوّرات:

جیسا کہ ابھی تفصیل کے ساتھ ذکر ہوگا، یہ دونوں باتیں غلط، دونوں تصوّر باطل اور دونوں نظریے خلاف واقعہ ہیں۔

اوّل: گزشتہ صدیوں میں بعض دانشورعلم کی نارسائی اور وسائل تحقیق کی کمیابی کی وجہ سے کائنات کی ساخت یا اس جہان کی موجودات کی ساخت کے بارے میں علمی نظریہ کے نام سے غلط چیزیں دُنیا کے سامنے پیش کرتے رہے اور بسا اوقات وہی غلط نظریات اس دور کی علمی محفلوں میں قبول بھی کیے جاتے رہے۔ بیسیوں بلکہ سینکڑوں سال تک کتابوں میں بھی لکھے جاتے رہے اور علمی مدارس میں اُستادوں کے ذریعہ پڑھائے بھی جاتے رہے اور طالب علم اُنہیں یاد کرنے کے لیے خُوب کوششیں بھی کرتے رہے۔ بطور امثال:

گزشتہ صدیوں کے غلط نظریات

گذشتہ صدیوں میں غلط اور خلاف واقعہ نظریات میں سے ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ پُوری کائنات کا مرکز کرۂ زمین ہے اور سارے جہان کا مجموعہ چند کروں کی شکل میں ہے جو ایک دوسرے کے اندر پائے جاتے ہیں اور زمین کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور ہر کرۂ کی اُبھری ہوئی CONVEX سطح اپنے سے اُوپر والے کرہ کی عمیق CONCAVE سطح سے ملی ہوئی ہے۔ وہ اپنے اس نظریہ کو اذہان کے قریب لانے کے لیے مجموعہ عالم کو ایک پیاز سے تشبیہ دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کرہ زمین پیاز کے اندر ایک چھوٹے سے بُلبلے BUBBLE GLOBE کی مانند ہے اور دوسرے کرات بڑے بلبلوں کی طرح۔ جس طرح کی پیاز میں ایک حباب نے دوسرے حباب کو گھیرا ہوا ہے۔ اسی طرح کائنات کی ساخت میں بھی ایک کرے نے دوسرے کرے کا احاطہ کیا ہوا ہے یا ہر کروہ دوسرے کرے میں گھرا ہوا ہے۔ اسی طرح کائنات کی ساخت میں بھی ایک کرے نے دوسرے کرے کا احاطہ کیا ہوا ہے یا ہر کرہ دوسرے کرے میں گھر ہوا ہے۔ لیکن عصر جدید کی تحقیقات نے اس مفروضہ کو باطل کر دیا ہے۔ اور موجودہ دور میں نہ تو اس نظریہ کا کوئی وجود ہے اور نہ ہی اس کے حامیوں کا کوئی پتہ۔

اربعہ عناصر:

اسی طرح گزشتہ زمانے میں کچھ دانشور یہ سمجھتے تھے کہ موجوداتِ عالم جن ابتدائی عناصر اصل مواد سے بنائی جاتی ہیں وہ صرف مار بسیط ELEMENT عناصر ہیں یعنی آگ، ہوا، مٹی اور پانی، لیکن موجودہ دور میں جب کہ سائنس ترقی کر چکی ہے، لیبارٹریوں کے وسائل مہیا ہو چکے ہیں اور سائنسی آلات ایجاد ہو چکے ہیں۔ اور پھر یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ موجودہ چار (اربعہ) عناصر جنہیں قدیم دانشور بسیط سمجھتے ہیں اور وہ بسیط بھی نہیں ہیں، بلکہ اس عالم کی مرکب اشیاء کا مجموعہ ہیں، ہمارے اس دور میں نہ تو اربعہ عناصر کے نظریہ کا وجود ہے اور نہ ہی اس کے حامیوں کا کسی کو علم ہے۔ اس طرح کے غلط مفروضات گذشتہ زمانے میں بہت تھے جنہیں سائنسی اور علمی پیش رفت نے حرفِ غلط کی طرف مٹایا ہے۔ اور رفتہ رفتہ طاقِ نسیان میں چلے گئے ہیں۔

ڈاکٹر ارانی کی غیر سنجیدہ باتیں:

اگر رُوح کا مسئلہ بھی مذکورہ دونوں مفروضوں کی مانند ہوتا کہ جنہیں موجود ترقی یافتہ علوم نے باطل کر دیا ہے۔ اور ان کے حامیوں کا کوئی پتہ نہیں پھر تو ڈاکٹر ارانی بات کہنے میں حق بجانب تھے کہ ''سابق میں رُوح کے موضوع کے بارے میں انسان غلط فہمی کا شکار تھا اور اُسے مادہ کے ماوراء ایک خاص چیز تصور کرتا تھا لیکن آج مادی نظریہ رکھنے والے اسے مادہ ارتباط میں تلاش کرتے ہیں'' لیکن جب ڈاکٹر صاحب یہ جملے قلمبند کر رہے تھے اس وقت ایک تو مکتب انبیاء کے کروڑوں سچے پیروکار ساری دُنیا میں موجود تھے جو رُوح کی اصالت اور اس کی بقا پر ایمان رکھتے تھے جو بقاء رُوح کے نظریہ کی حمایت کرتے تھے اور اسے علمی، فلسفی اور تجرباتی نفسیات کی روح سے صحیح اور قابلِ قبول سمجھتے تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سائنس کی وسعت اور علمِ نفسیات کی پیشرفت کی وجہ سے انسان کے بہت سے ناشناختہ اسرار یکے بعد دیگرے آشکار ہو رہے ہیں کہ جن میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو رُوح کی اصالت اور بقاء کے نظریہ کی تائید کرتے ہیں اور دانشوروں کی توجہ کو زندگی بعد از موت کی جانب پہلے سے زیادہ مبذول کرا رہے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ کورسی ماریسن کے بقول ''انسان عالمِ خلقت کے بارے میں ابھی تک بچپن کے دور سے گزر رہا ہے اور ابھی اُس نے رُوح کے بارے میں تحقیق کا آغاز کیا ہے اور اس کے دوام وابدیت سے واقف ہو رہا ہے۔

رُوح کی نفی پر راسل کو شک ہے:

مسٹر راسل جن کا شمار مادی فلاسفہ اور روح جاودانی کے منکرین میں ہوتا ہے، اُنہوں نے اپنی بعض کتابوں میں

اپنے منفی افکار کو مختلف عبارات کے ساتھ بیان کیا ہے۔لیکن ان کی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ باطن میں رُوح کی نفی کے بارے میں اُن کا قطعی اور دوٹوک فیصلہ نہیں ہے، بلکہ مشکوک انداز میں اس بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔کورسی ماریسن کی مانند اس سلسلے میں سائنسی ترقی کو مثبت انداز میں دیکھتے اور اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ممکن ہے مستقبل میں جاودانی رُوح کے نظریہ کو اس حد تک تقویت حاصل ہو جائے کہ اس کے انکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔وہ کہتے ہیں۔

''بقائے روح'' کے بارے میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ کسی شک وشبہ کے بغیر رُوح اور جسم کا باہمی رابطہ جیسی بھی صُورت میں ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ اس بات سے زیادہ عمیق ہے جس کا لوگ عام طور پر تصوّر کرتے ہیں۔میرے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جس کی وجہ سے میں اس بات کو تسلیم کرلوں کہ جب انسان کے مغز کے اجزاء فنا ہو جاتے ہیں تو بھی کوئی رُوح باقی رہ جاتی ہے۔''[۱]

میں ذاتی طور پر اس بات کا معتقد ہوں کہ مرنے کے بعد کی زندگی کے حق میں حکمت ماورا METAPHYSICS پر ایمان رکھنے والوں کے دلائل کئی درجے ان دلائل سے کمزور ہیں جو ان کے مخالفین کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں، لیکن اس بات کو ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ یہی کمزور دلائل کسی بھی وقت وزنی ہو جائیں۔اگر ایسا ہو گیا تو مرنے کے بعد کی زندگی کو نہ ماننا سائنسی اور علمی افکار کے منافی ہوگا۔''[۲]

گفتگو میں ادب کو ملحوظ رکھا ہے:

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ دُنیا کے نامی گرامی، مادی فیلسوف مسٹر راسل نے روح کے بارے میں گفتگو کی ہے، لیکن حد سے تجاوز نہیں کیا ادب کو ملحوظِ خاطر رکھا اور بقاء روح کا عقیدہ رکھنے والوں کو غلط فہمی کا شکار نہیں بتلایا۔اُنہوں نے رُوح کی بقاء کا عقیدہ رکھنے والوں کے دلائل کو منکرین رُوح کے دلائل سے کمزور ضرور سمجھا ہے، لیکن اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں ان کے دلائل مضبوط اور وزنی ہو جائیں اور انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔''

ڈاکٹر ارانی کا تعصّب:

لیکن ڈاکٹر ارانی نے نہ تو اپنے دور کے ان دانشوروں کے علمی وقار کا احترام کیا ہے جو بقاء رُوح کے طرفدار ہیں اور نہ ہی اس زمانے کے ان کروڑ متدین افراد کے بارے میں حریم ادب کو پیشِ نظر رکھا ہے جو رُوح کی بقاء پر ایمان رکھتے ہیں

---

[۱] جهانی که من می شناسم

[۲] چرا مسیحی نیستم ص ۶۳

بلکہ بقاءرُوح کے نظریہ کو سابقہ ادوار کے لوگوں کی طرف منسوب کر کے دوٹوک الفاظ میں انہیں غلط فہمی کا شکار بتلایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ گروہی محبت اور پارٹی کے تعصّب نے انہیں ایسا غلط اور غیر علمی رویّہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا ہے۔

دوم: جیسا کہ ابھی بیان ہوا ہے کہ ڈاکٹر ارانی نے ذی روح ہونے اور اسی طرح رُوح کی تعریف میں کہا ہے کہ ''اگر مادہ کے اجزاء مخصوص زمانی اور مکانی رابطہ پیدا کرلیں تو وہ ذی روح بن جاتے ہیں اور رُوح انہی اجزاء ذی رُوح کے رابطے کا نام ہے'' اور پھر چند سطروں کے بعد روحیون کے نظریہ کو انسانی غلط فہمیوں میں شمار کرتے ہوئے کہا ہے ''لیکن آج مادی سوچ رکھنے والے (میٹریالزم ڈیالٹک) اسے مادہ کے ارتباط میں تلاش کرتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ مادہ کی روح کا پیدا کرنے والا سمجھتے ہیں اور دوسری طرف حکمت ماوراءالطبیعۃ کے نظریہ کے برخلاف روح کے خُصوصی وجود کا انکار کرتے ہیں۔''

روحیون کی توہین اور مادیوں کی تکریم:

ڈاکٹر ارانی اپنی کتاب کے قاری کے نزدیک روحیون کی توہین اور بقائے روح کے عقیدہ کی تحقیر کے طور پر اپنی گفتگو کے پہلے حصّے میں اصالت اور اس کے استقلال کے نظریہ کو سابقہ دور کے جاہل اور بے علم لوگوں کے کھاتے میں ڈالتے ہیں اور اس چیز کو انسانی غلط فہمیوں میں شمار کرتے ہیں اور اپنے دور کے ہزاروں محقق اور دانشوروں کو خاطر میں نہیں لاتے جو بقائے رُوح کے طرفدار ہیں، حتیٰ کہ ان میں سے کسی ایک کا نام تک نہیں لیتے، لیکن اس کے برعکس مادی سوچ رکھنے والوں کے نظریہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور اُنہیں اپنی کتاب کے قاری کی نظر میں ایک نئے نظریہ کے موجود اور روشن خیال طبقہ کے عنوان سے متعارف کراتے ہیں کہ ''لیکن آج مادی سوچ رکھنے والے اسے مادہ کے ارتباط میں تلاش کرتے ہیں، گویا وہ اس نظریہ کو عصرِ حاضر کے کھاتہ میں ڈالنا چاہتے ہیں اور اسے مادی سوچ رکھنے والوں کی ایجاد کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔''

ڈاکٹر ارانی سے ایک سوال:

جناب ڈاکٹر صاحب سے پوچھنا چاہیے کہ آیا مادیت پرستی اور بقائے رُوح کی نفی کا تعلق صرف موجود زمانے سے ہے اور اس نظریہ کو میٹریالزم بالٹک کے طرفداروں نے دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے؟ آیا یہی لوگ اس مفروضہ کے موجود ہیں کہ مادی اجزاء کے درمیان مخصوص زمانی اور مکانی رابطہ کی وجہ سے ذی رُوح پیدا ہوتا ہے؟ آیا انہی لوگوں نے پہلی بار دُنیا کے سامنے اس نظریہ کو پیش کیا ہے کہ ''مخصوص زندہ مادی اجزاء کے رابطے کا نام رُوح ہے۔''

حیات اور رُوح کے بارے میں مادیت اور مادی نظریہ قدیم زمانے سے چلے آرہے ہیں اور اُن کا تعلق نہ تو آج سے ہے اور نہ ہی مادی سوچ رکھنے والوں سے ہے لہٰذا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے۔

ذی رُوح کی پیدائش کے بارے میں قدیم نظریہ:

علامہ مجلسی رضوان اللہ علیہ نے آج سے چار سو قبل ان لوگوں کے افکار و عقائد کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے جو ان سے کئی سو سال قبل موجود تھے۔ اور اس دور کے رائج اور مقبول نظریہ کے مطابق دُنیا کو عناصر اربعہ (آگ، ہوا، مٹی اور پانی) کا مجموعہ سمجھتے تھے۔ اور زندہ، صاحب عقل و ادراک اور تمام انسانی صفات سے موصوف مخلوق یعنی انسان کے بارے میں اُن کا جو نظریہ تھا وہ اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ سب سے پہلا نظریہ وہی ہے جسے ڈاکٹر ارانی نے مادی سوچ رکھنے والوں کے کھاتہ میں ڈالا ہے۔ چنانچہ علامہ مجلسی مرحوم فرماتے ہیں۔

عناصر اربعہ کا توازن:

"العقول الاوّل ان العناصر الاربعة اذا متزجت وانکسرت سُورة کل واحد منها بسورة آخر حصلت کیفیة معتدلة ھی المزاج ومراتب ھذا المزاج غیر متناھیة فبعضھاھی الانسانیة و بعضھاھی الفرسیة فالانسان عبارة عن اجسام موصوفة بکیفیات مخصوصة معتدلة متولدة عن امتزاجات اجزاء العناصر بمقدار مخصوص وھذا اقول جمھور الاطباء ومنکری بقاء النفس۔"

قول اوّل: اربعہ عناصر جب آپس میں مل جاتے ہیں اور ہر عنصر دوسرے عنصر کی سختی اور شدت کو توڑ دیتا ہے تو معتدل کیفیت وجود میں آجاتی ہے، جیسے مزاج کہتے ہیں۔ اور مزاج کے مرتبے اور درجے بے حدود انتہا ہیں، یعنی ترکیبی مواد کی تعداد اور اُن کی آپس میں ملنے کی کیفیت، چنانچہ کچھ تو ان میں سے انسانی مزاج ہوتے ہیں اور کچھ گھوڑے کے مزاج بنا بریں انسان ان عناصر اور اجسام کا مجموعہ ہے جن کی اپنی مخصوص صفات اور کیفیات ہوتی ہیں، متوازن اور موزون ہوتی ہیں، اور یہ موزون مجموعہ جو مختلف عناصر کے اجزاء کی ترکیب اور معین اور مخصوص مقدار میں وجود میں آتا ہے۔ اور یہ بہت سے اطباء اور بقائے رُوح کے منکرین کا نظریہ ہے۔"[1]

---

[1] السماء والعالم ص ۳۹۰

ابوالحسین بصری کا نظریہ:

فرید وجدی اپنی کتاب ''دائرۃ المعارف جد ۴ صفحہ ۳۴۸ میں کلمہ ''روح'' کی ذیل میں کہتے ہیں۔

"عن ابی الحسین بصری من المعتزلة: ان الانسانية عبارة عن امتزاجات اجزاء العناصر بمقدار مخصوص وعلی نسبة معلومة تحص هذا الصنف۔"

''یعنی ابوالحسین بصری جو معتزلہ سے ہیں، کہتے ہیں کہ انسانیت عناصر کے ایسے اجزاء کی ترکیب کا نام ہے جو مخصوص اندازہ، معلوم اور مقررہ نسبت سے انسانی ساخت کے کام آتی ہے۔ اور یہ ترکیب کائنات کی تمام زندہ چیزوں میں سے صرف صنفِ انسانی کے ساتھ مخصوص ہے۔''

ڈاکٹر ارانی کی غلط سوچ:

انسانی رُوح کے بارے میں جو کہ انسانیت کا معیار ہے ڈاکٹر ارانی نے جس نظریہ کو اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے (آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اسے آج کی دنیا میں میٹریالزم ڈیالٹک کے کھاتے میں ڈالا ہے جبکہ کئی سو سال پہلے میٹریا بولزم بالٹک کے بانی پیدا نہیں ہوئے تھے، کچھ اطباء اور معتزلہ اور غیر معتزلہ دُنیا کے سامنے پیش کر چکے ہیں اور خوش قسمتی سے نظری علوم THEORTICAL اور تجربی علم النفس EXPERIMANTAL BSYCHOLOGY کی پیشرفت کی وجہ سے یہ نظریہ کمزور پڑتا جارہا ہے اور جوں جوں وقت گزرتا جارہا ہے اور انسانی علم وسعت حاصل کرتا جارہا ہے مادیون اور مُنکرین رُوح کا مفروضہ تزلزل کا شکار ہوتا جارہا ہے۔

اس تمام بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام انبیاء علیہم السلام نے وحی کے ذریعہ متفق القول ہو کہ یہ حقیقت لوگوں تک پہنچائی ہے کہ انسان کے اندر جاودانی رُوح موجود ہے جس پر عقل وانسانیت، خدائی فرائض کی ادائیگی اور پروردگار کے امر ونہی کی بُنیاد استوار ہے۔ جسم کے مرنے کے ساتھ اُسے موت نہیں آتی اور اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک باقی اور پائیدار عالم کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔ ادیانِ الٰہی کے سچے پیروکار ہزاروں صدیوں سے اس کی بقا پر ایمان رکھتے چلے آرہے ہیں۔

سائنسی ترقی اور روحیون کا نظریہ:

لیکن تمام مادی مکاتب فکر کے پیروکار مختلف نظریات رکھنے کے باوجود بُنیادی طور پر ماوراء طبیعت کے منکر ہیں۔ ان کے نزدیک کائنات اور مادہ ایک چیز ہیں اور غیر مادی رُوح کے وجود کا کھلم کھلا انکار کرتے ہیں لیکن دورِ حاضر میں سائنسی

اور علمی پیشرفت اور روحیون کے نظریہ کے قوی ہوجانے کی جہ سے راسل جیسے دانشور اور فیلسوف کو بھی رُوح کے انکار کرنے میں پس وپیش سے کام لینا پڑا اور واضح طور پر وہ اس کا انکار نہ کرسکے۔ اور جیسا کہ بتایا جاچکا ہے اُنہیں روحیون کے دلائل کے بارے میں کہنا پڑا۔'' لیکن اس بات کو ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ ہوسکتا ہے یہی کمزور دلائل کسی بھی وقت وزنی ہوجائیں، اگر ایسا ہوگیا تو مرنے کے بعد کی زندگی کو نہ ماننا سائنسی اور علمی افکار کے منافی ہوگا۔''

خدا پرست فلاسفہ اور رُوح کا نظریہ:

اب رہے خدا پرست فلاسفہ تو اُن کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ تو مکمل طور پر جاودانی رُوح کے نظریہ کا حامی ہے اور ان لوگوں کا ایمان ہے علم ودانش اور سائنس کو جتنا ترقی ہوگی اُتنا ہی اُن کے نظریہ کو تقویت پہنچے گی اور اس کے حامیوں میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، لیکن دوسرا گروہ اُن لوگوں پر مشتمل ہے جس کے نزدیک بقائے رُوح کے دلائل اس قدر قانع اور تسلی بخش نہیں ہیں جو روحیون کے نظریہ کی تائید کرتے ہوں، البتہ وہ اس نظریہ کے متعلق یہ خوش فہمی رکھتے ہیں کہ مستقبل میں جب علم اور سائنس کو ترقی ہوگی تو روحیون کے نظریہ کو بھی تقویت پہنچے گی اور وہ مستحکم ہوگا۔

روحیون اور تجربی دلائل:

غیر مادی رُوح اور مرنے کے بعد کی زندگی کے ثبوت پر علمی اور فلسفی دلائل کے علاوہ اور بھی بہت سے دلائل ہیں جو مغربی ممالک کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ اور مشرقی ممالک کی کتب میں کم وبیش موجود ہیں، جیسے افکار کی قرائت THOUGHTS READING رُوحوں کا حاضر کرنا TO SOMMON THE SPIRITS OF THE DEAD CELLS مصنوعی خواب کے ذریعہ مُردوں سے رابطہ پیدا کرنا اور اس قسم کے دوسرے اُمور۔ ان دلائل کو حسی یا تجرباتی دلائل کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے اور موجود دور کے ان لوگوں کے لیے بھی بڑی حد تک قانع اور تسلی بخش واقع ہوسکتے ہیں جو تمام مسائل کو حس اور تجربہ کے ذریعے جاننے کے خواشمند ہوتے ہیں اور ان کے قلبی اطمینان اور ذہنی سکون کے لیے زیادہ مفید ہیں۔ ان اُمور سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ان موضوعات پر لکھی گئی کتابوں کی طرف رُجوع کرسکتے ہیں۔

خواب اور رُوحوں سے رابطہ:

ایک اور امر جو رُوح کی بقاء اور مرنے کے بعد کی زندگی کے اثبات کے لیے دلیل بن سکتا ہے وہ سچے خواب ہیں اور وہ اس طرح کہ بسا اوقات انسان اپنے فطری خواب کے ذریعہ کسی مرنے والے کی رُوح سے رابطہ پیدا کرلیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان گفتگو عمل میں آتی ہے اور وہ رُوح اسی گفتگو کے دوران ایک انجانی اور غیر معلوم حقیقت کے بارے میں مطلع

کرتی ہے۔ جب انسان نیند سے بیدار ہوتا ہے اور اس بارے میں تحقیق و جستجو سے کام لیتا ہے تو اُسے معلوم ہوجاتا ہے کہ عالم خواب مین متوفی کی رُوح کی بتائی ہوئی باتین سچی تھیں اور اُس نے اپنی باتوں کے ذریعہ ایک مخفی راز سے پردہ اُٹھایا ہے۔

رویائے صادقہ اور مرنے والوں کی ارواح سے رابطہ کے بارے میں جو بحث کا اصل مقصد ہے مزید تفصیل سے گفتگو کی جاتی ہے تا کہ کسی حد تک مطلب واضح ہوجائے۔ سب سے پہلے مختصر طور پر خواب کے بارے میں لوگوں کے قدیم وجدید افکار اور خیالات پر گفتگو ہوگی۔

خواب اور مادی منطق:

''انسان نہایت ہی قدیم زمانہ سے خوابوں کی تعریف اور توجیہ کرتا آرہا ہے۔ وہ اس طرح کہ کچھ لوگ، تمام یا کچھ خوابوں کو اعجاز آمیز یا آسمانی اور خدائی بنیادوں کا حامل سمجھتے تھے اور ساتھ ہی ایک افسانوی رسم ورواج کے تحت ان کا یہ عقیدہ بھی تھا چونکہ خواب میں پیشگوئیاں اور اسرار پائے جاتے، لہٰذا ہر شخص ان کے ادراک پر قادر نہیں ہے۔''

پھر اُن کے بعد کچھ اور دانشور آئے جو اصالتِ عقل کے قائل تھے جنھوں نے افکار انسانی میں بڑی حد تک تبدیلی پیدا کی۔ (یہ تقریباً سولھویں اور سترہویں صدی کی بات ہے) اُنہوں نے خوابوں کی افسانوی حیثیت کو یکسر مسترد کردیا اور ان کا مرکز انسان کی اندرونی اور جسمانی کیفیت کو بتلایا۔ یہ لوگ خوابوں کی روحانی خصوصیت کے مُنکر تھے اور بطور خلاصہ اُن کا نظریہ یہ تھا: ''کہ خواب دراصل نیند کی حالت میں انسانی اعضاء کے افعال اور اس کے بعض خلیّوں CELLS کی فعالیت کا معلول ہوتے ہیں تو اس طرح سے ان فلاسفہ اور دانشوروں نے قدیم لوگوں کے مفروضات کی تردید کے ساتھ ساتھ اپنی طرف سے ایک خشک مادی منطق کو قبول کرلیا جس سے وہ زبردست غلطی کا شکار ہوکر رہ گئے اور خوابوں کی واقعی زندگی کے ساتھ مطابقت سے مانع ہوگئے۔[1]

''ان دونوں نظریات کے حامل افراد کے برعکس فرائڈ نے خوابوں کے لیے ایک نفسیاتی خصوصیت کا نظریہ پیش کیا، یعنی خوابوں کے لیے ایک افسانوی بنیاد مہیا کرنے کی بجائے اُنہیں مادی بُنیاد فراہم کی اور اسی بنیاد پر اُس نے خوابوں کے عمل پر تحقیق جاری رکھی۔ فرائڈ کے بقول خوابوں کا مسئلہ علم تشریح الابدان کے ماہرین ANATOMISTS کے لیے ایک شاہرہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اُنہیں اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ انسان کے باطنی وجدان میں کاوش اور تحقیق سے کام لیں۔

---

[1] اندیشہ ہائے فروید، ص ۳٦

خواب اور نفسیاتی تجزیہ:

خواب زبردست اور قوی نفسیاتی تجزیہ کرنے والوں PSYCHOANALYSTS کے لیے ایک پُل کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے ذریعہ وہ خواب دیکھنے والوں کے وجود کی گہرائیوں میں رسُوخ پیدا کر سکتے ہیں، ان کے باطنی اسرار سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں، ان کے اندرونی عقدوں کی گرہ کشائی کر سکتے ہیں اور اگر ہو سکے تو ان کی ذہنی پریشانیوں کو دُور کر کے اُنہیں ذہنی اور قلبی آرام بہم پہچا سکتے ہیں۔

خواب اور پُوری نہ ہونے والی خواہشات:

فرائڈ کے عقیدہ کے مطابق خواب، باطنی ضمیر اور ظاہر نیز مخفی اور ظاہری زندگی کے درمیان ایک رابطہ ہوتا ہے سر کوب شدہ خواہشات، رندہ شدہ رجحانات، پُوری نہ ہونے والی شہوات، نامکمل آرزوئیں، باطنی دُشمنیاں، اندرونی کینے، انتقام لینے کی خواہشیں، غرض کہ ہر قسم کی شکست، محرومیت، آرزوئیں اور ناکامیاں جو دل میں جمع ہوتی ہیں اور اُن کے پورا ہونے کی صُورت نظر نہیں آتی، خواب میں اُنہیں پورا ہونے کا موقع ملتا ہے اور اُن کی وہاں پر حسبِ منشا تکمیل ہوتی ہے۔

''کلی طور پر عالمِ خواب میں جو کچھ ہمارے لیے مجسم ہوتا ہے۔ وہ خواہشات اور حسّی چیزیں ہوتی ہیں جن کی طرف ہم دن کو متوجہ ہوتے ہیں لیکن کسی نہ کسی وجہ سے وہ پُوری نہیں ہو پاتیں یا اُن کے پورا ہونے سے ہم زبردستی پرہیز کرتے ہیں۔ جس شخص کی دن کو اپنی دل پسند عورت تک رسائی نہیں ہوسکتی، رات کو عالم خواب میں اس پر قابو پالیتا ہے۔ بھوکا گداگر عالم خواب میں اپنے آپ کو دولت مند اور محلات کا مالک دیکھتا ہے۔ بدصورت شخص خواب میں بے مثال خوبصورتی سے آراستہ ہوجاتا ہے۔ اذکار افتادہ اور نحیف وناتواں بوڑھا خود کو طاقتور جوان میں تبدیل پاتا ہے۔ مایوس انسان خواب میں اپنی آرزوؤں کی تکمیل دیکھتا ہے۔ غرض جن خواہشات کی دن میں تکمیل نہیں ہو پاتی خواب کی حالت میں وہ پوری ہوتی دکھائی دیتی ہیں اور جو جذبات بعض وجوہات کی بنا پر چھپے رہنے چاہئیں وہ آشکار ہوجاتے ہیں۔''[1]

خواب کے بارے میں فرائڈ کا نظریہ:

فرائڈ کے نظریہ کے مطابق خوابوں کا نامعلوم مستقبل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور آئندہ کل کے بارے میں کوئی خبر نہیں دیتے بلکہ اُن کا تعلق گزشتہ کل سے ہوتا ہے اور ان اچھی یا بُری باتوں سے ہوتا ہے جو انسان پر گزر چکی ہوتی ہیں۔ خواب

---

[1] کتاب فرید ص ۲۳

کبھی تو مخفی جرائم کو ظاہر کرتے ہیں۔ کبھی ان خوشنما مناظر کی تجدید کرتے ہیں جو ہم زندگی میں دیکھ چکے ہوتے ہیں اور کبھی گذشتہ محرومیوں اور نا کامیوں کو پُورا کرتے اور شکست سے دو چار آرزوؤں کی تکمیل کرتے ہیں۔

خواب کے بارے میں بیان کردہ یہ تینوں نظریے اپنی جگہ پر صحیح ہیں اور ہر قسم کے خوابوں کی اقسام کی توجیہہ کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی مکمل اور جامع نہیں ہے اور خواب کی تمام قسموں کے بارے میں تسلی بخش جواب نہیں دے سکتے۔

خواب اور باطنی ضمیر:

بعض اسلامی روایات میں ملتا ہے کہ خواب کی تین قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہوتی ہے جس کے مضامین اور متعلقات خواب دیکھنے والے کے باطنی یا ظاہری ضمیر میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ خواب کی یہ قسم وہ ہے جس کے متعلق فرائڈ نے نفسیاتی تجزیہ کے سلسلے میں گفتگو کی ہے اور تجزیہ نگار اس طرح سے خواب دیکھنے والے کے مافی الضمیر سے آگاہ ہوسکتا ہے۔

ابنِ سیرین اور نفسیاتی تجزیہ:

بعض اہل مغرب کا گمان ہے کہ فرائڈ اس روش کا موجد ہے اور وہ پہلا شخص ہے جو اس حقیقت سے آگاہ ہوا ہے اور خواب کے ذریعہ انسان کے افکار تک پہنچنے کی بات کی ہے، حالانکہ وہ اس بات سے غافل ہیں کہ یہ چیز اسلامی محفلوں میں قدیمی شمار ہوتی ہے جیسا کہ کتاب ''حصہ اوّل کے نفسیاتی تجزیہ کی فصل میں تفصیل سے مذکور ہے۔ ابنِ سیرین آج سے بارہ صدی قبل خوابوں کی تعبیر کے ذریعہ لوگوں کے مافی الضمیر سے مطلع ہوئے، حتیٰ کہ بعض مقامات پر تو عظیم جرائم سے پردہ بھی اٹھایا اور مجرمین عدالت کے کہٹرے تک پہنچائے۔

خوابوں کی دوسری قسم وہ ہوتی ہے جس کے متعلقات صرف پریشان اور آوارہ افکار و خیالات ہوتے ہیں۔ دینی اصطلاح میں ایسے خوابوں کو ''اضغاث اعلام'' کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی پریشان خیالی کے شکار وہ لوگ ہوتے ہیں جو ہمیشہ جاگتے رہتے ہیں پھر رات کو بے خوابی سے دو چار ہوتے ہیں۔

خواب اور مستقبل:

تیسری قسم وہ ہوتی ہے جس میں غیب کی خبریں اور الہامی پہلو مضمر ہوتے ہیں یا تو انجانے مستقبل کی خبریں دیتے ہیں یا انجانے حقائق سے پردہ اُٹھاتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں اس قسم کے خوابوں کی مادی منطق یا نفسیاتی تجزیہ سے کوئی تفسیر یا توجیہ نہیں کی جاسکتی۔

حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"الرئویاثلثة. بشریٰ من الله وتحزین من الشیطان والذی یحدث به الانسان نفسه فراه فی منامه"

''یعنی خواب تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو فیضِ الٰہی کی خوشخبری دیتے ہیں۔ دوسرے وہ افکار شیطانی ہوتے ہیں جو رنج وغم کا باعث بنتے ہیں۔ تیسرے وہ باتیں ہوتی ہیں انسان بیداری کی حالت میں جن کی فکر میں ہوتا ہے۔''[1]

گویا وہ اپنے دل میں ایسی چیزوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہے اور جب سوجاتا ہے تو اُنہیں عالمِ خواب میں مشاہدہ کرتا ہے۔

مخفی حقائق کا انکشاف:

جو خواب الہام کی صورت میں ہوتے ہیں اور خواب دیکھنے والے مرنے والوں کی ارواح سے رابطہ پیدا کرتے ہیں وہ مخفی رازوں یا غیر معلوم مستقبل کے بارے میں آگاہ ہوتے ہیں بہت ہیں۔ اور دُنیا کی مختلف اقوام اور ملتوں میں بارہا وقوع پذیر ہوچکے ہیں جن میں سے ہر ایک مادہ کے ماوراء کی دُنیا پر دلالت کرتے ہیں، چنانچہ گفتگو کی مناسبت سے یہاں پر اس قسم کے خوابوں میں سے ایک کی تشریح کی جاتی ہے۔

عدالت کے ایک جج جو ایک عرصہ تک ہمدان میں اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہے ہیں کہتے ہیں کہ ہمدان میں میری ایک محترم شخص سے دوستی تھی، اُس نے کسی سے قرض لیا اور اُسے پرونوٹ کر دیا کہ اس کا یہ قرض فلاں عرصہ تک ادا کر دے گا۔ جب مقررہ مدت پہنچ گئی وہ رقم اسے واپس کرنے کی غرض سے اُس کے پاس گیا اور اس پرونوٹ کی واپسی کا مطالبہ کیا، لیکن قرض خواہ نے کہا آپ کا پرونوٹ کہیں کھو گیا ہے اگر آپ راضی ہوں تو میں اس کی وصولی کی رسید آپ کو لکھ دیتا ہوں۔ اُس نے یہ بات قبول کر لی اور اُس سے رسید لے لی۔ میں بھی اس واقعے سے مطلع ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد میرا دوست فوت ہو گیا اور تھوڑے ہی دنوں بعد قرض خواہ کو وہ پرونوٹ کہیں سے مل گیا، چنانچہ وہ یہ پرونوٹ لے کر متوفی کی بیوہ کے پاس پہنچا اور اپنی رقم کا مطالبہ کیا، وہ عورت اس تمام صُورت حال سے آگاہ تھی، اُس نے کہا میرے شوہر نے تو وہ رقم تمہیں واپس کر دی ہے اور تم نے اس کی وصولی کی رسید لکھ دی ہے۔ اُس نے کہا، تو پھر میری وہی رسید لے آئیے۔ اس خاتون نے رسید کی تلاش کے لیے وقت مانگا، تلاشِ بسیار کے باوجود وہ رسید نہ ملی، چنانچہ قرض خواہ نے

---

[1] بحارالانوار جلد ۱۴ ص ۴۴۱

مقدمہ میری عدالت میں دائر کر دیا۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ میرے دوست نے وہ رقم ادا کر دی ہے لیکن عدالتی تقاضوں کے پیشِ نظر میں نے اس کی درخواست پر غور کیا اور متوفی کی بیوہ کو بھی اس کی اطلاع کر دی، اور کہا جیسا بھی ہو وہ رسید عدالت میں لے آئے۔

راز فاش کرنے والا خواب:

اس خاتون نے ہر چند تلاش کی کوشش کی لیکن اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا میں مجبور ہو گیا کہ مدعی کے حق میں فیصلہ کر دوں کہ عورت نے خواب میں اپنے شوہر کو دیکھا اور اُس سے پوچھا کہ "آیا آپ نے فلاں شخص کا قرض واپس نہیں کیا؟" اُس نے جواب دیا کہ "میں نے قرض واپس کر کے اُس سے رسید بھی لے لی ہے۔" عورت نے پوچھا" تو وہ رسید کہاں ہے۔" اُس نے جواب دیا" وہ رسید ہمارے گھر میں نہیں ہے بلکہ میں نے عدالت کے فلاں وکیل کو دی ہے اور اُس نے اُسے دُعا کی فلاں کتاب میں رکھ دیا ہے، جاؤ اور اُس سے وہ لے لو۔"

چنانچہ صبح سویرے وہ خاتون اسی وکیل کے پاس گئی اور جیسا کہ اُس کے شوہر نے اُسے خواب میں بتایا تھا سارا ماجرا بیان کیا، وکیل نے دُعا کی اسی کتاب سے وہ رسید نکالی اور عورت کے حوالے کر دی اور عورت نے اُس رسید کو عدالت میں پیش کیا اور فیصلہ عورت کے حق میں ہو گیا اور مقدمہ یوں اپنے اختتام کو پہنچا۔

اس خواب اور اس قسم کے دوسرے خوابوں کی صرف بقائے رُوح کی بُنیاد پر ہی توجیہ وتفسیر ہو سکتی ہے، لیکن فرائڈ اور دوسرے مادی لوگ ایسے خوابوں کی بات نہیں کرتے جب کہ اس طرح کے خواب ساری دُنیا میں دیکھے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کا تعلق مادیت سے ہے اور وہ ایسی کوئی بات نہیں کرتے اپنے منہ سے نہیں نکالنا چاہتے جو اُن کے خلاف ہو۔

اس فصل میں مذکورہ تمام بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف انبیاءہی نے مکتبِ دین کی روشنی میں بقائے رُوح اور مرنے کے بعد کی زندگی کے بارے میں گفتگو نہیں کی، بلکہ کل اور آج یعنی قدیم وجدید دور کے فلاسفہ اور سائنسدان بھی بقائے رُوح کے حامی ہیں اور اس کے ثبوت پر کئی دلائل قائم کئے ہیں، بنابریں کوئی بھی مادی محقق اور دانشور خود کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مرنے کے بعد کی زندگی کی دوٹوک الفاظ میں نفی کریں، بلکہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ راسل کی مانند یہی کہیں کہ "میرے خیال میں رُوح کے منکرین کے دلائل، روح کے ماننے والوں کے دلائل سے زیادہ قوی ہیں۔" لیکن اس قسم کی باتیں ایک مادی شخص کی روح کو تسکین نہیں دے سکتیں، مرنے کے بعد کی ذمہ داریوں کے احتمال کو اس کے دل سے دُور نہیں کر سکتیں اور اس کی اندرونی تشویش و پریشانی کو بھی زائل نہیں کر سکتیں۔

اسی لیے اسلام کے ذی وقار پیشوا بعض مواقع پر اسی رُوحانی حالت سے استفادہ کیا کرتے تھے اور بعض مادی اور لیچڑ قسم کے افراد کے ساتھ ان کی احتمالی ذمہ داریوں کے حوالہ سے گفتگو کیا کرتے تھے۔

امام جعفر صادقؑ اور ابن ابی العوجاء:

چنانچہ حضرت امام جعفر صادقؑ کے زمانہ میں ایک مشہور و معروف مادی شخص رہتا تھا جس کا نام عبدالکریم ابن ابی العوجا تھا۔ وہ مدینہ کا باشندہ تھا اور عام طور پر امام علیہ السلام کی خدمت میں شرفیاب ہوکر اپنے مسائل پیش کرتا اور اُن کے جواب سنتا تھا، حتیٰ کہ کبھی کبھی حج کے دنوں میں مکہ بھی چلا جایا کرتا تھا تا کہ ایک تو لوگوں کے اعمال حج کو اپنی آنکھوں سے دیکھے اور دوسرے امام علیہ السلام سے بحث و مباحثہ کرے۔ وہ شخص آخر تک اسی طرح مادی ہی رہا اور خداوند عالم اور اسلامی تعلیمات پر ایمان نہ لایا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں حج کے موسم میں مکہ گیا اور جب راہ میں پہلی مرتبہ امام علیہ السلام کے مُلاقات ہوئی تو بڑے احترام اور ادب سے پیش آیا اور آقا و مولا کہہ کر پکارتا رہا۔

"فقال له العالم ماجاء بكَّ الى هذا الموضع؟ فقال عادة الجد وسنة البلد ولنظر ما الناس فيه من الجنون والحلق ورمى الحجارة! فقال العالم انت بعد على عتوكَ وضلالك يا عبدالكريم! فذهب يتكلمه فقال له لاجدال فى الحج ونفص ردائه من يده وقال ان يكن الامر كما تقول وليس كما تقول بخونا ونجوت وان يكن الامر كما نقول وهو كما نقول نجونا وهلكت. فاقبل عبدالكريم على من معه فقال وجدت فى قلبى حزازة فردونى فردوه فمات۔"

''یعنی امام جعفر صادق علیہ السلام نے ابن ابی العوجا سے پُوچھا تمہیں یہاں پر کیا چیز لے آئی ہے؟ اُس نے جواب دیا ایک تو جسمانی عادت اور دوسرے اپنے علاقہ کے آداب ورُسوم اور پھر یہ کہ لوگوں کی جنون آمیز حرکتوں، سرمنڈانے اور پتھر پھینکنے جیسے کاموں کا تماشا کروں۔ امام علیہ السلام نے فرمایا، تم ابھی تک اپنی اسی استکبار اور اسی گمراہی پر قائم ہو! یہ کہا اور چل پڑے اور اس سے فرمایا حج میں مجادلہ جائز نہیں۔ پھر آپ نے اپنی عبا کے دامن کو جھاڑتے ہوئے فرمایا: جو کچھ تم کہتے ہو اگر وہ حقیقت ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے، تو تم اور ہم دونوں نجات پا گئے۔ اور اگر جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ حقیقت ہے اور ہے بھی ایسا، تو ہم نجات پا گئے اور تم ہلاک ہو گئے۔''

اس موقع پر ابن ابی العوجاء نے اپنے ساتھیوں سے کہا میرے دل میں درد تکلیف محسوس ہو رہی ہے مجھے گھر لے چلو، چنانچہ وہ اُسے گھر لے گئے اور تھوڑے عرصے کے بعد وہ اس دُنیا سے چل بسا۔''

مجلس نمبر 5

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَجَآءَتۡ سَکۡرَۃُ الۡمَوۡتِ بِالۡحَقِّ ؕ ذٰلِکَ مَا کُنۡتَ مِنۡہُ تَحِیۡدُ ﴿۱۹﴾ (قرآن کریم)

موت یا آخرت کی زندگی کا آغاز:

زندگی کی بساط لپیٹ دی جاتی ہے، موت آ کر رہتی ہے اور دُنیاوی زندگی اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ رُوح جو کہ انسانی شخصیت کا معیار ہے سرائے جاودانی کی طرف منتقل ہوجاتی ہے اور عالمِ آخرت کی زندگی کا آغاز ہوجاتا ہے۔

نظامِ خلقت میں، موت اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور اس کی حقیقت زندگی کی حقیقت کی مانند اب تک نامعلوم ہے۔ سائنسی ترقی کے دور میں انسان نے فطرت کی تاریک گہرائیوں تک تو رسائی حاصل کرلی ہے لیکن موت اور زندگی کی حقیقت سے ابھی تک آشنائی حاصل نہیں کرسکا اور ان دوحیران کُن اور تعجب آور چیزوں کی واقفیت سے آگاہ نہیں ہوسکا۔ یہی وجہ ہے کہ موت وحیات کی تعریف اور تعارف کے مواقع پر عُلماء اور دانشوران کی صفات اور خصوصیات کو تو بڑی شدّ ومد سے بیان کرتے ہیں۔ لیکن ان کی حقیقت اور واقعیت کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتے۔

قضا اٹل ہے:

انسان علمی اور سائنسی طاقت کے ذریعہ تو موت کے خدائی فیصلے کو ٹال سکتا ہے اور نہ ہی خدا کی اس تقدیر کو ختم کرسکتا ہے اور ہر انسان کو جلد یا بدیر اس حتمی انجام کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور چار ونا چار دُنیا کو خیر باد کہہ کر دوسروں کو اپنی جگہ دینی پڑتی ہے۔

دودر دراین باغ آراستہ
دروبندازین ہر دو برخاستہ
درآی ازدر باغ وبنگر تمام
زدیگر در باغ بیرون خرام
دراین باغ ہر دم بری می رسد
یکی می رود دیگری می رسد

(یعنی اس سجے سجائے (دنیاوی) باغ کے دروازے ہیں۔ایک دروازے سے اس باغ کے اندر آ کر سب کچھ دیکھواور دوسرے سے ٹہلتے ہوئے نکل جاؤ۔اس باغ میں ہر وقت میوے لگے رہتے ہیں۔ ایک جارہا ہوتا ہے تو دوسرا آ رہا ہوتا ہے۔

ہم کہاں جارہے ہیں؟ موت کی طرف! اگر ہمارے بس میں ہو تو نت نئے انکشافات وایجادات کے ذریعہ اپنی فزیالوجی کی سمت کو تبدیل کردیں اور ہمیشہ جوان سے جوان تر رہیں اور زندگی کو دو تین سو سالوں تک لے جائیں پھر بھی موت پر غالب نہیں ہو پائیں گے کیونکہ انسان کی جسمانی ساخت کی ضرورت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ رحمِ مادر میں بچے کی زندگی کے پہلے ہی دن سے انسانی جنین بڑھاپے کی طرف رہسپار ہونا شروع کر دیتا ہے اور بڑھاپے کی رفتار جنین، نومولود اور خوردسال بچے میں بالغ افراد بالخصوص بوڑھوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔اور اس میں شک نہیں کہ سن کے بڑھنے کے ساتھ موت کی طرف پیش قدمی کی رفتار سُست پڑتی جاتی ہے۔لیکن رکتی بھی نہیں اور نہ ہی اپنی سمت کو تبدیل کرتی ہے۔مستقبل میں سائنس کی ترقی خواہ کچھ ہو ہر انسان اس فیصلے کا پابند ہے کہ اسے جلد یابدیر اس دُنیا کو خیر باد ضرور کہنا ہے)[1]

موت کی پہچان کے لیے انسانی کوششیں:

بشر نے آغاز ہی سے موت کی شناخت کے لیے بڑی تگ ودو جاری رکھی ہوئی ہے اور اس کی ہمیشہ یہ جاننے کی کوشش رہی ہے کہ آخر یہ کیا چیز ہے جو انسانی زندگی کی بساط لپیٹ کر اُسے ہمیشہ کے لیے ختم کردیتی ہے؟ ہر دور میں علماء اور دانشوروں نے موت کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کی ہے اور اس کی بعض جہات پر تحقیق وریسرچ کے بعد اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے، جن میں سے کچھ تو قابلِ قبول اور کچھ ناقابل تسلیم۔اور کچھ نظریات ایسے ہیں جن کے بارے میں ماضی اور حال میں اختلاف رہا ہے۔اور چونکہ ہماری کتاب کی یہ فصل موت کے مسئلہ سے مخصوص ہے لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کرام کی معلومات میں اضافہ کے لیے اس سے متعلق چند ایک مسائل پر تفصیل سے گفتگو کی جائے۔

آیا موت ایک عدمی چیز:

ا۔قدیم اور متاخرین کی کتابوں میں موجود مسائل میں سے جو مسئلہ ہمیشہ دانشوروں کے پیشِ نظر اور محل بحث رہا ہے۔وہ یہ کہ آیا موت ایک موجود حقیقت اور خلق شدہ امر ہے یا نہ بلکہ ایک عدمی امر ہے جس کا معنی زندگی اور حیات کا نہ ہونا ہے۔

---

[1] راہ ورسم زندگی ص ۱۴۱

یہ بحث اس لیے پیش آئی ہے کیونکہ ثنویہ (دوخداؤں کے قائل DUALISTS کہتے ہیں کہ اس دُنیا میں اچھائیوں اور خوبیوں کے ساتھ ساتھ برائیاں بھی موجود ہیں یعنی خیر کے ساتھ شر کا وجود بھی ہے۔ اور جس طرح خیر کو تخلیق کیا گیا ہے اسی طرح شر بھی خالق کا محتاج ہوتا ہے۔ چونکہ خوبیوں اور خیر کا خدا برائی اور اس کی تخلیق سے منزہ سے منزہ مبرّا ہے لہٰذا مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اس کائنات کے دو مبداء (خدا) ایک مبدائے خیر اور دوسرا مبدائے شر۔ مبدائے خیر اچھائیوں کا خالق ہے اور مبدائے شر برائیوں کا۔

ثنویہ کو جواب:

بعض خدا پرست فلاسفہ جو توحید خالق کے قائل تھے اور تمام کائنات کو خالق یکتا یعنی ذات پروردگار کی مخلوق سمجھتے تھے، ثنویہ کو ان لفظوں میں جواب دیا ہے کہ ''بُنیادی طور پر شر اور برائیاں عدمی چیزیں ہیں جنہیں خالق کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ مثال کے طور پر کہتے تھے کہ علم ایک خوبی (خیر) ہے اور جہالت ایک بدی (شر) ہے۔ علم ایک موجود واقعیت اور کھُلی حقیقت ہے جس کے وجود میں لانے کے لیے موجد کی ضرورت ہے، جبکہ جہالت ایک عدم (نیستی) اور عدم کو ہستی عطا کرنے والے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی طرح اُنہوں نے کاٹنے اور چیر نے پھاڑنے والے جانوروں کے بارے میں جواب دیا ہے جو لوگوں کی نگاہ میں شر اور بُرائیاں شمار ہوتے ہیں۔ اس بارے میں ان کا جواب دیا جو لوگوں کی نگاہ میں شر اور بُرائیاں شمار ہوتے ہیں۔ اس بارے میں ان کا جواب یہ تھا کہ ان کی بُرائی نہ تو ان کی اپنی جہات سے ہے اور نہ ہی اُن کی تخلیقی جہات سے بلکہ وہ اس لیے بُرے ہیں کہ انسان کی ہلاکت کا سبب بنتے ہیں اور موت زندگی کے نہ ہونے یا حیات کی نیستی کا نام ہے اور یہ ایک عدمی امر ہے اور عدم، مخلوق نہیں ہوتا تاکہ اُسے خالق کی ضرورت ہو۔

دوگانہ پرستوں کی غلط فہمی:

زیرِ بحث، مطلوب کو مزید واضح کرنے کے لیے اور قارئین گرامی کی معلومات میں مزید اضافہ کے لیے بعض خدا پرست فلاسفہ اور دانشوروں کے اقوال کو یہاں پر ثنویہ کے جواب کے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے جو موت کو عدم (نیستی) سمجھتے ہیں۔

ثنویت DUALISM دوگانہ پرستوں DUALISTS کے شُبہ کی بنیاد یہی ہے کہ وہ کائنات میں دو ہستیوں کو مانتے ہیں۔ ایک اچھائیوں (خیر) کی ہستی اور دوسری برائیوں (شر) کی ہستی۔ لہٰذا مجبوراً اُنہیں دو خداؤں کے وجود کو تسلیم کرنا پڑا۔ تاکہ خیر اور شر کا علیحدہ علیحدہ خداؤں سے تعلق ہو۔ درحقیقت ثنویہ نیکیوں کے خالق کو برائیوں کی تخلیق سے منزہ و مبرّا

سمجھنا چاہتے تھے لیکن افسوس کہ اس طرح سے اُنہوں نے اُسے شر اور عاجزی سے متہم کر دیا۔"[۱]

"شر عدم ہے: ایک سیدھے سادے اور عام سے تجزیہ کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ شر اور بُرائیوں کی اصل ماہیت عدم ہے یعنی تمام برائیوں کی نوع عدم اور نیستی ہے۔ یہ بات ایک تاریخی حیثیت کی حامل ہے اور بظاہر اس کے ڈانڈے قدیمی یونانی افکار سے ملتے ہیں۔ قدیم فلسفہ کی کتابوں میں اس فکر کی نسبت یونانیوں خاص کر افلاطون کی طرف دی گئی ہے۔ البتہ متاخرین نے اس فکر کی اور بھی تجزیہ و تحلیل کی ہے۔ اور چونکہ ہم اس مطلب کو زیادہ صحیح اور بُنیادی سمجھتے ہیں، لہٰذا یہاں پر کتاب کی مناسبت سے اسے کسی حد تک، بیان کریں گے۔"[۲]

عدم ذاتی اور مستلزم عدم:

"وجود اور عدم خارج میں دو حصوں پر مشتمل نہیں ہے۔ کیونکہ عدم کا معنی نہ ہونا اور نیستی ہوتا ہے اور اُسے وجود اور ہستی کے مقابل میں کوئی خاص مقام بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ جہاں پر وجود ہوتا ہے وہاں پر عدم کا اطلاق بھی ہوتا ہے۔ اچھائی اور بُرائی بھی ہستی اور نیستی کی مانند ہوتی ہیں، بلکہ بنیادی طور پر اچھائی عین برائی عین اچھائی ہوتی ہیں۔ جہاں پر بدی کی بات ہوتی ہے وہاں پر حتمی طور پر نیستی اور نہ ہونے کا عمل دخل ضرور ہوتا ہے۔ "بدی" یا تو خود نیستی کی نوع سے ہوتی ہے یا نیستی کو مستلزم۔ یعنی ایک موجود اس لحاظ سے کہ وہ "خود" ہے لہٰذا خیر ہے۔ اور اس لحاظ سے بد ہے کہ وہ نیستی کو مستلزم ہے۔ اور صرف اس لیے چونکہ نیستی کو مستلزم ہوتا ہے لہٰذا بد ہے نا کہ کسی اور وجہ سے۔"

"ہم جہالت، فقر اور موت کو بُرا سمجھتے ہیں کیونکہ یہ ذاتی طور پر نیستی اور عدم ہیں۔ اسی طرح کاٹنے اور پھاڑنے والے جانوروں کو بُرا سمجھتے ہیں کیونکہ وہ عدم اور نیستی کو مستلزم ہوتے ہیں۔

"جہالت" فقر اور موت کو بُرا سمجھتے ہیں کیونکہ یہ ذاتی طور پر نیستی اور عدم ہیں۔ اسی طرح کاٹنے اور پھاڑنے والے جانوروں کو بُرا سمجھتے ہیں کیونکہ وہ عدم اور نیستی کو مستلزم ہوتے ہیں۔

"جہالت" علم کا فقدان اور نہ ہونا ہے۔ جبکہ علم ایک حقیقت اور حقیقی کمال ہے لیکن جہالت کوئی واقعیت اور حقیقت نہیں ہے۔" "فقر" ناداری اور کسی چیز کے نہ ہونے کا نام ہے نہ کہ ہونے اور رکھنے کا۔

"موت" بھی کھونے کا نام ہے نہ کہ پانے کا۔ لہٰذا جو جسم حیات کی صفت کو کھو دیتا ہے اور جماد میں تبدیل ہو جاتا ہے وہ تنزلی پاتا ہے نہ کہ ترقی۔"

---

[۱] عدلِ الٰہی ص ۶۸

[۲] عدل الٰہی ص ۶۹

بُرائیاں عدم ہیں:

''لیکن کاٹنے اور چیز پھاڑ کرنے والے جانور، جراثیم، سیلاب، زلزلے اور آفات اس لحاظ سے بُرائیاں اور شر ہیں کیونکہ موت کا سبب بنتے ہیں یا کسی عضو یا توانائی کے ضائع ہونے کا موجب بنتے ہیں یا پھر ترقی اور صلاحیت کے کمال تک پہنچنے سے مانع ہوتے ہیں۔ اگر کاٹنے والے جانور موت یا بیماری کا سبب نہ بنتے تو شر اور بُرے نہیں تھے۔ اگر سیلاب اور زلزلے جانی اور مالی نقصان کا موجب نہ ہوتے تو بُرے نہیں تھے۔ بُرائی ان نقصانات اور کھودینے میں ہوتی ہے۔ اگر ہم کسی درندے کو بُرا سمجھتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ اُن کی ماہیت خاص بُری ہوتی ہے۔ بلکہ اس لیے بُرے ہیں کہ وہ دوسروں کی موت اور سلبِ حیات کا سبب بنتے ہیں۔ درحقیقت جو چیز ذاتی طور پر بُری ہے وہ زندگی کا فقدان ہے نہ کہ یہ چیزیں۔''[۱]

''اب جبکہ یہ بات واضح ہوگئی کہ بُرائیاں اور شر نیستی کی قسمیں ہیں، تو ثنویہ کا جواب بھی واضح ہوجاتا ہے۔ ثنویہ کی غلط فہمی یہ ہے چونکہ وہ دُنیا میں دوطرح کی موجودات کے قائل ہیں جس کی وجہ سے اُنہیں دوقسم کے مبدا اور خالق کو ماننا پڑا ہے۔ ہم اُن کے جواب میں کہتے ہیں کہ دُنیا میں ایک قسم کے موجود کے علاوہ اور کچھ نہیں اور وہ ہے خیر اور اچھائی، اور شر یا بُرائی عدم اور نیستی ہیں اور عدم کوئی مخلوق نہیں ہے۔ خلق نہ کرنے سے نیستی اور عدم نہ کہ خلق کرنے سے عدم اور نیستی، اس لیے اس جہاں کے دوخالق نہیں مانے جاسکتے کہ ایک ہستی (وجود) کا خالق ہو اور دوسرا نیستی (عدم) کا خالق ہو۔''[۲]

اس مقالے کے ضمن میں یہ الفاظ آئے ہیں۔ ہم جہالت فقر اور موت کو بُرا سمجھتے ہیں، کیونکہ یہ ذاتی طور پر عدم اور نیستی ہیں۔'' ان الفاظ کو پڑھنے والا جہالت اور موت کو ایک جیسا سمجھتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ جس طرح جہالت بُرائی اور شر ہے۔ اسی طرح موت بھی بُرائی اور شر ہے۔ جس طرح جہالت ذاتی طور پر عدم اور نیستی ہے اسی طرح موت بھی ذاتی لحاظ سے عدم اور نیستی ہے۔ جس طرح جہالت عدمی امر ہے اور عدم کو خالق کی ضرورت نہیں اسی طرح مرگ بھی عدمی امر ہے جسے خالق کی ضرورت نہیں، آیا اس قسم کا موازنہ اور مقائسہ صحیح ہے؟ آیا جہالت اور موت کو مقالہ کے مطابق ایک جیسا سمجھا جاسکتا ہے؟ ظاہری بات ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے، اور جہالت کو موت کے ساتھ قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

موت عدمی نہیں وجودی امر ہے:

جہالت علم کے مقابلے میں شر اور بُرائی تو ہے لیکن موت زندگی کے مقابلے میں صرف شر ہی نہیں بلکہ اپنی جگہ

---

[۱] عدل الٰہی ص ۷۱

[۲] عدل الٰہی ص ۷۳

خیر اور خوبی بھی ہے اور لازم اور ضروری بھی۔علم کے مقابلے میں جہالت ایک تو علم کی ضد ہے اور دوسرے ذاتی طور پر نیستی اور عدم بھی ہے۔لیکن موت زندگی کے مقابلے میں زندگی کی ضد تو ضرور ہے۔لیکن عدمی امر نہیں ہے بلکہ مثبت امر بھی ہے۔اور خود سے مخصوص میکنزم سسٹم بھی رکھتی ہے۔جہالت عدمی امر ہے مخلوق نہیں ہے کہ اسے خالق کی ضرورت ہو،اس کا وجود نہیں ہے تاکہ موجد کی محتاج ہو،لیکن موت وجودی چیز اور مخلوق ہے،کیونکہ خالق کائنات نے اسے پیدا کیا ہے اور ہستی کی نعمت سے نوازا ہے۔

موت کا حساب جہالت سے جدا کرنے اور یہ جاننے کے لیے کہ (۱) موت کا شمار دُنیا کی خیر اور خوبیوں میں ہوتا ہے۔تاکہ شر اور بُرائیوں میں۔(۲) یہ ایک وجودی امر ہے نہ کہ عدمی (۳) اور یہ خدا کی مخلوق ہے۔ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر مذکورہ تینوں اُمور پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جائے۔

موت کا قانون یا حکمت بھری روش:

اوّل: اس میں شک نہیں کہ موت اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے سالموں اور خلیّوں جیسی اپنی باریک سے باریک ترین مخلوق سے لے کر تمام برّی اور بحری مخلوق تک کو عطا فرمائی ہے۔اور تمام روئے زمین پر اُن کے لیے زندگی کو قابلِ برداشت بنایا ہے۔موت کا قانون خدا کی حکیمانہ مصلحتوں میں سے ایک مصلحت ہے جس کی وجہ سے عالم طبیعت میں زندگی کا توازن اور تعادل برقرار رہتا ہے اور زندگی بھی خوشگوار اور شیرینی معلوم ہوتی ہے۔

کہتے ہیں کہ انسانی جسم اپنی طبعی عمر کے دوران کئی مرتبہ اپنی ساخت میں تجدید اور تبدیلی پیدا کرتا ہے۔اور موت جسم کے فرسودہ خلیّوں کو ختم کر دیتی ہے تاکہ ان فرسودہ خلیّوں کی جگہ جوان اور فعال خلیّے لے لیں اور زندگی کی بہاریں خوشی خوشی گزر جائیں۔

''علم حیاتیات BIOLOGY انسانی پیکر کو''ریاستہائے متحدہ'' کی مانند سمجھتا ہے کہ ہر ایک ریاست میں ''خلیّوں اور سالموں'' کے مختلف خاندان رہتے ہیں اور سب کے سب اپنی رہائشی سرزمین کے اُمور کو چلانے کے لیے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں تاکہ اضلاع اور صوبوں کے مجموعی تعاون سے حیات انسانی کی مملکت وجود میں آجائے۔اس ملک میں ہر لمحے کئی خلیے مرتے رہتے ہیں اور دوسرے لاکھوں خلیے ان مردہ خلیوں کا جانشین وجود میں لانے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔جس طرح کہ فرد، دیہات،شہر،صوبے اور پھر مُلک کا اصل کردار ہوتا ہے، اسی طرح خلیّہ بھی اپنے متعلقات (پلازما وغیرہ) سمیت انسانی جسم کی اصل اکائی ہوتا ہے۔''[1]

---

[1] صد و پنجاہ سال جوان بمانید ص ۴۸

''ہر ایک سکینڈ میں تمہارے تقریباً تیس لاکھ سُرخ گلو بیولز RED GLOBULES مرتے رہتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں ہر ایک سکینڈ میں سرخ گلو بیولر وجود میں آتے رہتے ہیں، کیونکہ تمہارا بدن ان تمام چیزوں کو صحیح سالم اور حفاظت کے ساتھ رکھنے کے لیے ہمیشہ جمع شدہ سرمایہ سے خرچ کرتا رہتا ہے اور بدن کے تمام سُرخ گلو بیولز تین ماہ کے عرصے میں تبدیل ہو جاتے ہیں، لیکن خُون کے پلازما کے سالموں (مالیکولز) کی تولید و مرگ کا دورانیہ اس سے بھی زیادہ تیز رفتار ہے۔''[۱]

معاشرے کی تعمیرِ نو:

انسانی معاشرے میں بھی خداوند عالم کی حکمت سے تعمیر نو کی بُنیاد رکھی گئی ہے۔ اور باری تعالیٰ کی حتمی تقدیر کی وجہ سے موت، ان بوڑھے اور ناتوان افراد کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ جو توانائیوں اور چلنے پھرنے کی طاقت تک کو کھو چکے ہوتے ہیں تاکہ کام اور کوشش کے لیے میدان جوانوں کے لیے خالی ہو جائے اور زندگی کی چہل پہل باقی رہے۔ اگر موت نہ ہوتی تو آبادی کی بے پناہ کثرت انسانی معاشرے کو مفلوج کر کے رکھ دیتی اور نوجوان، فعال کار اور متحرک نسل کے لیے زندگی اجیرن ہو جاتی، چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

خلافِ مصلحت درخواست:

"ان قوماً فیما مضی قالو النبی الھم: ارع لنا ربك یرفع عنا الموت فدعالھم فرفع اللہ عنھم الموت فکثرواحتّی ضاقت علیھم المنازك و کثرالنسل ویضع الرجل یطعم اباہ وجدہ وامہ وجّد جدَّہ ویوضیھم ویتعاھدھم فشغلواعن طلب المعاش فقالوا۔ سل لنا ربك ان یرونا الی حالنا التی کنا علیھا فئسال نبیھم ربّہ فردھم الی مالھم۔"

''یعنی گزشتہ اُمتّوں میں سے کسی اُمّت نے اپنے نبی سے عرض کیا کہ خدا سے دُعا کیجئے کہ وہ ہم سے موت اٹھالے، چنانچہ اُن کی دعا کے مطابق موت اُٹھالی گئی۔ آہستہ آہستہ آبادی بڑھتی چلی گئی۔ پیدائش اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ گھروں میں رہنے کی گنجائش نہ رہی۔ نوبت باینجا رسید کہ ایک

---

[۱] شناخت حیات ص ۲۲۳

طاقتور شخص جب صبح سویرے اُٹھتا اپنے ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی وغیرہ کو کھانا کھلانے کی فکر میں لگ جاتا۔ اُنہیں نہلاتا دھلاتا، بناتا سنوارتا، اسی دھن میں اس کا سارا دن گزر جاتا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کارکن اور سرگرم لوگ بیکار ہو گئے اور تلاشِ معاش سے عاجز آ گئے۔ آخر کار اُنہوں نے مجبور ہو کر اپنے نبی کی جانب رُخ کیا اور درخواست کی کہ دعا کیجئے کہ ہماری وہی سابقہ حالت واپس آ جائے اور موت اپنا کام شروع کرے، پیغمبر نے دُعا کی اور خدا نے اس کو قبول فرمایا۔"[1]

حیات کے ساتھ ساتھ موت کی نعمت:

اس عالم طبیعت میں ایک تو اس کے قدرتی ذخائر محدود ہیں اور دوسرے ہر زندہ وجود کے لیے بڑھاپا ناگریز ہے لٰہذا زندگی کے ساتھ ساتھ موت کا وجود صرف شر اور بُرائی ہی نہیں بلکہ بذاتِ خود اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم اور قابلِ قدر نعمت بھی ہے۔ کیونکہ کرۂ زمین کے موجودہ حالات کی صُورت میں اگر زندگی ہی زندگی ہوتی اور موت کا وجود نہ ہوتا تو انسانیت ایسے زبردست طاقت فرسا مصائب اور عظیم مفاسد سے دوچار ہو جاتی جن کی تلافی ناممکن ہوتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جوان فعال، کارآمد اور سرگرم نسل بھی اور بُوڑھے کھوسٹ بھی دونوں جیتے جی عذاب اور مصیبت میں مبتلا ہوتے۔

دوم: جہالت ایک عدمی امر ہے جس کا معنی ہے علم کی نیستی، دانائی کا نہ ہونا اور آگاہی کا عدم۔ لیکن موت زندگی کی مانند ایک وجودی امر ہے اور اس سے جو آثار رونما ہوتے ہیں وہ یہ کہ رُوح بدن سے جدا ہو جاتی ہے۔ مادی طاقتیں معطل ہو جاتی ہیں اور جسم فعالیت اور تحرک کرنے سے رُک جاتا ہے۔

نینداور بیداری کی علامتیں:

موت اور زندگی، نیند اور بیداری کی مانند دو وجودی امر ہیں۔ بیداری کے آثار اکثر مثبت اُمور پر مشتمل ہوتے ہیں جیسے سوچنا، تہیہ کرنا، دیکھنا، سُننا، بات کرنا، اشارہ کرنا، کھانا پینا اور ان جیسے دوسرے امور، جبکہ نیند کے آثار اکثر منفی امور پر مشتمل ہوتے ہیں، جیسے نہ سوچنا، تہیہ نہ کرنا، نہ دیکھنا، نہ سننا بات نہ کرنا، اشارہ نہ کرنا، نہ کھانا نہ پینا جیسے اُمور۔

قرآن وحدیث میں کہیں بھی موت کو جہالت کے ساتھ جو کہ ایک عدمی امر ہے ذکر نہیں کیا گیا، البتہ کئی مرتبہ اور کئی مقامات پر موت اور نیند کا مختلف انداز میں باہم ذکر ضرور کیا گیا ہے اور یہ دونوں وجودی اُمور ساتھ ساتھ ذکر ہوئے ہیں۔ مقصود کی وضاحت کے لیے یہاں پر کچھ روایات کو ذکر کیا جاتا ہے۔

---

[1] کافی جلد ۳ ص ۲۶۰

موت اور نیند کا موازنہ:

حضرت امام محمد تقی علیہ السلام سے موت کے بارے میں سوال کیا گیا:

"ما الموت؟ قال هو النوم الذی یاتیکم کل لیلة الا انه طویل مدته لا ینتبه منه الا یوم القیامة"

کہ موت کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا وہی نیند ہی تو ہے جو تمہیں ہر رات آلیتی ہے، فرق صرف یہ کہ موت کی نیند لمبی ہوتی ہے۔ اور قیامت سے پہلے انسان اس نیند سے بیدار نہیں ہوگا۔[۱]

موت اور نیند ایسی جیسی ہیں:

قرآن مجید نے موت سے متعلق آیات میں لفظ توفی" کو مختلف صُورتوں میں بیان کیا ہے، اور اسے کبھی خدا کی طرف کبھی ملک الموت کی طرف اور کبھی فرشتوں کی جانب نسبت دی ہے اور جیسا کہ پہلے بتایا جاچُکا ہے۔ ''توفی'' کا لفظ ''کسی چیز کو مکمل طور پر تحویل میں لینے'' کے معنی میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا

''خداوند عالم موت کے موقع پر تمہاری جانوں کو کسی کمی بیشی کے بغیر اپنی تحویل میں لے لیتا ہے۔''[۲]

یہی کلمہ بعینہ نیند کے بارے میں استعمال ہوا ہے اور قرآن میں بھی آیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ

''خدا ہی رات کو نیند کے موقع پر تمہیں مکمل طور پر اپنی تحویل میں لے لیتا ہے۔''[۳]

ان دونوں آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ موت اور نیند ایک دوسرے کی مانند ہیں اور دونوں امور وجودی ہیں اور دونوں چیزیں جو کہ انسانی شخصیت کا معیار ہیں انسان سے لے لی جاتی ہیں، فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ نیند کی حالت میں تحویل شُدہ چیز واپس لوٹا دی جاتی ہے سوائے خاص صُورتوں کے، لیکن موت کے وقت وہ چیز قیامت سے پہلے نہیں لوٹائی جائے گی۔

---

[۱] معانی الاخبار ص ۲۸۹

[۲] سُورہ ۳۹ آیت ۴۲

[۳] سُورہ ٦ آیت ٦٠

موت یا تقدیر الٰہی:

نینداور موت کی شباہت پیشوایانِ دین کی نظر میں اس حد تک ہے کہ جب رُسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیند سے بیدار ہوتے توان الفاظ میں خدا کی حمد وثنا بجالاتے:

"الحمدالله الذی احیانابعدما اماتناوالیه النشور۔"

''تمام تعریفیں اس کے لیے جس نے ہمیں مرنے کے بعد زندہ کیا ہے اور قیامت کے دن لوگوں کا حشر نشر اُسی کے ہاتھ میں ہے۔''[۱]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

نَحۡنُ قَدَّرۡنَا بَیۡنَکُمُ الۡمَوۡتَ وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ ﴿۶۰﴾

''ہم نے موت کو تمہارے درمیان مقرر اور مقدر کر دیا ہے اور اس بارے میں کوئی ہماری قدرت سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔''[۲]

چونکہ اس آیت میں خداوند عالم نے موت کو''اندازے'' کے موضوع کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کی نسبت اپنی طرف دی ہے۔جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ موت ایک وجودی امر ہے کیونکہ اگر وہ عدمی چیز ہوتی تو''تقدیر'' کا کلمہ اس بارے میں استعمال نہ ہوتا اور اسے اپنی طرف بھی منسوب نہ کرتا۔

زندگی اور موت کے آثار:

ان چند جملوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ موت جہالت کی مانند نہیں ہے اور نہ ہی اسے ایک عدمی امر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ موت اور زندگی دونوں وجودی چیزیں ہیں جس طرح کہ نینداور بیداری ہوتے ہیں،فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ حیات کا وجودی اثر بیداری کی مانند مثبت اُمور پر مشتمل ہوتا ہے جیسے تحرک اور ادراک وغیرہ لیکن موت کا وجودی اثر نیند کی مانند منفی اُمور پر مشتمل ہوتا ہے جیسے سُکون اور نا آگاہی وغیرہ۔

سوم:عدلِ الٰہی کے مذکورہ مقالہ میں موت کو جہالت کی مانند شر اور بُرائیوں کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے اور کاٹنے اور چیرنے پھاڑنے والے جانوروں کو اس لحاظ سے بُرا کہا گیا ہے،کیونکہ وہ موت کا سبب بنتے ہیں اور شر اور بُرائیوں کا پیش

[۱] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۶۲۶ (مادہ نوم)

[۲] سُورہ ۵۶ آیت ۶۰

خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ پھر ثنویہ کے جواب میں یہ کہا گیا ہے کہ ''بُرائیاں سب کی سب نیستی کی قسم ہیں اور نیستی مخلوق نہیں ہے۔نیستی ''پیدا نہ کرنے'' سے ہے نہ کہ ''پیدا کرنے سے'' جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ موت بھی جہالت کی مانند عدم اور نیستی ہے اور نیستی مخلوق نہیں ہوتی کہ اسے خالق کی ضرورت ہو اور عدم کا وجود نہیں ہوتا کہ اسے موجد کی ضرورت ہو۔

موت، خالق کی مخلوق ہے:

حالانکہ قرآن شریف نے موت اور حیات کو ایک دوسرے کے ہم ردیف اور ہم پلہ قرار دیا ہے اور حیات سے پہلے موت کا نام لیا ہے اور دونوں کو یکساں طور پر ایک خالق کی مخلوق بتایا ہے۔ارشاد ہوتا ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ

''وہ خدا وہ ہے جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا ہے تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کِس کے نیک عمل زیادہ ہیں۔[۱]''

موت اور حیات کا مالک:

یہ آیت بڑی وضاحت کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کر رہی ہے کہ موت اور حیات دو وجودی امر ہیں اور قدرت والے خالق نے اپنی حکیمانہ مشیت کے ساتھ دونوں کو باہم خلق کیا ہے اور ہستی کی نعمت سے نوازا ہے حضرت علیہ السلام نے جو خط امام حسن علیہ السلام کے نام تحریر فرمایا، اس میں فرماتے ہیں۔

''واعلم ان مالك الموت هو مالك الحیوۃ وان الخالق هو الممیت۔''[۲]

یعنی جان لوں کہ موت کا مالک بھی وہی خدا ہے جو حیات کا مالک ہے اور پیدا کرنے والا بی وہی ہے جو مارنے والا ہے۔

حضرت امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں۔

''الحیوۃ والموت خلقان من خلق الله فاذا جاء الموت فدخل فی الانسان لم یدخل فی شیء الا وقد خرجت منه الحیوۃ۔''

''یعنی موت اور حیات خالق کی دو مخلوق ہیں۔ جب موت آتی ہے اور انسان میں داخل ہوتی ہے تو اس

---

[۱] سورہ ۶۷ آیت ۲

[۲] نہج البلاغہ، نامہ ۳۱

وقت تک کسی بھی عضو اور جزو بدن میں داخل نہیں ہوتی جب تک حیات اس سے باہر نہ نکل جائے۔''[1]

اس حدیث میں حضرت امام عالی مقام نے اول تو موت وحیات کی تخلیق کی بات کی ہے اور دونوں کو توانا خالق کی مخلوق اور وجودی امور سے تعبیر کیا ہے۔ پھر موت کے اعضاء و اجزائے بدن میں داخل ہونے کی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے جس طرح بیدار انسان کے جسمانی اعضاء میں نیند داخل ہوتی ہے۔

ساری بحث کا نتیجہ:

اس مجموعی بحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوا ہے کہ موت بُنیادی طور پر شر اور بُرائی کے گروہ سے ہے، ہی نہیں کہ لوگوں کو ثنو یہ کے جواب میں یہ کہنا پڑے کہ ''موت بھی جہالت کی مانند ایک عدمی امر ہے اور عدم، مخلوق نہیں ہوتا کہ اسے خالق کی ضرورت ہو، بلکہ موت اس پائیدار دُنیا کے متغیر نظام میں اس کائنات کی نہایت ہی اہم اور ضروری خوبیوں میں سے ہے اور باری تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ خداوند عالم نے اپنی حکیمانہ مشیت سے موت اور حیات کو ساتھ ساتھ اور دوش بدوش خلق فرمایا ہے تاکہ زندہ موجودات کی انواع میں ہمیشہ توازن برقرار رہے اور ہر نوع کی فعال اور کارآمد نسل اپنے طبعی راستوں کو خیر وخوبی کے ساتھ طے کرتی رہے۔

ضروری یاددہانی:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر ان دانشوروں کے نظریہ کے بارے میں بھی کچھ بات چیت ہوجائے جو موت کو ایک عدمی امر سمجھتے ہیں اور وہ یہ خداپرست فلاسفہ کا یہ گروہ اگر خیر وشر کی باتوں کو ملحوظ خاطر نہ رکھیں اور ثنو یہ کی باتوں اور اُنہیں جواب دینے سے چشم پوشی اختیار کریں اور موت کے عدمی ہونے اور مخلوق نہ ہونے کو مستقل طور پر بیان کریں تو بات یوں بنے گی۔

خیر اور اچھائی کے مبداء خداوند عالم نے اپنی حکیمانہ مشیت سے زندہ موجودات کو کرۂ زمین پر پیدا کیا ہے جن میں سے چھوٹی سے چھوٹی مخلوق خلیے ہیں اور بڑی سے بڑی مخلوق پرانے درخت اور خشکی وتری کے بڑے بڑے حیوانات ہیں۔ ہر نوع کی زندگی کو ضروریات سے نوازا اور اپنے تکوینی حکم کے ذریعہ اُنہیں اجازت دے رکھی ہے کہ وہ کرۂ ارضی میں اپنے مناسب ماحول میں رہ کر زندگی بسر کریں۔

---

[1] کافی جلد ۳، ص ۲۵۹

ایک عدمی امر کی حکومت:

لیکن جُونہی کرۂ ارض پر حکمِ الٰہی سے زندگی کی سرگرمیوں کا آغاز ہوا ایک عدمی امر، ایک نیستی، ایک لاشی غرض ایک غیر موجود و غیر مخلوق چیز جس کا نام موت ہے نے حیات و زندگی کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور زندہ موجودات کی راہوں میں اپنی منفی سرگرمیوں کا آغاز رکھے ہوئے ہے۔ اور موت چونکہ نیستی اور عدم ہے اور عدم خدائی قلمرو حکومت سے باہر ہے نہ خدا کا اس پر کنٹرول ہے اور نہ ہی زندہ موجودات اپنے آپ کو اس کی قدرت وحُکومت سے بچا سکتی ہے۔

موت کا حکیمانہ عمل:

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس عدمی، نیست اور غیر مخلوق امر نے ماضی اور حال میں ایسے کام انجام دیے ہیں اور دیتا آرہا ہے جو بالکل دُرست، مناسب اور برمحل ہیں۔ اور اگر موت نہ ہوتی اور خُشکی اور تری کی تمام مخلوقات بھی اپنی افزائش نسل کو برابر جاری رکھے رہتی جس طرح کہ جاری رکھے ہوئے ہیں تو ایک نہایت ہی مختصر عرصہ میں روئے زمین پر زندگی ناممکن ہو جاتی۔ یہاں پر ایک عام اور سادہ سی مثال اس حقیقت کو بخوبی واضح کرتی ہے۔

مکھی ایک ایسا حشرہ ارضی ہے جو انڈے تو بہت زیادہ دیتی ہے لیکن اس کی عمر بہت کم ہوتی ہے اور طبعی طور پر بہت جلد مر جاتی ہے۔ اگر فرض کریں کہ مکھیاں مسلسل تین صدیوں تک طبعی طور پر انڈے اور بچے دیتی رہیں اور خود بھی اس مدت میں زندہ رہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی موت سے ہمکنار نہ ہو تو آپ خود ہی بتائیے کہ اس عرصہ میں کرۂ ارضی کی کیا کیفیت ہوگی؟ آیا انسان یا زمین پر رہنے والی دوسری مخلوق ان حالات میں زندہ رہ سکتے؟

احسن اور مستحکم نظام:

اس میں شک نہیں کہ دنیاوی زندگی کی موجودہ صورتحال کے پیشِ نظر، حیات و زندگی کے دوش بدوش موت کی تخلیق ایک حکیمانہ ضرورت اور ایک ناگزیر مصلحت ہے۔ اور خداوند دانا و توانا نے اس امر کی بخوبی انجام دیا ہے اور موت و حیات کو باہم پیدا کر کے مختلف النوع زندہ موجودات کو زندگی بسر کرنے کے لیے ایک منظم، محکم اور احسن نظام مہیا کر دیا ہے۔

موت کی شدید سختیاں:

(۲) ایک اور بات جو یہاں پر شایانِ توجہ ہے اور دینی رہنماؤں اور ائمہ اطہار نے بھی کثیر روایات میں اپنے پیروکاروں کی توجہ اس جانب مبذول کرائی ہے وہ ہیں موت کے وقت ناقابلِ توصیف سختیاں اور مصائب چنانچہ جب آدمی

سرائے جاودانی کی طرف منتقل ہوتا ہے اور آخرت کی طرف رختِ سفر باندھتا ہے تو امام اوّل امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی زبانی موت کی سختیاں اس قدر دشوار اور طاقت فرسا ہوتی ہیں جنہیں نہ تو زبان کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی عقل ان کا ادراک کرسکتی ہے۔ چنانچہ آپؑ فرماتے ہیں۔

"ان اللموت غمرات ھی افظع ان تستغرق بصفة او تعتدل علی عقول اھل الدنیا۔"

''یعنی موت کی شدید ترین سختیاں اس قدر ہوتی ہیں جنہیں نہ تو بیان کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی دُنیاوی لوگوں کی عقل پر پُوری اُتر سکتی ہیں۔''[1]

موت کی تلخیاں اور سختیاں اس وقت معلوم ہوتی ہیں جب انسان اس دنیا کی سرحد کو عبور کرتا ہے۔ موت کے فرشتے کو دیکھتا ہے اور عالم غیب کے دروازے پر پہنچ جاتا ہے۔ ایسے حالات میں اس کا اپنے اردگرد والوں سے اور ان کا اس سے رابطہ منقطع ہوجاتا ہے۔ نہ تو مرنے والا اپنے مشاہدات کو ان سے بیان کرسکتا ہے اور نہ ہی وہ مرنے والے کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگاسکتے ہیں۔

عالم غیب تک رسائی

جو شخص موت کے فرشتہ کو دیکھتا اور عالم غیب کی طرف رہسپار ہوتا ہے اس کی کیفیت ایسے انسان سے ملتی جلتی ہے جو گہری نیند سو رہا ہو تو بیدار دنیا سے اس کا رابطہ منقطع ہوجاتا ہے، اس کے دل و دماغ تو کام کرتے رہتے ہیں لیکن سونے والا سو رہا ہوتا ہے اور اس کے مشاہدے خواب پر مبنی ہوتے ہیں۔ نہ تو اس کے اطراف میں بیٹھنے والوں کو اس کے مشاہدات کا علم ہوتا ہے اور نہ ہی سونے والا اس عالم میں ان سے اپنے مشاہدات کی وضاحت کرسکتا ہے۔

جس وقت وہ گہری نیند سو رہا ہوتا ہے اگر اس کے مغز کی ٹیپ TAPE لی جائے تو اس کے پڑھنے والے کو اس کے اتار چڑھاؤ سے اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ اس کے خواب کی وصفی حالت معمول کے مطابق اور مغز سکون کی حالت میں ہے یا ہیجانی اور پریشانی کے عالم میں؟ اور پھر یہ کہ TAPE کے مطالعہ کرنے والے کو سونے والے کی وضعی حالت کا علم تو ہوسکتا ہے، لیکن اس حالت کے اسباب کا علم نہیں ہوسکتا کہ کن اسباب کے تحت یہ حالت پیدا ہورہی ہے۔

---

[1] غرر الحکم ص ۲۴۷

مغزی لہروں کی ریکارڈنگ

''ربع صدی مغزی لہروں کے خطوط کا مطالعہ ایک جدید علمی رشتہ کی صُورت میں منصۂ شہود پر آچکا ہے جس کا نام ''الیکٹروانسفالوگرانی ہے۔ اورامریکہ یورپ میں سینکڑوں لیبارٹریوں میں الیکٹریکل طریقے سے انسانی مغز سے متعلق نقشوں کو ریکارڈ اوراُن کی تفسیر وتوجیہ کا کام جاری ہے۔ دُنیا بھر کے ہسپتالوں میں مریضوں کے اس قسم کے ریکارڈ ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ دماغی مریضوں کا یہ ریکارڈ ان کی اندرونی کیفیت سے باخبر کرنے اور ذہنی امراض کا علاج کرنے کے لیے اتنا ہی مفید کارآمد ہے جتنا کہ مجرموں کی شناخت کے لیے ان کی انگلیوں کے نشانات۔ البتہ انگلیوں کے نشانات مجرم کی شناخت کے لیے تو مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔ لیکن مجرم کی ذاتی خصوصیات کا پتہ نہیں دے سکتے۔ جبکہ مغز کا حاصل شدہ ریکارڈ ذہن کی بدنظمی کا مظہر ہوتا ہے۔ لیکن اس بدنظمی کے اسباب بیان نہیں کرسکتا۔''

سر کی طرف سے الیکٹریکی پیغامات:

''الیکٹروانسفالوگراف'' کے ذریعہ حاصل ہونے والے ٹیڑھے (مخنی) خطوط آٹھ یا آٹھ سے زیادہ قسموں پر مشتمل ہیں جن میں سے ہرایک خط سر کے کسی ایک حصے کی اندرونی خصوصیات کی نشاندہی کرتا ہے۔ ممکن ہے فرض کیجئے کہ یہ علامات ایسے پیغامات کا مجموعہ ہوں جو مغز سے صادر ہوتے ہیں اور ہمارا کام ایسی کلید کا حاصل کرنا ہو جو رمزی اشارات کے تجزیے اور پیغامات کے پڑھنے میں مفید ثابت ہوں۔''[۱]

''بسا اوقات ایک ہی آن میں مختلف پیغامات موصول ہوتے ہین جن کا انسانی آنکھ بخوبی تجزیہ نہیں کرسکتی۔ کبھی مختلف لہریں آپس میں یوں مل جاتی ہین کہ جن کا مکمل طور پر غلط اثر ہوتا ہے۔ مثلاً ایسا ہوتا ہے کہ جس شخص کو ٹیسٹ کیا جارہا ہوتا ہے اس کی مخنی لہریں ایسی حدتک تبدیلی اختیار کرلیتی ہیں کہ الفا ایک یا دو کی لہریں سکینڈ کم ہوجاتی ہیں۔''[۲]

چند سال پہلے کی بات ہے کہ میری ایک تعلیم یافتہ شخص سے شناسائی تھی۔ وہ تین مختلف زبانین جانتا تھا اور مطالعہ کا زبردست شوقین تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ دُنیا بھر کی کتابوں اور رسالوں کو اکٹھا کرے اور دُنیا کے نت نئے انکشافات اور ایجادات سے آگاہی حاصل کرے۔ چونکہ وہ ایک مذہبی شخص تھا لہٰذا بعض اوقات کچھ مسائل کے بارے میں میری طرف رجوع کیا کرتا تھا۔ تاکہ وہ یہ دریافت کرسکے کہ اس موضوع کے بارے میں قرآن یا ائمہ اطہار کی طرف

---

[۱] شناخت حیات ص ۳۴۶ و ۳۵۷

[۲] شناخت حیات ص ۳۴۶ وص ۳۵۷

سے بھی کچھ کہا گیا ہے یا نہیں؟

ایک دفعہ کا ذکر ہے گرمیوں کا موسم تھا اُس نے سہ پہر کو مجھے ٹیلیفون کیا کہ ''میں بہت جلد آپ سے ملنا چاہتا ہوں، میں نے ایک نئی چیز دیکھی ہے، اس کے بارے میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔تقریباً چار بجے وہ آ گیا، اُس کے ہاتھ میں ایک غیر ملکی رسالہ بھی تھا۔ وہ بیٹھ گیا اور فوراً رسالے کا ایک صفحہ کھولا، جس پر ایک مرد کا فوٹو تھا جو کہ ایک کُرسی پر بیٹھا ہوا تھا، اور مخصوص ٹوپی اُس کے سر پر تھی اور ٹوپی کے اطراف سے کچھ تاریں باہر نکلی ہوئی تھیں جن کو کُرسی کے نزدیک نصب شدہ بورڈ سے وصل کر دیا گیا تھا۔ اس صفحہ پر اسی تصویر کے نیچے کچھ گراف بنے ہوئے تھے جن میں سے ہر ایک گراف ماچس کی ڈبیہ کے اندازہ میں تھا۔ ہر ایک گراف پر سفید منکسر لکیریں کچھ موٹی کچھ پتلی کچھ باریک کچھ نہایت ہی باریک، کچھ ملی ہوئی کچھ ایک دوسرے سے جُدا اور مختلف قطر میں اور مختلف انداز میں اور مختلف شکل وصورتوں میں دکھائی دے رہی تھیں۔

اضطرابی حالت میں دماغی لہریں:

یہ سارا سلسلہ اس لیے تیار کیا گیا تھا تا کہ مریض کی مغزی لہروں سے TAPE تیار کر کے متعلقہ اسپشلسٹ ڈاکٹر کے سُپرد کر دی جائیں تا کہ وہ اُسے دیکھ کر بیمار کی مغزی بیماریوں کا پتہ چلا کر اس کے لیے دوائی تجویز کر سکے۔ لیکن اس رسالے کے گراف مغزی بیماریوں کے لیے نہیں تھے بلکہ اس کی مغزی TAPES اس لی گئی تھیں تا کہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ انسان کی شدید ترین ہیجانی حالت میں مغزی لہریں کس کیفیت میں ہیں؟ یعنی غم و غصے کی حالت میں، خوف کی حالت میں ، پریشانی اور اضطراب وغیرہ کی حالت میں ان کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟

یہ TAPES اسی لیے حاصل کی گئی تھیں اور ہر ایک ٹیپ کے ایک چھوٹے سے حصّہ کا گراف تیار کر کے اسی رسالے میں شائع کیا گیا تھا۔ اور ہر گراف کے نیچے لکھا گیا تھا کہ مثلاً یہ گراف انسان کی سخت غصّہ کی حالت کا گراف ہے۔ یہ سخت خوف کی حالت کا، یہ سخت پریشانی کی حالت کا وغیرہ۔ اور پھر لُطف کی بات یہ ہے کہ اسی صفحہ پر یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ اسی قسم کی ٹیپیں ایک سوئے ہوئے انسان کے مغزی بھی تیار کی جاسکتی ہیں اور ان سے یہ پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اس وقت عالمِ خواب میں کسِ حالت میں ہے؟ معمول کی حالت میں یا ہیجانی اور پریشانی کی حالت میں؟ دلفریب مناظر دیکھ رہا ہے یا وحشت ناک صورتیں؟

اور اس سے بڑھ کر دلچسپ بات یہ تھی کہ ایک گراف جس کے خُطوط کی کمیت اور کیفیت دوسرے گرافوں سے مختلف تھی اور گراف کا بیشتر حصّہ کج مج، ٹیڑھے میڑھے، اُلٹے ترچھے اور بے ہنگم خطوط سے پُر تھا۔ اُس کے نیچے لکھا تھا ''یہ اُس شخص کے مغز کی لہریں ہیں جو قریب مرگ ہے۔''

احتضار کی حالت میں سخت دباؤ:

مرنے والے کے گراف کا دوسرے گرافوں سے واضح ترین فرق اس حقیقت کی نشاندہی کر رہا تھا کہ مرنے والے پر پڑنے والا دباؤ اس قدر سنگین اور طاقت فرسا ہے کہ اس کا مقائسہ زندگی کی حالت میں غم و غصّے اور درد اور خوف کے سخت ترین حالات سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔

میرے اس محترم واقف کار نے جب تمام گرافوں کی مکمل تفصیل بیان کر لی تو پُوچھا کہ رہبران دین کی طرف سے اسلامی روایات میں بھی موت کی سختیوں کے بارے میں کچھ بیان ہوا ہے؟ تو میں نے کہا نہج البلاغہ اور احادیث کی دوسری بہت سی کتابوں میں اس بارے میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں، اور حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان مَیں نے اُسے پڑھ کر سُنایا۔

حضرت علیؑ کا ایک فرمان:

"فانکم لو عاینتم ما قد عاین من مات منکم لجزعتم ووھلتم وسمعتم واطعتم ولکن محجوب عنکم ما قد عاینوا وقریب ما یطرح الحجاب۔"

"یعنی اگر تم وہ کچھ دیکھتے جو تم سے پہلے والے لوگ دیکھ چکے ہیں تو تم زبردست گھبراہٹ اور خوف کا شکار ہو جاتے حق کی باتوں کو سنتے، خدائی احکام کی اطاعت کرتے، لیکن جو کچھ اُنہوں نے دیکھا ہے وہ تم سے مخفی ہے، البتہ بہت ہی جلد پردے ہٹا دیے جائیں گے اور پوشیدہ حقائق تم پر آشکار ہو جائیں گے۔"[1]

اخلاق اور اعمال پر مکتبِ فکر کا اثر:

۳۔ موت کے سلسلے میں ایک اور مسئلہ جو قابل توجہ اور غور طلب ہے اور مکتب انبیاء کے پیروکاروں اور مادی مکاتب کے حامیوں کو ایک دوسرے سے جُدا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا موت انسان کے لیے ہست و بود کی آخری منزل ہے اور جب وہ آ جاتی ہے تو انسان کو تمام پہلاؤں کے لحاظ سے وادی عدم میں پہنچا دیتی ہے؟ یا نہ! بلکہ مکتب انبیاء کے مطابق صرف دنیاوی حیات کا خاتمہ کر دیتی ہے جو انسانی ارتقاء کی منازل میں سے ایک منزل ہے، اور اس کے بعد عالم آخرت کی زندگی جاوید

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۲۰

کا آغاز ہوجاتا ہے؟ فکر واندیشہ کی دو قسمیں ہیں، ان قسموں کے ماننے والوں کے اعمال واخلاق پر گہرا اثر ڈالتی ہیں اور ان کی رفتار اور گفتار میں واضح فرق پیدا کر دیتی ہیں۔

سعادت ابدی کی ضمانت:

جو شخص انسانی زندگی کو صرف اس چند روزہ زندگی میں محدود سمجھتا ہے تو اس کی تمام تر کوششیں بھی اس کی جانب مرکوز ہو کر رہ جاتی ہیں اور مادی لذتوں اور دُنیاوی کاروبار کے علاوہ اس کو کچھ اور سوجھتا ہی نہیں، لیکن جو شخص عالم غیب پر ایمان رکھتا ہے موت کو دنیاوی زندگی کا انجام اور اخروی زندگی کا آغاز سمجھتا ہے تو وہ خود کو کبھی بھی دنیاوی لذتوں کے حصول اور اس کے رنج وغم سے نجات کے اندر محصور نہیں کرتا بلکہ انبیاء کی تعلیمات کے مطابق وہ خود کو اس بات کا پابند سمجھتا ہے کہ اس دُنیا میں رہ کر اپنے آپ کو اس جہان کے لیے بنائے اور چند روزہ دُنیاوی زندگی کو بسر کرنے اور حیات جاوید کی ضروریات کو پُورا کرنے کے لیے برابر کی کوشش کرے۔ کیونکہ انسان اس دُنیا میں اپنے فرائض کو پُورا کر کے سعادت ابدی کی توفیق حاصل کر سکتا ہے اور آخرت کے بلندترین مدارج تک پہنچ سکتا ہے جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"بالموت تختم الدنیا وابالدنیا تحرز الاخرۃ"

"یعنی مرنے کے ساتھ دُنیاوی زندگی ختم ہوجاتی ہے اور دُنیا کے ذریعہ آخرت کی سعادت حاصل کی جاسکتی ہے۔"[1]

انسان اور حیات جاوید:

اور یہ بھی آپ فرماتے ہیں۔

"یایھاالناس وانا خلقنا وایاکم للبقاء لا للفنأ ولکنکم من دار الی دار تنقلون فتزوالما انتم صائرون الیہ واخلدون فیہ۔"

"یعنی اے لوگو! ہم اور تم باقی رہنے کے لیے خلق ہوئے ہیں فانی ہونے کے لیے نہیں! لیکن تم صرف مکان تبدیل کرتے ہو اور ایک گھر سے دوسرے گھر کی جانب منتقل ہوجاتے ہو پس تم اس زودگزر دُنیا سے اس عالم کے لیے زادِراہ لے لو جس کی طرف تم جارہے ہو اور تمہیں اس میں ہمیشہ رہنا ہے۔"[2]

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۶

[2] بحارالانوار جلد ۱۵ حصّہ دوم ص ۱۸۶

اس حدیث کے آخر میں امام علیہ السلام یاددہانی کرارہے ہیں کہ لوگ اس عارضی اور چندروزہ دُنیا میں رہ کر اپنے لیے مرنے کے بعد کی حیاتِ جاوید کے لیے زادراہ مہیا کریں اور آج کے دن میں کل کے دن کے لیے اپنی رفاہ وآسائش کے اسباب تلاش کریں۔

انسانی صفات سے متصف ہونا:

مکتب انبیاء میں یہ توشہ اور زادراہ خدا پر ایمان اور امر الٰہی کی اطاعت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جو شخص اپنی سعادت ابدی چاہتا ہے اُسے چاہیے کہ اس دُنیا میں رہ کر جو کہ دارالتکلیف ہے خدا کی انسان ساز تعلیمات پر عمل کرے۔ اپنے انسانی فریضہ کو تمام لوگوں کے ساتھ اور ہر حالت میں ملحوظِ خاطر رکھے درندہ خوئی اور مذموم صفات سے پرہیز کرے اور انسانی اوصاف حمیدہ سے خود کو انسان بنائے انسان بن کر رہے اور انسان ہو کر مرے تاکہ وہ کل انسان ہو کر محشور ہو، انسانوں کی صف میں ہو اور زندگی سے صحیح طور پر استفادہ کرے جو کہ سراپا رحمت ونعمت اور مقام انسانیت کے شایانِ شان ہے۔

جو شخص اس دُنیا میں اس قسم کی زندگی بسر کرے گا، احکامِ الٰہی پر کاربند ہوگا۔ خدا کی نہی شدہ چیزوں سے اجتناب کرے گا۔ مکارمِ اخلاق اور انسانی صفات سے متصف ہوگا تو وہ ہمیشہ موت کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہوگا اور خدا کی رحمت سے اُسے جو اُمیدیں وابستہ ہیں اُنہی اُمیدوں کے ساتھ سرائے جاودانی کی طرف منتقل ہوجائے گا۔

موت کے لیے تیار رہنے کے معنی:

حضرت امیر علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ ''موت کے لیے ہر وقت تیار رہنے کا کیا مطلب ہے؟'' تو آپ نے فرمایا: ''اداء الفرائض واجتناب المحارم واشتمال علی المکارم ثم لا یبالی اوقع علی الموت ام دقع الموت علیہ۔'' ''یعنی واجبات کا ادا کرنا گناہوں سے پرہیز کرنا اور مکارمِ اخلاق سے مصف ہونے کا نام موت کے لیے تیاری ہے جس شخص میں یہ صفات پائی جاتی ہیں اُسے یہ غم نہیں ہے کہ وہ موت پر جا گرے یا موت اُس پر آ گرے۔''[1]

۴۔ موت کے بارے میں ایک اور بات جس پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے اور کم وبیش علمی اور دینی کتابوں میں بھی اس پر گفتگو کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ عموماً لوگ موت سے متنفر ہیں اور اس سے گریز کرتے ہیں؟ اور کیوں اس سے خائف اور وحشت زدہ ہیں؟ البتہ نفرت اور خوف دو روحانی حالتیں ہیں لہٰذا ان کا مرکز بھی روحانی حالتیں ہیں لہٰذا ان کا مرکز بھی روحانی ہی ہونا چاہیے چونکہ مکتب انبیاء کے پیروکاروں کی سوچ خدا کو نہ ماننے والے

---

[1] سفینہ، جلد ۲، (موت)، ص ۵۵۴

مادی حضرات اور معاد کا انکار کرنے والے خدا پرست لوگوں سے مختلف ہے، لہٰذا موت کے بارے میں بھی ان کا نقطہ یقیناً مختلف ہوگا۔ اور اب اس بات کی وضاحت:

انسان اور موت سے گریز:

انسان کے دل میں موت سے نفرت اور گریز اس کی حیاتِ جاوید سے محبت کی وجہ سے ہوتی ہے جیسا کہ پہلے تفصیل سے بیان ہو چکا ہے کہ دائمی زندگی کی رغبت انسان کی سرشت میں داخل ہے اور نبی آدم کی تخلیق میں ہمیشہ کی زندگی سے اس کا فطری تعلق ہے۔ جو لوگ مادی ہیں اور موت کو ہر لحاظ سے انسانی وجود کا خاتمہ سمجھتے ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی جو خدا پرست لیکن رُوح کی بقا اور مرنے کے بعد کی دُنیا پر اُن کا ایمان نہیں ہے انہیں موت سے نفرت بھی کرنی چاہیے اور اس سے گریز اس بھی ہونا چاہیے، کیونکہ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ موت ان کی فطری خواہشات کو پائمال کر دیتی ہے۔ ابدی زندگی کے تصوّر کی اُن کے دل میں سرکوبی کرتی ہے۔ اور عملی طور پر اُن کے تمام حیاتی پہلوؤں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو خود کو خدائی ادیان کا پیروکار تو سمجھتے ہیں لیکن رُوح کی بقا اور مرنے کے بعد زندگی پر قطعی یقین نہیں رکھتے جو کہ مکتبِ انبیاء کے نقطہ نظر سے ارکانِ دین میں شامل ہے۔ وہ اس بارے میں شک وشُبہ اور دودلی کا شکار ہیں۔ وہ بھی موت سے متنفر ہیں، کیونکہ مرنے کی بعد کی زندگی کے بارے میں مشکوک اُمیدیں ان کی اس فطری خواہش کا صحیح معنوں میں جواب نہیں دے سکتیں اور نہ ہی اُن کے دل میں حیاتِ ابدی کی رغبت کو قانع کر سکتی ہیں۔

احتضار کی حالت اور بدحواسی:

اس قسم کے لوگ موت کو پسند نہیں کرتے اور اسے بدگمانی اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں حتّٰی کہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو موت کا نام تک سُننا گوارا نہیں کرتے اور قبرستان میں جا کر موت کے بارے میں سوچنا گوارا نہیں کرتے اور نہ ہی وہ اپنے پیشروؤں کے انجام سے عبرت حاصل کرتے ہیں، لیکن یہ لوگ چاہیں یا نہ چاہیں موت اُنہیں ضرور آ کر رہے گی اور ان پر ایسا اثر کرے گی کہ وہ سوچ سمجھ، سوجھ بوجھ اور ہوش وحواس کو کھو بیٹھیں گے اور بے ہوش اور بدمست افراد کی طرح حقائق کو درک کرنے سے عاجز ہو جائیں گے۔ اسی سلسلے میں قرآن مجید فرماتا ہے۔

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۖ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿١٩﴾

اور راغب کہتے ہیں:

"السُکر حالة تعرض بين المراوعقله ، والستکر اسم لمايکون منه

السّکر"

"یعنی سُکر"مستی کی وہ حالت ہے جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان ظاہر ہوتی ہے، اور سکر، اس چیز کا نام ہے جو مستی کا سبب بنتی ہے۔"[۱]

اور آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ: اب وہ چیز جو کہ موت کی وجہ سے پیدا ہوتی اور مرنے والے کی مستی اور بے ہوشی کا سبب بنتی ہے برحق صُورت میں آ گئی ہے، جی ہاں یہ وہی تو ہے جس سے تم نفرت کیا کرتے اور دُور بھاگا کرتے تھے[۲]

مومن کی نگاہ میں موت کیا ہے؟

جو لوگ خالقِ کائنات پر ایمان رکھتے ہیں، انبیاء کرام کے سچے پیروکار ہیں اور عالم آخرت پر قطعی یقین رکھتے ہیں، وہ موت کو بُری اور نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے، اُسے ابدی زندگی کا قاتل نہیں سمجھتے، بلکہ اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ موت تو صرف زندگی کی محدود اور مصائب بھری زندگی کو ختم کرتی ہے اور پھر انسان کو سرائے جاودانی میں منتقل کر دیتی اور انسان کی دائمی زندگی کی خواہشوں کو پایہ تکمیل تک پہنچاتی ہے۔

آزمودم مرگ من درزندگی است
چوں رِھم زین زندگی پائندگی است

(یعنی میں نے تجربہ کیا ہے کہ میری موت زندگی میں ہے۔ جب میں اس زندگی سے چھٹکارا پاؤں گا تو اس وقت میری ابدی زندگی ہوگی)

یا ثواب یا عذاب:

صاحب ایمان اور متدین لوگوں کی نگاہ میں زندگی ایک ایسے پُل کی مانند ہے جو فانی دُنیا کو باقی آخرت سے ملاتا ہے اور تمام انسان خواہ وہ مادہ پرست ہوں یا خدا پرست، مجبوراً سب کو اسی پر سے عبور کرنا ہوتا ہے۔ اور اسی سے گزر کر عالمِ آخرت میں پہنچتے اور ابدی زندگی کا آغاز کرتے ہیں، فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ ایمان دار نیک لوگ خدا کی جزا کے مستحق بنتے اور اس کی نعمت اور رحمت کے سزاوار ہوتے ہیں، جبکہ بے ایمان اور بدکار لوگوں کو اُن کے بُرے اعمال کی سزا دی جاتی ہے اور وہ خدا کے عذاب اور سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔ بنابریں موت، کچھ لوگوں کے لیے تو آسائش و آرام اور کچھ کے لیے رنج و عذاب

---

[۱] مفردات راغب (مادہ سکر)

[۲] سُورہ ۵۰ آیت ۲۰

ہوتی ہے۔کچھ لوگ تو موت کی وجہ سے سعادت ابدی کو حاصل کرتے اور کچھ عذاب ابدی سے دو چار ہوتے ہیں۔

مرگ ہریک اے پسر ہمرنگ اوست
آئینہ صافی یقین ہم رنگ روست
پیش ترک آئینہ راخوش رنگی است
پیش رنگی آئینہ ہم زنگی است
اے کہ می ترسی زمرگ اندر فرار
آن زخود ترسانی اے جان ہوشدار
زشت روی توست نے رخسار مرگ
جان تو ہم چون درخت ومرگ برگ
ازتورستہ است ارنکویست اربداست
ناخوش وخوش ہم ضمیرت از خودست

اے بیٹے! ہر شخص کی موت اس کے ہم رنگ ہی ہوا کرتی ہے۔صاف آئینہ یقیناً چہرے کا ہم رنگ ہوتا ہے اگر ترک، آئینہ کو دیکھے تو اُسے بھلا معلوم ہوگا۔اور اگر کالا زنگی دیکھے تو اُسے زنگی ہی دکھائی دے گا۔ اے وہ شخص جو موت سے ڈر کر بھاگتا ہے غور سے سُن لے کر موت کا رخسارہ بدصُورت ہوتا ہے۔تمہاری جان درخت کی مانند ہوتی ہے اور موت پتے کی مانند۔اچھائی اور بُرائی تمہاری اپنی ہی طرف سے ہے۔تمہاری دلی خوشی اور ناراضگی بھی خود تمہاری طرف سے ہے

مومن کا قید خانہ اور کافر کی بہشت:

اسلام کے عظیم الشان پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں۔

"الدنیا سجن المومن وجنۃ الکافر والموت جسر ھولاء الی جنانھم وجسر ھولاء الی جحیمھم"

''دُنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے بہشت ہے، اور موت پُل ہے جو اُسے بہشت میں اور

اُسے جہنم میں بھیجتی ہے۔"[1]

خلاصہ کلام جولوگ مبداء اور معاد پر ایمان رکھتے ہیں اور اُن کا عقیدہ ہے کہ موت اس زود گزر دُنیا سے آخرت کی طرف منتقل ہوجانے کا نام ہے وہ موت سے نہ تو ڈرتے ہیں اور نہ ہی اس سے نفرت کرتے ہیں۔ان کو صرف اس وجہ سے تشویش لاحق ہوتی ہے۔کہ مبادا وہ مرجائیں۔اور اُن کے عقائد و ایمان یا افعال و اخلاق مرضی خالق کے مطابق نہ ہوں، جس کی وجہ سے وہ عذاب الٰہی میں گرفتار اور خواہ عارضی طور پر سہی رحمتِ الٰہی سے محروم ہوجائیں۔

لاعلمی کی وجہ سے خوف:

لوگوں کے موت سے خوف کی اصل وجہ دوسرے خوفوں کی طرح جہالت اور لاعلمی ہے۔انسان تاریک رات سے ڈرتا ہے، کیونکہ ظُلمت اور تاریکی جہالت کا سبب ہوتی ہے، جگہ کو نہیں دیکھ سکتا، چاہ اور راہ میں تمیز نہیں کرسکتا، نہیں سمجھ پاتا کہ سیدھی راہ ہے یا ٹیڑھی؟ اسی لیے ہر لحہ خود کو کاٹنے اور چیرنے پھاڑنے والے جانوروں کے شکار کا نشانہ سمجھتا ہے یا کسی ان دیکھی بلا کے آجانے کا احساس کرتا ہے۔جو شخص پہلی مرتبہ کسی سیاہ اور تاریک پانی کے گہرے تالاب کے کنارے کھڑا ہوتا کہ نہانے دھونے کے لیے اس کے اندر جائے تو اسے خوف محسوس ہوتا ہے کیونکہ پانی کی تاریکی کی وجہ سے وہ نہیں جانتا کہ اس کی گہرائی کتنی ہے؟ اس میں کیچڑ اور گندگی کس حد تک ہے؟ کون کون سے جانور اس میں رہتے ہیں؟ یہی لاعلمی اور جہالت اس کے خوف کا سبب بنتی ہے اور وہ پانی میں غوطہ لگانے کی جرات نہیں کرتا، کیونکہ ایسے حالات میں وہ خود کو ہر وقت ناخوشگوار حوادث کا شکار سمجھتا ہے اور خود کو نقصان وخطرات سے دوچار دیکھتا ہے۔جو شخص بجلی کے بارے میں معلومات نہیں رکھتا وہ بجلی کے بٹن کو دبانے سے گریز کرتا ہے اور تاروں کو چھیڑنے سے پرہیز کرتا ہے اسے ڈر لگتا ہے کہ کہیں اسے کرنٹ نہ لگ جائے کہ جس سے اُس کی جان چلی جائے۔

نامعلوم ماحول اور حادثات کے خطرات:

خلاصہ کلام، زندگی کے مختلف شعبوں میں لوگوں کا خوف اُن کی جہالت اور لاعلمی کے سبب پیدا ہوتا ہے اور یہی چیز موت کے بارے میں بھی ہے۔یہ جو سب لوگ موت سے ڈرتے ہیں۔اس کی وجہ بھی ان کا موت سے خوف اور وحشت اس لیے ہوتی ہے کہ اُنہیں معلوم نہیں ہوتا کہ موت کیا چیز ہے؟ کس طرح اُنہیں اپنی لپیٹ میں لے گی؟ اور نہ ہی اُنہیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ مرنے کے وقت اُنہیں کن حوادث اور خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں۔

---

[1] بحارالانوار جلد ۳ ص ۱۳۴

"دخل علی بن محمد علیه السلام علی مریض من اصحابه وهو یبکی ویجزع من الموت، فقال له یاعبدالله تخاف من الموت لانك لاتعرفه۔"

"یعنی حضرت امام علی نقی علیہ السلام اپنے اصحاب میں سے ایک شخص کے پاس اُس وقت گئے جب وہ مرض الموت میں مبتلا تھا۔ وہ رو رہا تھا اور چونکہ موت کے پنجہ میں جکڑا ہوا تھا اس لیے نہایت ہی بے تاب اور پریشان تھا، حضرت نے فرمایا: بندۂ خدا! تم جو موت سے ڈر رہے ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم یہ نہیں جانتے کہ موت کیا ہے؟ اور اس کے بارے میں تمہیں معلومات حاصل نہیں ہیں۔"

پھر آپ نے موت کے بارے میں کچھ باتیں بیان کیں جن سے اس کی تسلّی ہوئی اور قلبی سکون حاصل ہوا اور تھوڑی دیر کے بعد اُس نے آنکھیں بند کرلیں اور جان آفرین کے حوالے کر دی۔ [1]

مومن اور کافر کی موت میں فرق ہے:

البتہ خدا اور قیامت پر ایمان رکھنے والوں کو موت سے جو خوف ہوتا ہے وہ اس خوف سے مختلف ہے جو مُنکرین خدا اور مُنکرین معاد کو ہوتا ہے۔ مومنین کو اس لیے خوف ہوتا ہے کہ اُنہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بارگاہ رب العزت میں ان کی کیا کیفیت ہوگی؟ یعنی آیا خدا ان سے راضی ہے اور اُنہیں اپنی رحمت وعنایت کے شاملِ حال کرے گا یا ان سے ناراض ہے۔ اور اُنہیں سزا کا مستوجب قرار دے گا؟

لیکن خدا کے مُنکر جب تک ملک الموت کو نہیں دیکھ لیتے اور مرنے کے بعد کے عالم کے نزدیک نہیں پہنچ جاتے۔ صرف اس بات سے ڈرتے رہتے ہیں کہ اُنہیں معلوم نہیں ہوتا کہ موت اُن کے ساتھ کیسا سلوک کرے گی اور کیسے ان جانے ماحول اور غیر معمولی تبدیلی سے دوچار ہوں گے، لیکن جونہی غیب کے پردے اُٹھا دیئے جاتے ہیں اور موت کے فرشتے کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں مرنے کے بعد کے عالم اور خدا کے ثواب وعقاب سے آگاہ ہوتے ہیں تو پھر اُنہیں فوراً ہی اپنے تاریک انجام کا پتہ چل جاتا ہے۔ اور سمجھ لیتے ہیں کہ پروردگار کے انکار اور امرِ الٰہی کی مخالفت کی بنا پر اُنہیں کن دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑے گا اور کس قدر سنگین اور طاقت فرسا حالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔

انجام سے آگاہی:

دوسرے لفظوں میں تمام انسان خواہ وہ مادہ پرست ہوں یا خدا پرست، مومن ہوں یا کافر، نیک ہوں یا بدکار اور

---

[1] معانی الخبار ص ۲۹۰

پاک ہوں یا ناپاک جونہی دُنیا کی سرحد کو عبور کر کے آخرت کے کنارے پہنچ جاتے ہیں اُنہیں فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ اُن کا انجام کیا ہوگا؟ اور اُنہیں کِس قسم کے نتائج دیکھنا پڑیں گے۔

جولوگ دُنیا میں خدا اور آخرت پر صحیح معنوں میں ایمان رکھتے ہیں، خدائی احکام کی پابندی کرتے ہیں، مکتب انبیاء کے پیروکار رہے ہیں اور زندگی کو پاکیزہ انداز اور نیکی کے ساتھ بسر کیا ہے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ اللہ کی وسیع رحمت اُن کے شاملِ حال ہے اور عالمِ آخرت کی ابدی و دائمی نعمتوں سے بہرہ مند ہوں گے۔

لیکن جولوگ مادی مکاتب فکر کے پیروکار خدا کی نفی اور اس کا انکار کرتے ہیں خدا اور اس کے انبیاء کی تعلیمات سے بے بہرہ رہے ہیں اور اپنی زندگی میں گناہوں کے ارتکاب اور گمراہ کن اعمال کی بجا آوری سے ذرہ برابر باک محسوس نہیں کرتے، اُنہیں معلوم ہوجاتا ہے کہ عذابِ الٰہی کے مستحق ہیں اور آخرت کے جاودانی اور دائمی عذاب میں معذب ہوں گے۔

گناہگار مومنین:

جولوگ خدا پر اایمان تو رکھتے ہیں، لیکن اپنی نفسانی خواہشات اور غرائز وشہوات کے بندہ و اسیر رہے ہیں اور دُنیا میں بہت سے گناہوں سے آلودہ بھی رہے ہیں وہ بھی مرنے کے فوراً بعد اپنے انجام سے مطلع ہوجائیں گے۔ البتہ اُن کا آخری فیصلہ بروز حساب (قیامت) معلوم ہوگا، کیونکہ ہوسکتا ہے اس دن عفوِ الٰہی اُن کے شاملِ حال ہوجائے اور نجات پاجائیں اور ممکن ہے کہ اپنے ارتکاب کردہ گناہوں کی نسبت سے اُنہیں ایک عرصے تک عذابِ الٰہی میں گرفتار رکھا جائے۔

موت کی تعریف علیؑ کی زبانی:

حضرت امیر علیہ السلام سے گذارش کی گئی کہ موت کی تعریف فرمایئے تو آپ نے ارشاد فرمایا:

"علی الخبیر سقطتم، ھوا حد ثلاثه اموریرو علیه. امابشارة بنعیم الابدو اما بشارة بعذاب الابدواما تخزن وتھویل وامرہ مبھم لایدری من ای الفرق ھو؟"

''یعنی تم نے باخبر شخص سے سوال کیا ہے اور مناسب جگہ پر اُترے ہو! پھر فرمایا: اشخاص کے لحاظ سے موت ان تین قسموں میں سے ایک ہے، یا تو ابدی نعمت کی خوشخبری ہے، یا ابدی عذاب کی اطلاع ہے یا پھر رنج وغم ہیں اور مرنے والے کا انجام غیر معلوم اور مبہم ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا شمار کس گروہ میں ہے؟ آیا وہ نیک لوگ میں شامل ہے کہ خدا کی نعمتوں سے بہرہ مند ہوگا۔ یا بدکاروں میں اس

کا شمار ہے کہ عذاب میں مبتلا ہوگا۔"[1]

بے فائدہ پشیمانی:

جولوگ دُنیا میں اندھے اور بے شعور مادہ کے سوا کچھ سوچتے ہی نہیں تھے اور خدا کی حکمت بھری آیات کا مطالعہ نہیں کرنا چاہتے تھے، جب مادہ کے ماوراء ایک اور عالم کا مشاہدہ کریں گے تو وہ سخت نقصان میں ہوں گے، اپنی زندگی کی بازی ہار جائیں گے اور اپنے کئے پر نادم ہوں گے لیکن اُن کی ندامت بے سُود ہوگی۔ کیونکہ فرصت ہاتھ سے نکل چکی ہوگی ادائے فرائض کا موقع گزر چکا ہوگا اور تلافی مافات کا دور ہاتھ سے نکل چکا ہوگا۔

خدا پر ایمان رکھنے والے اور مکتبِ انبیاء کے سچے پیروکار مرنے سے پہلے اور عالمِ آخرت میں منتقل ہونے سے قبل ہی خدا کے ثواب وعذاب پر ایمان لائے ہوتے ہیں اور موت کے بعد کے عالم کو دیکھنے سے گھبرائیں گے نہیں مرنے سے پہلے اُنہیں اس چیز کی تشویش ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد اُن کی کیا کیفیت ہوگی؟ وہ بہشتی ہوں گے یا جہنمی؟ لیکن خدا کی رحمت اور اس کے فضل وکرم کی بدولت وہ اس پریشانی کو بھی دل سے دُور کردیں گے اور کھلے دل اور خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی جان، جہانِ آفرین کے سُپرد کردیں گے۔

چوں بلال ازضعف شد ہمچون ہلال
رنگ مرگ افتاد برروی بلال
جفت اودیدش بگفتا واَحرب
پس بلاش گفت نے نے واطرب
تاکنون اندر حرب بودم ززیست
توچہ دانی مرگ چہ عیش است وچیست؟
ایں ہمی گفت ورخش درعین گفت
نرگس وگلبرگ ولالہ می شگفت
تاب رو وچشم پرانوار او
می گواہی داد برگفتار او

---

[1] معانی الاخبار ص ۲۸۸

(جب حضرت بلال کمزوری کی وجہ سے ہلال کی مانند ہو گئے اور موت کی زردی اُن کے چہرے پر چھانے لگی تو اُس کی بیوی نے کہا ہائے مصیبت! لیکن بلال نے کہا ایسا نہ کہو بلکہ کہو آہا خوشی! اب تک زندگی میں مصیبتوں میں مبتلا رہا، تمہیں کیا معلوم کہ موت کیا چیز ہے اور کیسی زندگی ہے؟
وہ یہ الفاظ بھی کہہ رہے تھے اور اُن کا چہرہ بتلا رہا تھا کہ جیسے نرگس، گلبرگ اور گل لالہ کھل رہے ہوں۔ اُن کے چہرے اور پرنُور آنکھوں کی تب وتاب اُن کی باتوں کی تصدیق کر رہی تھی)

مرتے وقت خدا کی رحمت کی اُمید رکھو:

اگر مومنین یہ چاہتے ہیں کہ مرنے کے وقت خوف اور تشویش سے کم دو چار ہوں اور کسی حد تک سکُونِ قلب اور اطمینانِ خاط کے ساتھ عالمِ جاودانی کی طرف منتقل ہوں تو اُنہیں کوشش کرنی چاہیے کہ زندگی کے آخری لمحات میں خدا کی عفو وبخشش کے زیادہ سے زیادہ اُمیدوار بنیں۔ اپنے دل میں رحمتِ خدا کی اُمید کو زیادہ کریں، اپنی جان کو خدا کی ذات پر حُسنِ ظن کے ساتھ ملک الموت کے سُپرد کریں۔ یہ چیز روایات میں ہادیانِ برحق اور آئمہ اطہار علیہم السلام کی زبانی بیان ہوئی ہے جن میں اُنہوں نے اپنے پیروکاروں کو بار بار اسی بات کی ہدایت کی ہے۔ مثال کے طور پر چند ایک روایات کو بیان کرتے ہیں۔

فضلِ الٰہی کی اُمید:

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ خداوند عالم فرماتا ہے:

"برحمتی فلیثقو اوفضلی فلیر حواوالی حُسن الظن بی فلیطمنوا فان رحمتی عند ذالك۔"

"میری رحمت پر بھروسہ کرو، میرے فضل کی اُمید رکھو اور مجھ پر حُسنِ ظن کی وجہ سے مطمئن رہو، کیونکہ ان حالات میں میری رحمت میرے بندوں کے شاملِ حال ہوگی۔" [1]

ایک اور حدیث میں حضرت رسُولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ۔

"لایموتن احد کم الاوھویحسن الظن بأللہ فان حُسن الظّن بأللہ ثمن الجنۃ۔"

---

[1] کافی جلد ۲ ص ۷۱

''یعنی تم میں سے کوئی بھی شخص اس وقت تک موت سے ہمکنار نہ ہو جب تک اپنے ربّ کے ساتھ حُسنِ ظن کو بہتر نہ بنا لے، کیونکہ خدا پر حُسنِ ظن، بہشتِ بریں کی قیمت ہے۔''[۱]

خدا پر حُسنِ ظن:

اسی سلسلے میں حضرت امام رضا علیہ السّلام فرماتے ہیں۔

''احسنوا الظن باللّٰہ فان اللّٰہ عزوجّل یقول انا عند ظن عبدی المومن بی ان خیر فخیراً وان شر افشراً۔''

''یعنی خدا کے ساتھ اپنے گمانوں کو نیک بناؤ اور اس کی رحمت کے اُمیدوار رہو، کیونکہ خدا فرماتا ہے، میرا رابطہ اپنے مومن بندے کے ساتھ اسی قدر ہے جتنا وہ مجھ پر گمان رکھتا ہے۔ اگر اس کا گمان میری عفو اور رحمت کے بارے میں ہے تو میری عفو و رحمت اس کے شاملِ حال ہو گی اور اگر اس کا گمان مواخذہ اور سزا ہے تو میں اس کا مواخذہ کروں گا اور اُسے سزا دوں گا۔''[۲]

ہنگامِ مرگ اور کلمہ توحید:

رُسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز کلمہ توحید سے کیا تھا اور اس کا تعارف سعادت اور نجات کی حیثیت سے کرایا تھا۔ اگر مرنے والے کو خدا کی ذات پر حُسنِ ظن ہو اور اُس کے مُنہ سے نکلنے والے آخری کلمات کلمہ توحید کے ہوں تو رُسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق سیدھا بہشت میں جائے گا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

''لقنوا موتاکم ''لا الہ الا اللّٰہ'' فان من کان آخر کلامہ'' لا الہ الا اللّٰہ'' دخل الجنۃ''

''اپنے احباب واعزاء کو جو مر رہے ہوں اور احتضار کی حالت میں ہوں کلمہ توحید کی تلقین کرو، کیونکہ جس شخص کی زبان پر آخری کلمات، کلمہ طیبہ کے ہوں وہ بہشت میں جائے گا۔''[۳]

---

[۱] مشکوۃ الانوار ص ۳۶

[۲] کافی جلد ۲ ص ۷۲

[۳] ثواب الاعمال ص ۲۳۲

مجلس نمبر 6

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ رَبِّ ارۡجِعُوۡنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّیۡۤ اَعۡمَلُ صَالِحًا فِیۡمَا تَرَکۡتُ [1]

افہام وتفہیم کا ایک اہم سادہ اور بہترین ذریعہ جو تمام زبانوں اور اقوام وملل کے درمیان رائج ہے وہ ہے مثالوں، استعاروں اور تشبیہوں سے کام لینا۔ کچھ مطالب ایسے ہوتے ہیں جنہیں نہ تو کسی گویا زبان اور توانا قلم کے ذریعہ بعض افراد کو نہیں سمجھایا جاسکتا۔ لیکن یہ مشکل تشبیہ اور مثالوں کے ذریعہ آسانی کے ساتھ حل کی جاسکتی ہے اور اس طرح ہر سطح کے سامعین اور قارئین کو اپنا مطلب اور مقصود سمجھایا جاسکتا ہے۔ قرآن وحدیث اور روایات میں مختلف چیزوں کے بارے میں بہت سی مثالیں اور تشبیہیں بیان کی گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں نے بہت سے پیچیدہ مسائل سیکھے اور مختلف شعبوں میں ضروری تعلیمات حاصل کیں۔

دُنیا بازار ہے اور عمر اس کی قیمت:

اس قسم کی سبق آموز مثالوں میں سے ایک مثال جو اس دُنیا میں انسان کو اپنی کیفیت کی طرف متوجہ کرتی ہے وہ یہ کہ یہ دُنیا ایک بازار کی مانند ہے لوگ اس دُنیا میں لین دین کرنے والے ہیں، لوگوں کی زندگی اس بازار کا نقد سرمایہ ہے اور اس بازار میں جس سامان کی خرید وفروخت کی جاتی ہے وہ ایمان وکفر، فضیلت ورذالت، پاکیزگی وناپاکی غرض تمام عقائد واخلاق اور نیک وبد اعمال ہیں جو زندگی کے نقد سرمائے سے خریدے جاتے ہیں اور لوگ اپنی دُنیا اور آخرت کے لیے اُنہیں اکٹھا کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"انما الدنیا سوق من الاسواق منھا خرج قوم بما ینفعھم ومنھا خرجوا بما یضرھم"

''یعنی یہ دُنیا بھی بازاروں میں سے ایک بازار ہے، کچھ لوگ اس بازار سے سُودمند اور فائدہ بخش سود خرید کر باہر آتے ہیں اور کچھ مضر اور نقصان کا سودا خرید کر باہر نکلتے ہیں۔''

---

[1] المومنون

مفید اور مضر سودے:

حضرت امام علی نقی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"الدنیا سوق ربح فیھا قوم وخسر آخرون"

''یعنی دُنیا ایک بازار ہے۔ کچھ لوگ تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کچھ لوگ نقصان۔''[1]

قرآن مجید نے متعدد مقامات پر نیک لوگوں کے اچھے اور پسندیدہ اعمال اور بدکاروں کے بُرے اور ناشائستہ افعال وکردار کو تجارت سے تعبیر کیا ہے اور لوگوں کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ افرادِ انسانی کے نیک اور بداعمال اس سودے کی مانند ہیں جس کی بازار میں خرید وفروخت کی جاتی ہے۔ کچھ سودے نقصان دہ ہوتے ہیں اور کچھ نفع آور ہوتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۲۰۷

'' کچھ ایماندار لوگ ایسے بھی ہیں جو خدا کی خوشنودی کی خاطر اپنی جان کو بیچ ڈالتے اور اپنی جان کے بدلے میں خدا کی رضاؤں کو خرید لیتے ہیں۔''[2]

سعادت اور بدبختی کا سامان:

ایک اور جگہ ارشاد فرماتا ہے:

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

''اُنھوں نے اپنے ساتھ کس قدر بُرا معاملہ کیا ہے کہ جس قرآنی نعمت کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے ظُلم کی وجہ سے اس کا انکار کرتے ہیں اور اس سے روگردانی کرتے ہیں۔''

بازارِ دُنیا میں توحید وشرک، کفر وایمان، عدل وفسق غرض نیک بختی اور بدبختی جیسے سودے عام مل جاتے ہیں اور لوگ بھی لگاتار ان کی خریداری میں مصروف ہیں۔

متاع کُفر ودین بے مشتری نیست
گروہی این گروہی آن پسندند

---

[1] بحارالانوار جلد ۱۷ ص ۱۶۶

[2] سُورہ ۲ آیت ۲۰۷

(یعنی کفرودین جیسے سامان کی خریداری کرنے والے بھی موجود ہیں۔ کچھ لوگ اسے اور کچھ اسے پسند کرتے ہیں)۔

جس تجارت میں خسارہ نہیں:

قرآن مجید اس قسم کے صاحب ایمان تاجروں کے بارے میں فرماتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَتۡلُوۡنَ کِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً یَّرۡجُوۡنَ تِجَارَۃً لَّنۡ تَبُوۡرَ ﴿۲۹﴾

''یعنی جولوگ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں۔نماز کو بجالاتے ہیں، جو رزق خدا نے انہیں عطا کیا ہے اُس سے آشکار اور مخفی طور پر خرچ کرتے ہیں، اُنہیں ایسی تجارت کی اُمید ہے جس میں ہرگز کسی قسم کا نقصان اور خسارہ نہیں ہے۔''[1]

اسی طرح منافق اور بے ایمان تاجروں کے بارے میں بھی ارشاد فرماتا ہے۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالۡهُدٰی ۪ فَمَا رَبِحَتۡ تِّجَارَتُهُمۡ وَمَا کَانُوۡا مُهۡتَدِیۡنَ ﴿۱۶﴾

''یہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے خرید لیا ہے۔ایسے لوگوں کی تجارت ہرگز فائدہ مند نہیں ہوسکتی اور وہ فلاح اور دستگاری کی طرف راہ نہیں پاسکتے۔''[2]

بازارِ دُنیا میں اللہ کے رُسول متاع ایمان وفضیلت کے دلال ہیں جو لوگوں کو پاکیزگی اور حقیقت کی دعوت دیتے ہیں اور شیاطین بے ایمانی اور کُفر وارتداد کے دلال ہیں جو غرائز اور شہوات کو بھڑکا کر اُنہیں غلط اور گناہ کے رستوں پر چلاتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا هَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنۡجِیۡکُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتُجَاهِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِکُمۡ وَاَنۡفُسِکُمۡ ؕ

''یعنی اے ایمان والو! کیا تمہیں ایسی تجارت کی طرف دلالت ورہنمائی کروں جو تمہیں قیامت کے

---

[1] سُورہ ۳۵ آیت ۲۹

[2] سُورہ ۲ آیت ۱۶

دردناک عذاب سے نجات دلائے؟ خدااوراُس کے رسول پر ایمان لے آؤاور راہِ خدا میں اپنے جان ومال کے ساتھ جہاد کرو[1]۔

لمبی آرزوئیں یا شیطانی پھندے:

اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ۭ وَاَمْلٰى لَهُمْ ﴿۲۵﴾

''یعنی جن لوگوں نے خدا کی ہدایت اور راہنمائی کے آشکار ہوجانے کے بعد بھی دین خدا سے پیٹھ پھیر لی ہے۔اوراس سے روگردانی کرلی ہے، شیطان نے اُنہیں اسی کام کے لیے پکارااور کفرکوان کی نظروں میں بناسجا کر پیش کیاہےاورلمبی آرزوؤں کے ذریعہ اُنہیں غافل کردیا ہے۔'[2]'

ایّام کے لحاظ سے عمر کی گنتی:

ہرشخص کی عمر جواس دنیا کے بازار میں اس کا نقد سرمایا ہے۔محدوداورمقرر ہےاورعام طور پرلوگ سال کواپنی عمر کی اکائی سمجھتے ہیں اوراپنی اوردوسروں کی عمرکواسی پیمانے پرتولتے ہیں۔لیکن حضرت علی علیہ السلام نے سال کونہیں بلکہ دن کوعمر کی اکائی قراردے کرانسانی زندگی کے دورانیے کواسی پیمانے پرتولا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

''انما انت عدد ایام فكل يوم يمضی عليك يمضی ببعضك''۔

''یعنی اے انسان! تواپنی زندگی کے ایام کا مجموعہ ہے تیری عمر کا جودن بھی گزرتا ہے دراصل تیری عمر کی ایک اکائی ختم ہوجاتی ہے اور درحقیقت ایک دن کے گزرجانے کے ساتھ تیری زندگی کے دورانیے کاایک حصّہ گزرجاتا ہے۔[3]

عام طور پرانسان زندگی کوسال یادن کے حساب سے تولتے اوراندازہ لگاتے ہیں اوراُن کی مقدار کی تعیین کرتے ہیں، لیکن ذات باری تعالیٰ کے نزدیک لوگوں کی عمر کی تعداد گھنٹوں، منٹوں بلکہ لمحوں کے حساب سے شمار کی جاتی ہے، چنانچہ خداوندعالم نے اپنے گرامی قدررُسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسکین قلب کی خاطرارشادفرمایا ہے۔

---

[1] سورہ ۶۱ آیت ۱۰،'

[2] سورہ ۴۷ آیت ۲۵

[3] فہرست غررص ۳۷۱

"فلا تعجل علیھم انما نعدھم عداً۔"

''مخالفین کے عذاب کے بارے میں جلدی سے کام نہ لیجئے۔ کیونکہ ان کی عمر سے کچھ باقی نہیں رہا اور ان کی باقیماندہ عمر کا حساب ہمارے پاس ہے۔'' [۱]

سانسوں کے حساب سے عمر کا اندازہ:

عبدالاعلیٰ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے فرمان خدا ''انما نعدھم عدا'' کے معنی دریافت کیے تو آپ علیہ السلام نے فرمایا:

"ماھوعندك؟قلت عددالایام قال ان الآباء ولا مھات یحصون ذالك لاولکنه عددالانفاس۔"

''تم نے اس آیت سے کیا سمجھا ہے؟ میں نے کہا اس سے مراد زندگی کے دنوں کی تعداد ہے تو امام علیہ السلام نے فرمایا یہ تو ماں باپ اپنی اولاد کے دنوں کو شمار کرتے ہیں، لہٰذا اس سے یہ مراد نہیں بلکہ اس سے مراد سانسوں کی تعداد ہے اور خداوند عالم اُن کی عمروں کا حساب اُن کی تعداد کے مطابق لگاتا ہے۔'' [۲]

نفع اور نقصان کا معیار:

ایک تجارتی کمپنی تیس سال کے لیے بہت بڑے سرمایہ کے ساتھ قائم کیجاتی ہے۔ کمپنی کو چلانے والے دستور العمل کے مطابق اپنی سرگرمیوں کا آغاز کرتے ہیں۔ ہر سال اس شرکت میں چھوٹے بڑے ہزاروں سودے کیے جاتے ہیں اور سال کے آخر میں کمپنی کے حساب و کتاب کو آڈیٹروں کے ذریعہ آڈٹ کیا جاتا ہے اور نفع و نقصان کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اگر کمپنی کے حصّہ دار سمجھ دار لوگ ہوں تو اُن کی کوشش ہوتی ہے۔ کہ آئندہ سال کے لیے اس قسم کے سودے نہ کئے جائیں جو گذشتہ سال خسارے کا سبب بنے ہیں، لیکن اگر غافل اور بے سمجھ لوگ ہوں تو اس بارے میں سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے اور حسبِ سابق اپنے سود و زیاں کے کاروبار کو برابر جاری رکھتے ہیں۔

جب کمپنی کی تیس سالہ مدّت ختم ہو جاتی ہے اور آڈٹ پارٹی تیس سال کے آخر میں کمپنی کا تیس سالہ بیلنس تیار کرتی

---

[۱] سُورہ ۱۹ آیت ۸۴

[۲] کافی جلد ۳ ص ۲۵۹

ہے۔ پھر اس کے خاتمہ کا اعلان کیا جاتا ہے۔ تیس سال کی طویل مدت میں کمپنی کی اچھی یا بُری اقتصادی کارکردگی کا اندازہ اس کی اسی آخری تیس سالہ بیلنس شیٹ سے لگایا جاتا ہے۔ اور نفع یا نقصان ہی اس کارکردگی کا معیار ہوتے ہیں۔ اگر نفع زیادہ ہے یا کم ازکم زیادہ اور نقصان کم ہے تو معلوم ہوگا کہ کمپنی نے تیس سال کی مدت میں بہت اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے یا نسبتۂ اس کی کارکردگی اچھی رہی ہے۔ لیکن اگر بیلنس شیٹ خسارہ ظاہر کرتی ہے یا نقصان زیادہ اور نفع کم ظاہر کرتی ہے۔ تو معلوم ہوگا کہ اس ساری مدت میں کمپنی نے نہایت ہی خراب یا نسبتۂ خراب کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ بہرحال کمپنی کی آخری آڈٹ رپورٹ ہی اس کے حصّہ داروں کے لیے نفع یا نقصان کا معیار ہوتی ہے اور اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ کمپنی کے تیس سالہ کاروبار میں حصّہ داروں کو نفع ہوا ہے یا نقصان!

زندگی کے سرمایہ اور کمپنی کے سرمایہ کا تقابل:

عمر کے نقد سرمایہ کو بازارِ دُنیا میں کام میں لانا اور زندگی بھر اچھے اور سعادت عطا کرنے والے اعمال کو بجالانا یا بُرے اور بدبختی سے دوچار کرنے والے کام انجام دینا ایسا ہے جیسے تجارتی کمپنی میں نقد سرمایہ کو کام میں لایا گیا ہے اور اس نفع یا نقصان کا کاروبار کیا گیا ہے۔

جس طرح کمپنی کے خاتمہ پر حصّہ داروں کے نفع یا نقصان کا دارومدار اس بات پر ہے کہ کمپنی نے مجموعی طور پر نفع کمایا ہے یا نقصان اٹھایا ہے، اسی طرح انسان کی زندگی کا خاتمہ پر اس کی سعادت یا شقاوت کا دارومدار بھی اس بات پر ہے کہ اس کی ساری زندگی کے دوران انجام دیے گئے اعمال کا خاتمہ سعادت پر ہوتا ہے یا شقاوت پر!

حقیقی سعادت اور حقیقی شقاوت:

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ان حقیقة السعادة ان یختم للمرء عمله بالسعادة وان حقیقة الشقاوة ان یختم للمرء عمله بالشقاء"

"یعنی حقیقی سعادت یہ ہے کہ انسان کے اعمال کا خاتمہ سعادت پر ہو، اور حقیقی شقاوت یہ ہے کہ انسان کے اعمال کا خاتمہ شقاوت پر ہو۔"[1]

---

[1] معانی الاخبار ص ۳۴۵

حضرت یوسفؑ کی خاتمہ بالخیر کی دُعا:

اللہ کے نیک بندے اسی بات کا خاص خیال رکھتے ہیں اور ہمیشہ حُسنِ عاقبت کی فکر میں رہتے ہیں اور بارگاہ الٰہی میں دُعا کرتے ہیں کہ ان کا خاتمہ بالخیر بالخیران کی عمر سلامتی اور سعادت کے ساتھ ختم ہو۔ جیسا کہ حضرت یوسف صدیق علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا:

رَبِّ قَدۡ اٰتَيۡتَنِىۡ مِنَ الۡمُلۡكِ وَعَلَّمۡتَنِىۡ مِنۡ تَاۡوِيۡلِ الۡاَحَادِيۡثِ‌ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اَنۡتَ وَلِىّٖ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ‌ ۚ تَوَفَّنِىۡ مُسۡلِمًا وَّاَلۡحِقۡنِىۡ بِالصّٰلِحِيۡنَ ﴿۱۰۱﴾

''پروردگار اتو نے مجھے فرمانروائی کی نعمت سے نوازا اور مجھے تعبیر خواب کا علم دیا، تو ہی آسمانوں اورزمین کا خالق ہے، تو ہی دُنیا اور آخرت میں میرا دلی نعمت اور صاحبِ اختیار ہے۔ مجھے اس حال میں موت دے کہ میرا تمام وجود تیرے آگے جُھکا ہوا ہو اور مجھے نیک اور پاک لوگوں کے ساتھ محشور فرما۔''[۱]

علیؑ کا سوال اور رُسولؐ پاک کا جواب:

ایک مرتبہ رُسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر پر خطبہ میں ماہ رمضان المبارک کے فضائل ارشاد فرمارہے تھے کہ خطبہ کے دوران حضرت علیؑ نے اُٹھ کر کوئی بات پوچھی۔ آنحضرتؐ نے اس کا جواب عنایت فرمایا اور ساتھ ہی اُنہیں ماہِ رمضان میں نماز کی حالت میں شہید ہونے کی خبر بھی دے دی تو حضرت علیؑ نے عرض کیا:

''یارُسول اللہ وذالك فی سلامة من دینی فقال فی سلامة من دینك''

یارسول اللہ! بوقت شہادت میرا دین تو سالم ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا یقیناً!![۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں

لایزال المؤمن خالفاًمن سوء العاقبة لایتیقین الوصول الی رضوان الله وقت نزع روحه وظهور ملك الموت له۔

''مومن کو ہمیشہ اپنے بُرے کام کا خوف رہتا ہے اور خدا کی مکمل رضا اور خوشنودی کا یقین نہیں ہوتا

---

[۱] سُورہ ۱۲ آیت ۱۰۱

[۲] عیوان اخبار الرضاؑ جلد ا ص ۲۹۷

تا آنکہ اس کی رُوح قبض کرنے کا وقت آ جاتا ہے اور ملک الموت اس کے سامنے ظاہر ہو جاتا ہے۔''[1]

حقوق العباد سے بے اعتنائی:

ایسے لوگ بھی معاشرے میں موجود ہیں جو ساری زندگی نیک اعمال بجالاتے رہتے ہیں اور قاعدہ کے مطابق ایسے لوگوں کا شمار نیک لوگوں میں ہونا چاہیے لیکن اپنی عمر کے آخر میں لوگوں کے اموال اور حقوق کی پرواہ نہیں کرتے۔ باوجودیکہ وہ جانتے ہیں کہ بہت سے لوگوں کو قرض ادا کرنا ہے لیکن اپنی وصیت میں ان کا نام تک نہیں لیتے اور قرض کی ادائیگی کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں کرتے اور عملی طور پر حقداروں کے حق کو پامال کر دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے رشتہ داروں میں غریب اور بے بضاعت لوگ بھی موجود ہیں جو اُن کی امداد کے مستحق ہیں۔ لیکن پھر بھی صلہ رحمی کا خیال نہیں کرتے ان کے بارے میں کوئی وصیت نہیں کرتے تو ایسے لوگ اپنے غلط اعمال کی وجہ سے جہنمیوں کی صف میں قرار پائیں گے اور اُن کی زندگی کا نامہ اعمال شقاوت اور بدبختی کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچے گا۔

آخری عمر میں قرض کا احساس:

اس کے برعکس ایسے لوگ بھی ہیں جو مال و دولت جمع کرنے کے دلدادہ ہوتے ہیں ساری زندگی دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنے میں لگے رہتے ہیں۔ حلال اور حرام کا خیال نہیں کرتے، لوگوں کے مال کو غیر مشروع طریقہ پر ہتھیا لیتے ہیں اور مختلف صُورتوں میں اُن کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے رہتے ہیں، علی القاعدہ ایسے لوگوں کو اشقیاء اور ناپاک لوگوں کی لسٹ میں ہونا چاہیے، مگر اپنی زندگی کے آخری دنون میں راہ راست پر آ جاتے ہیں، اپنے ماضی پر نادم ہوتے ہیں۔ بوقتِ وصیت اپنے ذمہ لوگوں کے قرض کی ادائیگی کی وصیت کرتے ہیں، اور اپنے نیک اور فرض شناس عزیزوں سے زوردار الفاظ میں اس کی ادائیگی کی تاکید کرتے ہیں، اس طرح وہ اہل بہشت سے جا ملتے ہیں اور اُن کا نامہ اعمال سعادت اور نیک بختی کے ساتھ انجام کو پہنچتا ہے۔

حق و انصاف کی وصیت:

چنانچہ سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

---

[1] بحارالانوار جلد ۳ ص ۱۴۰

"ان الرجل لیعمل بعمل اھل الجنة سبعین سنِة فحیف فی وصیة له بعمل اھل النار وان الرجل لیعمل بعمل اھل النار سبعین سنِة فیعدل فی وصیة له بعمل اھل الجنة۔"

''یعنی ایک شخص ستر سال بہشتوں جیسے اعمال انجام دیتا رہتا ہے لیکن آخر میں اپنی وصیت میں دوسروں کے حقوق کے بارے میں ظلم وستم سے کام لیتا ہے تو اس کا نامہ اعمال جہنمیوں کے نامہ اعمال کی طرح بند ہوجاتا ہے اور ایک شخص ستر سال تک جہنمیوں جیسا کام انجام دیتا رہتا ہے۔ لیکن اپنی وصیت میں حق وعدالت سے کام لینے کی سفارش کرتا ہے تو اُس کا انجام اہل بہشت جیسا ہوگا۔''[1]

المختصر جس طرح تجارتی کمپنی کے نفع ونقصان کا دارومدار اس کی آخری بیلنس شیٹ پر ہوتا ہے اسی طرح انسان کی سعادت اور شقاوت کا دارومدار بھی ان کی موت اور زندگی کے آخری ایام کی صورتِ حال پر ہوتا ہے۔

تجارتی کمپنی نے اپنی تیس سالہ زندگی میں نفع ونقصان کے ہزاروں سودے کیے اور حساب وکتاب رکھنے والوں نے ان تمام سودوں کو بیسیوں رجسٹروں میں درج کیا، لیکن کمپنی کے خاتمہ پر آڈٹ پارٹی نے حساب کے تمام تیس سالہ ریکارڈ کو ایک صفحہ کی چند سطروں پر خلاصہ کرکے بیلنس شیٹ کے عنوان سے حصّہ داروں کے سامنے رکھ دیا اور اُنہوں نے ایک ہی نظر سے اندازہ لگالیا کہ اس تمام عرصہ میں اُنہیں کیا نفع ہوا ہے اور کیا نقصان؟

مرنے کے وقت اعمال سے آگاہی:

ایک مکلف انسان بھی اپنی عمر کے بیسیوں سالوں میں ہزار ہا نیک اور بد، اچھے اور بُرے اعمال بجالاتا ہے اور رقیب وعتید (نامہ اعمال لکھنے والے دو فرشتے) اس کے تمام اعمال کو لکھتے جاتے ہیں جب موت آتی تو محتضر (مرنے والے) کو ان تمام اعمال کا خلاصہ پیش کردیا جاتا ہے۔ یعنی ہر شخص اپنی زندگی کے آخر اور بازارِ دُنیا سے لین دین کے خاتمہ پر اپنے اعمال کا میزانیہ (بیلنس شیٹ) کو دیکھ لیتا ہے، اچھے یا بُرے انجام سے مطلع ہوجاتا ہے اور اسے جلد پتہ چل جاتا ہے کہ وہ ثواب کا مستحق ہے یا عذاب کا؟ اور یہی مختلف تعبیرات کے ساتھ آیات اور روایات میں بھی آچکی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۶۵۹ (مادہ وصی)

مرنے والے کو نامہ اعمال دکھایا جاتا ہے:

"مامن میت یموت حتی یترای له ملکان الکاتبان عمله فان کان مطیعا قالا له جزاك الله عنا خیرا فرب مجلس صدق اجلستنا وعمل صالح قد احضرتنا. فان کان فاجرا قالا لاجزاك الله خیرا فرب مجلس سوء قد اجلستنا وعمل غیر صالح قد احضرتنا وکلام قبیح قد اسمعتنا۔"

"جو شخص بھی مرتا ہے نامہ اعمال لکھنے والے دونوں فرشتے اس کے اعمال کو اس کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اگر وہ خدا کا مطیع اور فرمانبردار ہوتا ہے تو اُسے کہتے ہیں خدا تجھے جزائے خیر دے کس سچائی کی محفلوں میں تو ہمیں لے گیا اور کس قدر اعمالِ صالحہ کے ماحول میں تو نے ہمیں پہنچایا، اور اگر فاسق وفاجر اور گناہگار ہو تو اسے کہتے ہیں کہ خدا تجھے کبھی جزائے خیر نہ دے کتنی بڑی مجلسوں میں ہمیں لے گیا اور کتنی بداعمالیوں کے مقامات پر تُو نے ہمیں پہنچایا، اور کس قدر بُری باتیں ہمیں سنوائیں۔"[1]

ایک اور حدیث میں ہے:

"من مات فقد قامت قیامة"

"جو شخص مرجاتا ہے اس کی قیامت برپا ہوجاتی ہے۔"[2]

البتہ اس حدیث میں قیامت سے مراد وہ قیامت نہیں ہے جسے قیامت کبریٰ کہتے ہیں جن میں اوّلین اور آخرین کی ساری مخلوق جمع ہوگی، بلکہ اس سے مراد ہر شخص کی قیامتِ صغریٰ ہے، یعنی موت کی وجہ سے ہر شخص روزِ حساب پر پہنچ جاتا ہے، اس کی قیامت صغریٰ برپا ہوجاتی ہے اور اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ آیا وہ نیک لوگوں کے زمرے میں داخل ہے یا بدکاروں کے گروہ ہیں!!

انسان اور بہشت یا دوزخ کا درمیانی فاصلہ:

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ومابین احد کم وبین الجنة اوالنار الاالموت ان ینزل به"

---

[1] بحارالانوار جلد۳ ص ۲۳۱

[2] علم الیقین ص ۸۴۹

''یعنی تم میں سے ہر ایک شخص کے اور جنت یا دوزخ کے درمیان صرف موت کا فاصلہ ہے کہ جب وہ آجاتی ہے اور زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے۔''[1]

عوام النّاس یا بے سمجھ لوگ جب اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو کھو بیٹھتے ہیں تو زار و قطار روتے اور آنسو بہاتے ہیں اور بے تابی کا مظاہرہ کرتے ہیں، لیکن اُن کا یہ رونا دھونا مرنے والے اور اس کے انجام کے بارے میں نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے لیے روتے اور آنسو بہاتے ہیں، کیونکہ ان کا محبوب ان سے جُدا ہو جاتا ہے اور وہ اس کے ہجر و فراق میں نالہ و شیون کرتے ہیں۔ لیکن باایمان اور سمجھ دار لوگ جب اپنے کسی عزیز کی موت پر گریہ و زاری کرتے ہیں تو اُن کا یہ رونا اپنی ذات کے لیے نہیں ہوتا بلکہ مرنے والے کے لیے روتے پیٹتے ہیں اور اس کے لیے جزع فزع کرتے ہیں کیونکہ اُنہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مرتے ہی اس کی قیامت صغریٰ برپا ہو جاتی ہے اور اس کے اور جنت یا جہنم کے درمیان موجود فاصلے ختم ہو جاتے ہیں، لیکن اُنہیں معلوم نہیں ہوتا کہ مرنے کے بعد اس کا کیا انجام ہوگا؟ آیا رِحمتِ الٰہی اس کے شاملِ حال ہے اور وہ بہشتی ہے؟ یا غضب الٰہی میں گرفتار ہے اور جہنمی ہے؟

ابوذرؓ کے اپنے فرزند کی موت پر کلمات:

چنانچہ روایت میں ہے کہ:

''لما مات ذر بن ابی ذر مسح ابوذر القبر بیدہ ثم قال رحمك الله یاذر والله ان کُنت بی باراً ولقد قبضت وانی عنك الراض اماوالله مابی فقدك وما علی من غضاضة وما لی الی حد سوی الله من حاجة، ولولا هول المطلع لسرنی ان ا كون مكانك ولقد شغلنی الخزن لك عن الحزن علیك والله مابكیت لك ولك بكیت علیك فلیت شعری ماذا قلت ومازا قلیل لك۔ ثم قال۔ اللهم انی قد وهبت له ما افترضت علیه من حقی نهب له ما افترضت علیه من حقك فانت احق بالجود منی۔''

''یعنی جب رُسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محترم صحابی جناب ابوذر کے فرزند ''ذر'' کا انتقال ہوا اور اسے دفن کر دیا گیا تو ابوذر غفاری نے اس کی قبر پر ہاتھ رکھ کر کہا: ذر! خدا تجھ پر رحمت نازل کرے، واللہ اگر تو

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۶۳

زندگی میں میرے ساتھ نیکی کیا کرتا تھا تو اب جبکہ تو اس دنیا سے جا چکا ہے میں بھی تیرے بارے میں رضامندی کا اظہار کر رہا ہوں، خدا کی قسم میں تیری موت کی وجہ سے مخزن، غمگین اور پریشان نہیں ہوں اور خدا کے سوا مجھے کسی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اگر قیامت اور آخرت کا معاملہ درپیش نہ ہوتا تو میں بڑی خوشی سے تمہاری جگہ قبر میں ہوتا۔ اب مجھے تمہاری آخرت کی فکر نے تمہاری موت پر آنسو بہانے سے روکا ہوا ہے۔ خدا کی قسم میں تمہاری موت اور جُدائی پر گریہ نہیں کر رہا بلکہ خود تم پر اور تمہیں درپیش آخرت کی منازل پر اشک بہا رہا ہوں، کاش مجھے معلوم ہوتا کہ مرنے کے بعد تم نے کیا کہا اور تمہیں کیا کہا گیا ہے؟...... پھر خدا کی جانب متوجہ ہو کر کہا...... بارِالٰہا! جو کچھ تو نے میرے لیے حق کی صورت میں اس پر واجب کیا تھا میں نے اُسے معاف کر دیا ہے، خدایا تیرا حق اس پر واجب بنتا ہے تو بھی اسے معاف کر دے، کیونکہ بخشش کے لحاظ سے تو مجھ سے زیادہ بخشش کے لائق ہے۔"[۱]

ناقابلِ قبول درخواست:

ہر شخص مرنے کے بعد فوراً ہی اپنے انجام سے آگاہ ہو جاتا ہے، اور سمجھ لیتا ہے کہ آیا وہ بہشتی اور اہلِ سعادت ہے یا جہنمی اور اہلِ عذاب ہے؟ اسی لیے تمام کفار اور گناہگار لوگ جو اپنی ساری عمر جہالت اور غفلت میں گزار دیتے ہیں موت کے ابتدائی لمحات ہی میں خود کو درپیش خطرات سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور اپنے کیے پر اظہارِ ندامت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآىِٕلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

"یعنی پروردگار! مجھے دُنیا کی طرف واپس پلٹا تاکہ میں اپنے کئے کی تلافی کروں اور اعمالِ صالحا بجالاؤں، مگر اسے جواب نفی میں ملے گا اور کہا جائے گا کہ یہ بے اثر باتیں کبھی پُوری نہیں ہوں گی اور اُن کی موت کے بعد عالم برزخ ہے جب تک قیامت برپا نہیں ہو جاتی اور لوگ قبروں سے اُٹھائے نہیں جاتے۔"[۲]

---

[۱] کافی جلد ۳ ص ۲۵۰

[۲] سُورہ ۲۳ آیات ۹۹، ۱۰۰

شخصیت بنانے والے سودے:

جس مال کا سودا تجارتی کمپنیاں اور تاجر لوگ مُلک کے رائج الوقت سکے کے ساتھ کیا کرتے ہیں اور اس مال کے سودے سے کئی لحاظ سے مختلف ہے جو لوگ اپنی نقد زندگی کے بدلے بازارِ دُنیا سے خریدتے ہیں۔ ایک فرق تو یہ ہے تجارتی سودوں میں مالی آمدنی مقصود ہوتی ہے، اگر تاجر اپنے مقصد کو پہنچ جائے اور اسے اپنے سودے میں منافع مل جائے تو خوش ہوتا ہے۔ اگر خلافِ توقع اسے نقصان پہنچے تو پریشان اور غمگین ہوتا ہے۔ صورتِ حال خواہ کچھ ہو یہ خوشی اور غمی عارضی ہوتی ہے اور کچھ عرصہ کے بعد تاجر اسے فراموش کر دیتا ہے، لیکن بازارِ دُنیا میں عمر کے بدلے میں انجام پانے والے سودے اس طرح نہیں ہوتے، کیونکہ اس قسم کا لین دین جو انسان کی شخصیت پر اثر ڈالتا ہے سودا خریدنے والوں کے انجام اور مقدر کو معین کرتا ہے، اور آخرت میں حساب وکتاب کے بعد یا تو اُنہیں کامیاب لوگوں کے زمرے میں داخل کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ثوابِ ابدی کا مستحق بنتا ہے یا پھر مجرموں کی صفت میں لا کھڑا کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

حق ہمی گوید چہ آوردی مرا
اندر این مہلت کہ دادم مرتورا
عمر خودرادرچہ پایان بروہ ای
قوت وقوت درچہ فانی کردہ ای
گوہر دیدہ کجا فرسودہ ای
پنج حس را اور کجا پالودہ ای
گوش وچشم وہوش گوہر ہائے عرش
خرچ کردی چہ خریدی تو زفرش
نعمت دادم بگو شکرت چہ بود
دادمت سرمایہ حین بنمای سود

(ذاتِ حق کا فرمان ہوتا ہے کہ جو مہلت میں نے تجھے دی تھی اور اس میں میرے لیے کیا لایا ہے؟ تُو نے اپنی عمر کہاں ضائع کی ہے، اپنا مال اور طاقت کہاں خرچ کیے ہیں؟ آنکھ جیسے گوہر خرچ کرکے زمین

سے کیا خریدا ہے؟ میں نے تجھے نعمت دی مجھے بتا اس نعمت کا شکر کہاں ہے؟ مَیں نے تجھے جو سرمایہ عطا کیا تھا اس کا منافع کہاں ہے؟

مالی حسابات کی جانچ پڑتال:

تجارتی کمپنی کے مال اور سرمایہ کی جانچ پڑتال اور لین دین کی صُورت حال پر کنٹرول کمپنی کے لیے ضروری ہوتا ہے، کیونکہ جانچ پڑتال اور کنٹرول کے ذریعہ ہی کمپنی کے ڈائریکٹر کو اس کے غلط یا صحیح راہ پر چلنے کا پتہ لگتا ہے اور کاروبار میں نفع یا نقصان کا علم ہوتا ہے۔ اگر کاروبار کی صورتِ حال تسلی بخش نہیں ہوتی تو وہ اپنے طریقہ کار کو تبدیل کرتا اور آئندہ کے لیے نئی پالیسی وضع کرتا ہے اور اس بارے میں مفید اور تسلی بخش فیصلوں پر عملدر آمد کی پالیسی اپناتا ہے۔

زندگی کے سرمایہ کی جانچ پڑتال اور بازار دنیا میں ہونے والے کاروبار پر نگرانی بھی ایک حتمی اور ضروری امر ہے۔ انسان اپنے نفس کا محاسبہ کر کے اپنے اعمال و اخلاق سے واقف ہوسکتا ہے اور اُس سے پتہ چل سکتا ہے کہ آیا اس کی عمر صحیح خطوط پر کام کر رہی ہے کہ جس کے نتیجہ میں وہ معنوی سربلندیوں تک رسائی حاصل کر سکے۔ یا نہ! بلکہ اُس کے قدم باطل کی راہ میں اُٹھ رہے ہیں اور تباہی کی جانب بڑھ رہے ہیں جو نا قابلِ تلافی نقصان اور عمر کے خسارے کا سودا ہے۔

محاسبہ نفس:

اسلام کی انسان ساز تعلیمات میں نفس کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال تمام مسلمانوں کا اہم ترین فریضہ ہے۔ اسلام کے عظیم پیشواؤں نے متعدد روایات کے ضمن میں اپنے پیروکاروں کو اس بات کی زبردست تاکید ہے کہ اپنے نفس کا محاسبہ کریں۔ ان میں جو عیب اور نقائص ہیں اُن سے آگاہ ہوں اور اپنی اصلاح کریں۔ اور یہ سب کچھ موت آنے سے قبل ہو اور خود سازی کی فرصت ضائع ہوجانے سے پہلے ہو۔ وہ اپنے آپ کا محاسبہ اس سے پہلے کر لیں کہ خدائی کارندے ان کا حساب کرنے کے لیے ان کو عدلِ الٰہی کے کٹہرے میں جا کھڑا کریں۔

ابوذرؓ کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیتیں:

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی وصیتوں کے ضمن میں ابوذر غفاریؓ سے فرماتے ہیں:

"یااباذر حاسب نفسك قبل ان تحاسب فانه اهون لحسابك غدا اوزن نفسك قبل ان توزن وتجهز اللعرض الاکبریوم تعرض لایخفی علی الله

خافیة...الیٰ ان قال...یااباذر لایکون الرجل من المتقین حتی یحاسب نفسه اشد من محاسبة الشریك شرکه، فیعلم من این مطعمه ومن این مشربه ومن این ملبسه امن حلال اومن حرام، یااباذری من لم یبال من این اکتسب المالك لم یبال الله من این ادخله النار۔"

"یعنی اے ابوذر! اپنے نفس کا حساب کتاب کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے! کیونکہ یہ کام تمہارے قیامت کے دن کو آسان کردے گا۔ تم اپنے آپ کا موازنہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا موازنہ کیا جائے اپنے آپ کو عرصہ قیامت میں رب العزت کی بارگاہ میں پیش ہونے کے لیے ابھی سے تیّار کرلو، کیونکہ اس دن کوئی چیز خدا سے مخفی نہیں رہے گی......پھر فرمایا......اے ابوذر! کوئی شخص تقویٰ کے بلند مرتبہ پر اس وقت تک فائز نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنا محاسبہ نہ کرے اور احتساب بھی ایسا سخت کرے جو ایک شریک دوسرے شریک سے کرتا ہے۔ ایسے دقیق محاسبہ کی وجہ سے یہ جاننے کی کوشش بھی کرے کہ اُس کا کھانا اور پہننا کہاں سے آیا؟ حلال سے یا حرام سے؟ اے ابوذر! جو شخص حدودِ الٰہی کی پرواہ نہیں کرتا اور اس بات کا خیال نہیں کرتا کہ اُس کا مال کیسے اور کہاں سے آیا ہے؟ تو خدا کو بھی اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ اُسے کس راہ سے جہنم میں ڈالے۔"[۱]

مفید احتساب:

"من حاسب نفسه ربح ومن غفل عنها خسر"

"جو شخص اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے وہ فائدہ میں رہتا ہے اور جو اس سے غافل ہوتا ہے وہ گھاٹے میں رہتا ہے۔"[۲]

عام طور پر تاجروں اور تجارتی کمپنیوں کا دستور یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سال کے بعد اپنے کاروبار کا حساب کرتی ہیں اور اپنے نفع ونقصان کا اندازہ سال کے آخر میں لگاتی ہیں۔ یہ پروگرام مالی اور کاروباری اداروں کے لیے تو مناسب ہے، لیکن بازارِ دُنیا میں جو کاروباری زندگی کے سرمایہ سے انجام پاتے ہیں اور جن سے ہماری دُنیا و آخرت کی تقدیر وابستہ ہے اُن

[۱] وسائل الشیعہ، کتاب الجہاد باب وجوب محسابۃ نفس ص ۲۶

[۲] نہج البلاغہ کلمہ ۲۰۸

کا احتساب نہ صرف سال میں ایک بار بلکہ مہینہ اور ہفتہ میں ایک بار بھی ناکافی ہے، کیونکہ اس سے ہماری سعادت کی ضمانت نہیں مل سکتی اور ہمارے سودوزیاں کو کما حقہ واضح اور آشکار صورت میں بیان نہیں کرسکتا۔

روزانہ کا احتساب:

جولوگ سعادت ابدی کے طلب گار ہیں اور انسان بن کر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اُنہیں چاہیے کہ وہ ہر شبانہ روز میں دوبارا اپنا محاسبہ کریں، جو جائز اور ناجائز کام انجام دیے ہیں اُن کی طرف توجہ کریں، بڑے غور کے ساتھ اپنے نفع نقصان کا اندازہ لگائیں۔ اور یہی چیز متعدد روایات میں بھی بیان ہوئی ہے۔ اور پیشوایانِ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو اس پر عمل پیرا ہونے کی سختی سے تاکید کی ہے۔

صبح شام خدا کی یاد میں ہو:

چنانچہ حضرت رُسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"لذكر الله بالغدو والصال خير من حطم السيون فى سبيل الله عزوجل يعنى من تذكر الله بالغدو تذكر ماكان منه فى ليلة من سو عمله واستغفر الله وقاب اليه انتشر وقد حطت سيئاته وغفرت زنوبه ومن ذكر الله بالاصال وهى العشيات ورجع نفسه فيما كان منه يومه ذالك من سرنه على نفسه وضاعة الامر ربه فذكر الله واسغفر الله تعالیٰ واناب راح اهله وقد غفرت ذنوبه۔"

"یعنی صبح شام یادِ خدا میں رہنا اس بات سے بہتر ہے کہ اس کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے تلواریں ٹوٹ جائیں یعنی جو شخص صبح صبح خدا کو یاد کرے اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے اور جو برائیاں رات کو انجام دی ہیں اُنہیں خاطر میں لے آتا ہے تو خدا سے اُن کی معافی کی درخواست کرتا ہے اور اُن سے توبہ کرتا ہے۔ صبح کے وقت جب وہ اپنے گھر سے باہر نکلتا اور معمول کے کاموں میں لگ جاتا ہے تو اس کے تمام گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں۔ اور جو شخص اوائل شب میں خدا کو یاد کرتا اور اپنا محاسبہ کرتا ہے اور متوجہ ہوتا ہے کہ آج کے دن اپنے اوپر جو ظُلم کیا ہے اور فرمانِ خدا سے سرپیچی کی ہے تو خدا کو

یاد کر کے اس کی بارگاہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے۔ پھر جب اپنے گھر کو لوٹ آتا ہے اور اپنے بال بچوں میں واپس آتا ہے تو اس کے گناہ بخشے جا چکے ہوتے ہیں۔"[۱]

محاسبہ نفس اور حفظ ما تقدم:

اسی طرح امام جعفر صادق علیہ السلام عبداللہ بن جندب سے فرماتے ہیں۔

"یابن جندب حق علی کل مُسلم یعرفنا ان یعرض عمله فی کل یوم ولیلة علی نفسه، فیکون محاسب نفسه فان رای حسنة استزار منها وان رای سیئة استغفر منها لئلا یخزیٰ یوم القیامة"

"یعنی اے ابن جندب ہر مُسلمان جو کہ آئمہ معصومین کی معرفت رکھتا ہے اس پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ ہر شب و روز اپنے اعمال کو اپنے سامنے لے آئے اور خود ہی اپنے نفس کا احتساب کرے، اگر انجام شدہ کام میں کوئی اچھائی دیکھے تو اس میں اضافہ کرنے کی کوشش کرے اور اگر بُرائی دیکھے تو خدا کی بارگاہ میں اس کی معافی کی درخواست کرے تا کہ بروز قیامت اُسے ذلت و رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"[۲]

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام فرماتے ہیں۔

"لیس منا من لم یحاسبه نفسه کل یوم"

"یعنی جو شخص ہر روز اپنا محاسبہ نفس نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں۔"[۳]

حسابِ قیامت سے چھٹکارا:

جو شخص ہر روز صحیح معنوں میں مکمل طور پر اپنا احتساب کرتا ہے۔ اچھائیوں اور بُرائیوں کا تقابل کرتا ہے، نیکیوں میں اضافہ کرتا ہے اور برائیوں سے استغفار کرتا ہے، درحقیقت وہ اس طرح سے اپنے قیامت کے حساب کو واضح کرتا ہے اور جیسا کہ احادیث میں وارد ہوا ہے، ایسے شخص کا قیامت میں دوبارہ حساب نہیں لیا جائے گا۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

---

[۱] وسائل الشیعہ کتاب جہاد باب وجوب محاسبۃ النفس ص ۶۲

[۲] تحف العقول ص ۳۰۱

[۳] کافی جلد ۲ ص ۴۵۳

"من حاسب نفسه فی الدنیا لم یحاسبه الله یوم القیامة"

"جوشخص دُنیا میں خود احتسابی سے کام لیتا ہے، بروزِ قیامت خدا اُس سے حساب نہیں لے گا۔" [۱]

"اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ وہ سونے سے پہلے اور نیند سے بیدار ہونے کے بعد اپنے جسمانی اعضاء کے لیے مختصر سی ورزش کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے مناسب ہے کہ چند منٹ اپنی اخلاقی فکری اور روحانی سرگرمیوں کو پروان چڑھانے کے لیے بھی صرف کیا کریں۔ یہ طریقہ کار شعوری سربلندی کے لیے نہایت ہی موثر ہے۔ جس روش کو اپنے اعمال و افعال میں اپنانا ہے اور جس پالیسی کو اپنانا ہے اُس کے بارے میں روزانہ سوچ و بچار اور غور وفکر سے کام لینا چاہیے اس طرح سے عقل وارادہ کی تقویت ملے گی۔ اس کام سے شعور کی گہرائیوں میں ایک مجہول قلمرو وسعت پیدا کر لے گی جس میں ہر شخص تنہائیوں میں اپنے بے نقاب چہرہ کو دیکھ سکے گا۔ ہماری زندگی کے قوانین پر عمل پیرا ہونے کا ہماری اندرونی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔"

"جس طرح ایک تاجر اپنے آمد وخرچ کے حساب کو اور ایک دانشور اپنے تجربوں کے کاغذات کو ٹھیک طریقے سے مرتب کرتا ہے اسی طرح ہر شخص کو اپنے روزمرّہ کے اعمال کا بھی خاص خیال کرنا چاہیے، خواہ وہ امیر ہو یا غریب، جوان ہو یا بوڑھا، عالم ہو یا جاہل، اسے روزانہ اپنی انجام شدہ نیکیوں اور برائیوں خاص کر خوشی یا غمی، اضطراب یا سکون، دوستوں اور ہم نوع افراد کے ساتھ کینے یا محبّت کا ریکارڈ مرتب کرنا چاہیے۔ صرف یہی ایسا کام ہے کہ اگر اسے مستقل مزاجی کے ساتھ انجام دیا جائے تو تدریجی طور پر جسم اور جان میں تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ [۲]

انسانوں اور حیوانوں کا باہمی فرق:

کرۂ ارضی پر بری اور بحری بہت سے جانور ایسے ہیں جو آئین خلقت کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں تخلیقی پروگرام کے مطابق اپنے عزیزوں کی تکمیل کرتے ہیں اور اپنی طبعی زندگی کو جاری رکھے ہوئے ہیں، لیکن ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی زندگی کے سرمایہ سے بازار دنیا میں سود وزیاں کے سودے کا مسئلہ درپیش نہیں ہے بلکہ یہ بات صرف اور صرف انسان کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ حیوانات کی تخلیق ہی صرف ایک جانبہ صورت میں ہوئی ہے، یعنی صرف وہ حیوان ہے اور مجبور ہیں کہ ہمیشہ حیوان رہیں، زندگی کے تمام امور میں حیوان کا راہنما اس کا غریزہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ وہ خوراک حاصل کرتا ہے، اپنا مکان بناتا ہے، بچوں کی پرورش، زندگی کی حفاظت اور دشمن سے لڑائی کرتا ہے وغیرہ جو مشیت پروردگار

---

[۱] مفردات راغب ص ۱۱۷ (مادہ حسب)

[۲] راہ رسم زندگی ص ۱۱۷

کے تحت اس کی سرشت میں داخل ہے، چونکہ غرائز کی اطاعت ناگزیر ہوتی ہے لہٰذا مجبور ہے کہ بے کم و کاست اس کی ہدایت پر عمل کرے۔ اس میں یہ قدرت نہیں ہوتی ہے کہ اس راہ سے ذرہ بھر ادھر یا ادھر ہو۔ اسے آزادی اور اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے کا حق حاصل نہیں ہے جس سے وہ کوئی کام حسب منشا کر سکے۔ اس کے نزدیک اچھا یا برا کام وہی ہوتا ہے جو اسے اس کا غریزہ بتاتا ہے۔

انسان کی تخلیق دو پہلو کی ہے:

لیکن انسان کا معاملہ اس سے جدا ہے اس کی تخلیق دو پہلو پر مبنی ہے۔ ایک طرف تو وہ حیوانات کے ساتھ کئی صفات میں شریک ہے جیسے اپنی ذات سے محبت، زندگی سے پیار، شہوت و غضب، بھُوک اور پیاس، نیند اور بیداری، صحت اور بیماری ،قوت اور ضعف، بچپن اور بڑھاپا اور پھر بڑھاپا اور موت۔ جبکہ دوسری طرف اس میں کچھ مخصوص صفات پائی جاتی ہیں جو اس کی سرشت میں داخل اور فطرت میں شامل ہیں جیسے عقل کی طاقت، سرشار ہوش، فطری معرفت، اخلاقی وجدان، اعلٰی انسانی رجحانات، عمل کی آزادی انتخاب کا حق، خلاقیت کی قدرت اور بے انتہا کمال کے حصول کی لیاقت۔

آزادی ایک قیمتی سرمایہ ہے:

عقلمند انسان، نہ صرف جانوروں کی طرح غرائز کے جنگل میں پھنسا ہوا نہیں ہے بلکہ جو آزادی اور اختیار سے پروردگار عالم نے عطا فرمائے ہیں اُن کے ذریعہ اگر چاہے تو اپنے غریزہ کو شکست دے سکتا ہے، اس کی نافرمانی کر سکتا ہے اور اپنی مرضی کا دوسرا راستہ جو نفسانی خواہشات کے مخالف ہوتا ہے، اختیار کر سکتا ہے۔ اور یہ آزادی خالق کا وہ گراں قدر عطیہ ہے جو صرف بنی نوع انسان کے ساتھ مخصوص ہے تا کہ بوقتِ ضرورت اسے حیاء انسانیت کی راہ اور مکارِم اخلاق سے متصف ہونے کے لیے استعمال کر سکے اور اپنی سربلندی اور ارتقاء کے وسائل فراہم کر سکے۔ بطور مثال:

حبِّ ذات اور زندگی سے پیار کا غریزہ انسان کو جانور کی طرح اپنے بچاؤ اور زندگی کی حفاظت کی دعوت دیتا ہے، لیکن خدا پر ایمان انسان کو کلمۂ حق کی سربلندی، عدل کے قیام، انسانیت کی گمراہی اور ناانصافی سے نجات کی خاطر جہاد اور شہادت کی طرف بُلاتا ہے۔ صاحبِ ایمان افرادِ حبِ ذات کے غریزے کو ٹھوکر مار کر زندگی سے چشم پوشی کر لیتا ہے۔ اور بڑے ذوق اور شوق کے ساتھ موت کا استقبال کرتا ہے اور اس طرح سے وہ کمال اور سعادت کے اعلٰی ترین مدارج تک جا پہنچتا ہے۔

غریزے کو ٹھوکر مار کر عفت کی حفاظت کی جاتی ہے:

شہوات کا طاقتور غریزہ ایک جوان آدمی کو فحش اور ناپاکی پر بھڑکاتا ہے جبکہ ایمان اور امرالٰہی کی اطاعت اسے اس

بات پر آمادہ کرتی ہے کہ عزیزے کوٹھوکر ماری جائے، عفت کے دامن کو ناپاکی کی نجاست سے آلودہ نہ کیا جائے، رضائے الٰہی کو جنسی خواہشات کی تکمیل پر مقدم رکھا جائے اور خود کو تقویٰ اور نفس پر قابو پانے کی صفت سے مزین کیا جائے۔

کرّہ ارضی پر فرمانروائی:

پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ انسانیت کے پہلو نے بشر کو صرف روحانی سربلندی اور معنوی ارتقاء کے لحاظ سے ہی ممتاز نہیں کیا بلکہ مادی نقطہ نظر سے بھی اسے کرہ ارضی کی فرمانروائی عطا کی ہے۔ زمین اور زمین میں موجود تمام اشیاء کو اس کے لیے مسخر کر دیا ہے اور طبیعت کے تمام موالید پر اسے حاکم بنایا ہے۔ یہ انسانی طاقت ہی ہے جس کی وجہ سے انسان مسلسل کئی صدیوں سے زمین کی کیفیتوں کو دگرگوں کرتا چلا آ رہا ہے۔ اس کے معاون نکال رہا ہے اس کے ذخائر سے استفادہ کر رہا ہے، اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو منصۂ شہود پر لا رہا ہے۔ اس طرح اُس نے ایک تو اپنی زندگی کو آسودہ بنایا ہے اور دوسرے اپنی لیاقت اور شائستگی کا مظاہرہ کیا ہے۔

انسان اور کرّہ ارضی کی آبادی:

حیوانات بھی قدیم الایام اور مدّت مدید سے روئے زمین پر بستے چلے آ رہے ہیں طبیعت کی پروان چڑھائی ہوئی چیزوں سے اپنی روزی پا کر زندہ ہیں، لیکن کبھی بھی اُن کو یہ قدرت حاصل نہیں ہوئی کہ کرہ ارضی میں معمولی سی تبدیلی ہی پیدا کریں، اس میں کسی قسم کی کیفیت کو تبدیل کر کے اپنی زندگی کے چہرہ کو بدل سکیں یہ صرف انسان ہی ہے جس میں یہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں، کیونکہ اس کی تخلیق ہی اعلیٰ اور بہترین کینڈے میں ہوئی ہے اور انسانیت کی گرانقدر قیمتی صلاحیتوں سے اسے نوازا ہے۔ اسی لیے یہ مہم بھی خدا نے انسان کے سپرد کر دی ہے اور قرآن میں اسے حکم دیا ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر زمین کی آبادی اور شادابی کے اسباب فراہم کرے۔

هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا

''خداوند عالم نے تمام انسانوں کو زمین سے پیدا کیا ہے اور تمہیں سے وہ چاہتا ہے کہ اسے معمور اور آباد کرو۔''[1]

حیوانات کی صفات بھی ان کے اعمال کی مانند ایک پہلو کی حامل ہے یعنی انسان کی بنیاد غریزی اور فطری ہے اور اُن کی ہر ایک نوع آئین آفرینش کے مطابق مجبور ہے کہ اپنے غریزہ کے فرمان کی تعمیل کرے اور اس کے احکام پر بے چون

[1] سورہ ۱۱ آیت ۶۱

وچرا عملدر آمد کرے اور یہ حیوانی طبیعت کا لازمی حصہ ہے۔

نیش عقرب نہ ازرہ کین است
اقتضائے طبیعتش این است

(بچھو دُشمنی کی بنا پر ڈنک نہیں مارتا بلکہ اس کی طبیعت کا تقاضا ہی ایسا ہے)

انسان اور انتخاب کا حق:

لیکن انسان جو کہ عقل و آزادی کے ایسے گراں قیمت سرمایہ کا حامل ہے، باوجودیکہ خالق توانا نے اس کی فطرت میں کچھ غریزے بھی ودیعت فرمائے ہیں لیکن اسے غرائز کی دُنیا میں محصور اور محبوس نہیں رکھا، بلکہ اسے انسانی اخلاق اور حیوانی صفات کے اپنانے میں آزاد چھوڑا ہے، اسی لیے اگر وہ چاہے تو جانوروں اور درندوں کی مانند شہوات اور غرائز کے سامنے غیر مشروط طور پر جھک جائے اور اپنے وجود کے اندر موجود انسانیت کو پائمال کر ڈالے اور اگر چاہے تو اسانیت کو اپنا کر حیوانی غریزوں کو حدِ اعتدال پر رکھے اور انسانیت کی مقدس حدود کی حفاظت کرے۔ انتخاب کا یہ حق جو سرمایہ زندگی کے بدلے بازار دُنیا میں نیک اور بد چیزوں کی خریداری کا مستوجب ہوتا ہے صرف اور صرف انسان کے ساتھ مخصوص ہے اور حیوانات اس قسم کا آزادی سے محروم ہیں۔

یا فرشتہ سے افضل یا حیوان سے بھی پست:

عبداللہ بن سنان کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ "آیا ملائکہ افضل ہیں یا اولادِ آدم؟" تو امام علیہ السلام نے فرمایا:

"قال امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ان اللہ رکب فی الملائکۃ عقلا بلا شھوۃ ورکب فی البھائم شھوۃ بلا عقل ورکب فی بنی آدم کلیتھا فمن غلب عقلہ شھوۃ فھو خیر من الملأئکۃ ومن غلب شھوتہ عقلہ فھو شر من البھائم۔"

"حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ خداوند عالم نے ملائکہ کی ساخت میں عقل کو بغیر شہوت کے ودیعت فرمایا ہے اور حیوانات میں شہوت پر غالب آجائے وہ ملائکہ سے افضل ہے اور جس کی شہوت

اس کی عقل پر غالب آ جائے وہ جانوروں سے پست ہے۔‘‘[1]

اسی بارے میں چند اشعار:

در حدیث آمد کہ یزدان مجید
خلق عالم راسہ گونہ آفرید
یک گروہ راجملہ عقل وعلم وجود
آن فرشتہ است نداند جُز سجود
نیست اندر عنصر ش حرص وہویٰ
نور مطلق زندہ از عشقِ خدا
یک گروہ دیگر از دانش تہی
ہم چوحیوان از علف درفربہی
اونبیند جز کہ اصطبل وعلف
ازشقاوت غافل است وازشرف
وان سیم ہست آدمیز ادو بشر
ازفرشتہ ینمی ونیمی زخر
نیم خر خود مائل سفلی بود
نیم دیگر مایہ علوی بود
تا کدامین غالب آید درنبرد
زین دوگانہ تا کدامین بُرونرد
عقل از غالب شہودپس شد فزون
ازملائک این بشر درآزمون

[1] وسائل الشیعہ جلد ۴ کتاب الجہاد باب وجوب غلبۃ العقل ص ۲۹

شہوت از غالب شود پس کمتر است
از بہائم این بشر زان کاتبر است

حدیث میں وارد ہوا ہے کہ خالقِ کائنات نے مخلوقات عالم کو تین طرح سے خلق فرمایا ہے، ایک قسم تو وہ ہے جو عقل، علم اور جود کا مجموعہ ہے اور وہ فرشتے ہیں جو سجدہ خدا کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتے۔ اُن کے عنصر طبعی میں حرص و ہویٰ کا نام ونشان تک نہیں بلکہ نور مطلق ہیں اور عشقِ الٰہی کے ساتھ زندہ ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جو علم ودانش سے خالی ہے اور وہ ہیں حیوانات جو گھاس کھا کھا کر موٹے ہوئے ہیں انہیں اصطبل اور گھاس چارے کے سوا کوئی کام نہیں نہ تو اُنہیں شقاوت و بدبختی کا علم ہے اور نہ ہی عزت وشرف کے نام سے آشنا ہیں۔ لیکن تیسری قسم وہ ہے جسے انسان اور اولا دآدم کہتے ہیں، جس میں نصف صفات فرشتوں والی ہیں اور آدھی صفات جانوروں کی سی ہیں۔ حیوانی صفات کی وجہ سے وہ پستی کی طرف مائل ہے اور فرشتوں کی صفات کی وجہ سے وہ بلندی کی جانب متوجہ ہے۔ ان دونوں متضاد صفات میں ہر وقت جنگ جاری ہے، اور ہر ایک بازی لے جانے پر آمادہ ہے۔ اگر عقل بازی جیت گئی تو اس آزمائش میں انسان فرشتوں سے بڑھ گیا اور اگر شہوت فاتح ہوگئی تو یہ بشر حیوانوں اور جانوروں سے بھی پست ہوگیا۔“

ایک ہی وجود میں عقل اور شہوت کا اجتماع:

انسان کے وجود مادہ اور معنی، جسم اور جان، عقل اور شہوت، غرض انسانیت اور حیوانیت آپس میں ملا دیے گئے ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک اپنی طبعی کشش اور فطری جذب کے تحت اپنی اپنی راہ پر چلنا چاہتا ہے، زندگی کے سرمایہ سے اپنے حق میں فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے اور ہر لحاظ سے اپنی کامیابی اور غلبے کے اسباب فراہم کرنا چاہتا ہے۔

عقل اور وجدان اخلاقی جو انسانیت کا نمونہ اور سربلندی اور تکامل ارتقاء کی بنیاد ہیں انسان کو پاکیزگی اور فضیلت کی راہوں پر چلانا چاہتے ہیں۔ ہر فرد بشر کو صحیح معنوں میں انسان بنانا چاہتے ہیں اور اُنہیں انسانیت کے شرف سے نوازنا چاہتے ہیں۔

انسان اور انتخاب کی آزادی:

خواہشات نفسانی اور ہوا وہوس جو حیوانیت کا خاصہ ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ انسانی عقل اور وجدان کو نیچا

دکھائیں۔نفسانی خواہشات اورغرائز کی راہ میں موجودرکاوٹیں دُورکردیں اورانسانی وجودکوحیوانی خواہشات اورآرزوؤں کاتختۂ مشق بنادیں، تاکہ انسان بھی جانوروں کی طرح اپنی خواہشات کی تکمیل میں آزادہو۔یہ انسان ہی تو ہے جوانسانیت یاحیوانیت کی راہ کاانتخاب کرنے میں آزاد ہے اوراسے یہ اختیارحاصل ہے کہ ان دونوں راستوں میں سے کسی ایک راہ کاانتخاب کرے۔ارشادباری ہے۔

اِنَّا هَدَیۡنٰهُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوۡرًا ﴿۳﴾

ہم نے انسان کوحق اورباطل کی راہ دکھادی ہے اب وہ آزاد ہے کہ نعمتِ خداکوقبول کرکے شکرگزابنے یا روگردانی کرکے اس گراں قدرنعمت کاانکارکرے۔'[۱]'

عقل سوئی ہوئی ہےاورخواہشات بیدارہیں:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پراس نکتے کی یاددہانی کرائی جائے کہ غرائزاورشہوات کی طاقتیں عقل اوراخلاقی وجدان کی طاقتوں سے کئی درجے زیادہ ہیں۔اسی لیے دینی پیشواؤں نے ان دونوں کے درمیان فرق بیان کرتے وقت یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ خواہشات نفسانی کے مقابلے میں عقل کی وہی حیثیت ہے جو بیدارانسان کے مقابلے میں سوئے ہوئے شخص کی ہوتی ہے۔چنانچہ حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"الھویٰ یقظان والعقل نائم"

''خواہشات نفسانی بیدارہیں اورعقل سوئی ہوئی ہے۔''[۲]

عقل قیدی ہےاورخواہشات حاکم:

البتہ یہ تشبیہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جوحدِ اعتدال پرقائم اورمعمول کے مطابق زندگی بسرکررہے ہیں۔لیکن جولوگ انسانیت کاتوازن کھوچکے ہیں۔اپنے غرائز کے آگے غیرمشروط طورپرجھک گئے اورخواہشات نفسانی اُن پرمسلط ہوگئی ہیں۔اُن کی عقلیں سونے کی سرحد سے گزرکرہوائے نفس کے ہاتھوں گرفتاراورخوہشات نفسانی کے ہاتھوں اسیرہیں۔جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

" کم من عقل اسیر عندھوی امیر"

---

[۱] سورہ ۷۶ آیت ۳

[۲] بحارجلد ۱۷ص ۱۸۱

''کس قدر ایسی عقلیں ہیں جو ہوائے نفس کے مقتدر ہاتھوں میں اسیر اور مغلوب ہو چکی ہیں۔''[1]

خدائی تعلیمات اور احیاء انسانیت:

ایک اہم نکتہ جو خود سازی اور انسانی کمال کے حصول کے لیے ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے وہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے کرۂ ارضی کے احیاء اور اسے آباد کرنے کی ذمہ داری انسان کے سپرد کر دی ہے اور قرآنی الفاظ ''واستعمر کم فیھا' کے بموجب انسان کو زمین کے آباد کرنے کا کہا ہے، لیکن انسان سازی کے بارے میں لوگوں کو حکم دیا ہے کہ احیاء انسانیت کے لیے خدا اور اُس کے رُسول کا حکم مانیں اور ان کے فرامین پر عمل پیرا ہوں۔ خدا فرماتا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ

''اے اہل ایمان خدا اور رسولؐ کی دعوت پر لبیک کہو، جب تمہیں ایسی چیز کی طرف بلائیں جو تمہیں زندہ کرتی ہے۔'[2]'

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا کرۂ ارضی کے احیاء اور اس کے ذخائر کو باہر نکالنے اور روئے زمین کے لوگوں کی احیاء انسانیت اور نہفتہ انسانی استعداد کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی فرق ہے کہ خدا نے زمین کی آبادی کاری تو براہ راست انسانوں کے ذمہ لگائی ہے لیکن انسان سازی اور احیاء انسانیت کے لیے خدا اور رسولؐ کی دعوت پر لبیک کہیں؟ اس سوال کا جواب مثبت ہے جیسا کہ ذیل میں تفصیل بیان کی جاتی ہے ان دونوں کے درمیان بنیادی اور عمیق فرق ہے۔

پہلے زمانے میں جسے زرعی دور کہا جاتا ہے زمین کی آبادکاری کا طریقہ یہ تھا کہ لوگ زمین کھود کھود کر زمین کے اندر موجود پانی کو باہر نکالتے تھے اور سطح زمین پر موجود دریائی پانی کے آگے بند باندھ کر اسے کنٹرول کرتے تھے تاکہ زمین کی اچھی طرح سے آبپاشی کر سکیں۔ زراعت اور باغبانی کی وسیع پیمانے پر ترویج کر سکیں اور پھر اس کے ساتھ ساتھ پرورش حیوانات کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ کسانوں کی رہائش کے لیے کھیتوں کے نزدیک دیہاتی مکان تعمیر کیے، کچی پکی سڑکیں اور راستے بنا کر دیہاتوں اور قصبوں کو شہروں کے ساتھ ملایا، تاکہ زرعی پیدوار کو آسانی کے ساتھ منڈیوں تک پہنچا سکیں۔ لین دین کا رواج ہوا اور اس طرح سے عامۃ الناس خواہ وہ شہری ہوں یا دیہاتی سب کے لیے ایک قسم کی سہولت پیدا ہوئی۔

---

[1] نہج البلاغہ کلمہ ۲۰۲

[2] سورہ ۸ آیہ ۲۴

صنعتی تمدن میں زمین کی آبادکاری:

موجودہ زمانے میں جسے مشینی دور کہا جاتا ہے زمین کی آبادکاری ایک وسیع مفہوم پیدا کر چکی ہے زراعت اور پرورش حیوانات کے ساتھ ساتھ مشینری بھی اس میں داخل ہوگئی ہے جس کی وجہ سے کرۂ ارضی پر ایک عظیم انقلاب برپا ہوگیا ہے ان آخری تین صدیون میں سائنسی ترقی کی وجہ سے انسان نے کائنات کے بہت سے پوشیدہ اسرار سے آگاہی حاصل کرلی ہے زیرزمین ذخائر تک رسائی حاصل کرلی ہے۔ بسیط اور مرکب کے خواص کو پہچان لیا ہے اور ایک صنعتی تمدن کی بُنیاد ڈال دی ہے۔ انسان نے غول پیکر بحری جہاز، عظیم ہوائی جہاز، ملیں اور موٹریں ایجاد کرکے، سمندروں، ہواؤں اور زمینوں کو مسخر کرلیا ہے جس سے کائنات کی صورتِ حال یکسر بدل گئی ہے بجلی ایجاد کرکے ساری دُنیا کو ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی گراف اور ٹیلی فون کے ذریعہ باہم مربوط کردیا ہے اور ساری دُنیا کے انسانون کے لیے تاریک راتوں کو روز روشن کی طرح منور کردیا ہے۔

انسان اور کرۂ زمین کی آبادکاری:

اگر خداوند عالم نے کرۂ زمین کے احیاء اور اس کی آبادکاری کا کام انسان کو سونپا ہے تو یہ اس کی لیاقت، صلاحیت اور شائستگی کی بنا پر ہے۔ کیونکہ کرۂ ارضی اپنی تمام موجودات سمیت ایسی چیزیں ہیں جو مادی اور قابلِ احساس ہیں اور عقلمند اور باہوش انسان اپنے علم و دانش کے اسلحہ اور تحقیق و ریسرچ کے ذریعہ ان محسوس مواد کو کسی حد تک پہچاننے میں کامیاب ہوگیا ہے اور معتدبہ حد تک ان کے آثار اور خواص سے آگاہ ہوگیا ہے اور اس قابل ہوگیا ہے کہ ان چیزوں کو انسانیت کی خدمت کے لیے پیش کرے اور کرہ ارضی میں تین صدیوں کے دوران اس حد تک حیرت انگیز تبدیلی اور آنکھوں کو خیرہ کردینے والی آبادی کو وجود میں لانے کے قابل ہوگیا ہے اور اگر آنے والی نسلیں بھی اسی طرز پر تحقیقی کام کرتی رہیں اور فطرت کے مخفی رازوں سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہیں تو یقیناً نت نئی کامیابیاں ان کے قدم چومیں گی۔ اور زمین کی آبادکاری کو اعلیٰ ترین مراحل تک جا پہنچائیں گی۔

انسان کی پہچان نہیں ہوسکی:

لیکن انسان سازی اور احیاء انسانیت کا مسئلہ زمین کے احیاء اور اس کی آبادکاری کے مسئلے سے جُدا ہے اور انسان صرف اپنی عقل و ہوش اور علم تجربہ کی وجہ سے اس اہم کام کو شائستگی کے ساتھ انجام نہیں دے سکتا۔ کیونکہ اس کام کی بنیادی شرط خود انسان کی پہچان ہے اور آج کے ترقی یافتہ دور میں زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی کے باوجود انسان خود کو نہیں پہچان سکا۔

اور نہ ہی اپنے وجود کی گہرائیوں سے آگاہ ہوسکا ہے۔ اگر انسان کی شناخت ہوسکتی تو دُنیا بھر کے کل اور آج کے دانشور، انسان کے بارے میں اس قدر نظریاتی بلکہ فکری اختلافات کا شکار نہ ہوتے۔ جو انسان خود کو نہیں پہچان سکتا انسانیت کو نہیں سمجھ سکتا اور اس سے مکمل طور پر آگاہی حاصل نہیں کرسکتا۔ وہ کیونکر خود کو انسان بنا سکتا ہے یا انسانی زندگی سے ہمکنار کرسکتا ہے؟

حیوانی پہلو کی کسی حد تک شناخت ہوچکی ہے:

البتہ انسان سازی کی بحث میں اس نکتہ پر بھی توجہ دینی چاہیے کہ انسان کے غیر معلوم اور پہچانے نہ جانے سے مراد اس کا بشری یا حیوانی پہلو نہیں ہے کیونکہ یہ پہلو حفظ وسلامتی اور جسمانی ونفسیاتی بیماریوں کے علاج کی غرض سے گذشتہ صدیوں سے لے کر آج تک ہمیشہ دانشواروں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اور اس بارے میں ہمیشہ اور نت نئی کامیابیاں بھی حاصل ہوتی آرہی ہیں۔ جس کی وجہ سے اب بھی بڑی حد تک بدن کی طبعی ساخت کی شناخت ہوچکی ہے اور اسی طرح گُردے اور جگر، دل اور رگوں، مغز اور اعصاب معدہ اور انتڑیوں کے علاوہ دوسرے اندرونی اور بیرونی اعضاء کے طریقہ کار اور طرزِ عمل کا پتہ چل چُکا ہے لیکن انسان کی جو چیز اب تک نہیں پہچانی جاسکی اور دانشوروں اور سکالروں کو اب تک جس چیز کے بارے میں اختلاف نظر رہا ہے وہ کچھ ایسے مسائل ہیں جو انسان کی ذات سے متعلق ہیں۔ مثلاً:

۱۔ آیا انسان سو فیصد مادی مخلوق ہے یا نہ بلکہ مادہ اور مادہ سے ماوراء کسی اور چیز سے مل کر بنا ہے؟

آیا فکر و اندیشہ مادی چیز ہے:

۲۔ آیا عقل وفکر، سوچ سمجھ اور سُوجھ بوجھ جو کہ انسان کی فصل ممیز اور اس کی بزرگی اور عظمت کا معیار ہے، صرف اور صرف ایک مادی امر ہے اور جس طرح کہ انسان کے فکر اور مغز کی نسبت وہی ہے جو صفراء کے ترشح کی نسبت جگر سے ہوتی ہے یا نہ بلکہ فکر کی بنیاد رُوح مجرد کے ساتھ مربوط ہے اور مغز ایک وسیلہ ہوتا ہے جو غیر مادی رُوح کو جہانِ مادہ سے مربوط کرنے کا کام دیتا ہے؟

۳۔ آیا اخلاقی وجدان ایک مستقل اور اصل طاقت ہے جو خالق کی حکیمانہ قضاء کی وجہ سے انسانی فطرت میں داخل ہے تاکہ اسے فضیلتوں اور ذالتوں کے اصول سے آگاہ کرے یا نہ! بلکہ اخلاقی وجدان چند نہی شدہ چیزوں کا مجموعہ ہے جو بچے کے والدین اور مربی بچپن ہی میں اس کے ذہن میں بٹھاتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ چیزیں اُس کے ذہن وضمیر میں بیٹھتی جاتی ہیں اور اس مجموعہ کا نام اخلاقی وجدان رکھ دیا جاتا ہے؟

۴۔ زندگی جاوید کی تمّنا جو طبعی طور پر ہر ایک انسان کے باطن میں موجود ہے آیا ایک لغو اور فضول تمنا ہے یا نہ! بلکہ

اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ انسان قضائے الٰہی سے جاوید اور پائیدار زندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور یہ فطری تمنا اس مخفی قضا پر دلالت کرتی ہے؟

انسان اور مرنے کے بعد کی زندگی:

۵۔آیا موت کے آجانے سے انسان کا سارا وجود ختم ہو جاتا ہے یا نہ! بلکہ موت صرف انسان کے مادی پہلو اور جسمانی زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے اور روح جو کہ معنوی پہلو اور انسان کی انسانی شخصیت کا معیار ہے، اسی طرح زندہ اور پائدار رہتی ہے اور صرف اس دُنیا سے دوسرے جہان کی طرف منتقل ہو جاتی ہے؟

یہ اور اس قسم کے کئی اور سوالات ہیں جو ہمیں اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ ہم انسان کو اچھی طرح نہیں پہچانتے اور اس کی حقیقت سے بخوبی واقف نہیں ہیں اسی لیے ہم اپنے آپ کو نہ تو انسان بنا سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی انسانیت کا احیاء کر سکتے ہیں۔

اسلام کے زیرِ سایہ خودسازی:

خودسازی اور انسانیت کے اعلیٰ مقاصد تک رسائی کے لیے ہمیں چاہیے کہ انسان کے خالق اور رب کی تعلیمات کو حاصل کریں جو اس کے معصوم انبیاء کے توسط سے ہمیں بتلائی گئی ہیں اور ان پر عملدرآمد کریں تاکہ بالفعل انسان بن جائیں اور یہی معنی ہے اس آیت کا کہ: ''خدا اور رُسولؐ کی دعوت پر لبیک کہو جب تمہیں اس چیز کی طرف بلائیں جو تمہیں زندہ کرتی ہے اور تمہیں انسانی زندگی عطا کرتی ہے۔''

انبیاء کرام کی ماموریت:

انبیاء کرام جو گذشتہ صدیوں میں حق تعالیٰ کی طرف بھیجے گئے تھے اور اپنے زمانے کے لوگوں کو دعوت دیتے تھے اس بات پر مامور تھے کہ اُنہیں انسان بنائیں۔ ان کی فطرت میں موجود اعلیٰ انسانی استعداد کو ''قوت'' سے ''فعلیت'' تک پہنچائیں۔ اُنہیں مکارم اخلاق کی تعلیم دیں، اُن کے ضمیر میں موجود ہوائے نفسانی کو ایمانی طاقت سے کنٹرول کریں، اُن کے غرائز اور شہوات کو حدِ اعتدال پر لائیں اور حیوانی خواہشات میں زیادہ روی جو انسانی اقدار کے منافی ہے کہ دُور کریں۔

افسوس کہ ہر دور میں صرف لوگوں کی ایک محدود جماعت نے انبیاء کی دعوت کو قبول کیا، ان پر ایمان کا اظہار کیا اور انسانیت کی راہ پر گامزن ہوئی۔ بہت سے لوگوں نے انبیاء کی باتوں پر توجہ نہیں دی، اس طرح حیوان رہے۔ حیوانوں جیسی زندگی گزارتے رہے عمر بھر انسانی ہوا و ہوس کے قیدی اور شہوت و خواہشات نفسانی کے محکوم رہے، آخر کار حیوان بن

کر اس دُنیا سے رخصت ہوئے۔

جنگل کا قانون اور ڈنڈے کی حکومت:

اب بھی موجود متمدن دور میں تمام علمی اور صنعتی ترقی کے باوجود اکثر لوگ سعادت عطا کرنے والی صحیح معنوں میں انسانی زندگی سے محروم اور بے بہرہ ہیں اور جانوروں کی سی زندگی کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو انسان کے لائق اور انسانیت کے شایانِ شان ہے۔ یہاں پر بطور نمونہ انسانی اور حیوانی زندگی کے درمیان صرف ایک فرق کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں۔

حیوانی زندگی اور جنگل کے ماحول میں دھونس اور طاقت کی حکومت ہوتی ہے۔ درندوں کے درمیان چیر نے پھاڑنے والے پنجے اور کاٹنے والے دانت جھگڑوں کا فیصلہ کرتے ہیں۔ لیکن مقدس انسانی ماحول میں عقل اور وجدانِ کو حکومت کرنی چاہیے اور عدل و قانون کو لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا چاہیے۔ مگر افسوس کہ آج بڑی حکومتوں میں انسانی طرزِ فکر کو مکمل طور پر بھُلا دیا گیا ہے گویا انسان بن کر جینا دُنیا میں ناممکن ہو چکا ہے اور عالمی سطح پر عدل و قانون کی حُکمرانی ناقابلِ عمل ہو چکی ہے۔ اسی لیے بڑی طاقتیں (سپر پاورز) عالمی سلامتی کی حفاظت کے لیے ایمان پر بھروسہ اور عقل و وجدان اور حق وانصاف اور انسانی فضیلت و شرافت سے کام لینے کی بجائے اسلحہ کی دوڑ کا سہارا لینے لگی ہیں اور ان کی حتی الامکان یہی کوشش ہوتی ہے کہ خود کو زیادہ سے زیادہ مہلک اسلحہ سے مسلح اور تباہ کن بموں سے لیس کریں تاکہ دُشمن حکومتوں کو جلد سے جلد تر تباہ و برباد اور لوگوں کو نیست و نابود کر ڈالیں۔ اور مزے کی بات ہے کہ وہ اپنے اس تباہ کُن اقدام پر فخر کرتی ہیں اور اپنے لیے فوقیت اور برتری کا معیار سمجھتی ہیں۔

صنعتی دور میں اخلاقی پستی:

اس صنعتی دور میں اخلاقی پستی اور انسان دُشمنی کی روش نے انسان کو اس حد تک پستی کی طرف دھکیل دیا ہے کہ سُپر طاقتیں درندوں کی مانند ایک دوسرے کے مقابلے میں آ چکی ہیں اور پنجوں اور دانتوں کی بجائے ایک دوسرے کو تباہ و برباد کرنے کے لیے بین البراعظمی اور ایٹمی میزائلوں کی دھمکی دے رہی ہیں۔

موجودہ دور میں اسلحہ کی دوڑ:

''۱۳۵۰ ارب ڈالر سالانہ اسلحہ پر خرچ ہوتے ہیں۔''

''پیرس (A-F-P) حکومت فرانس کا ریکارڈ رکھنے والے مرکز نے ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں دُنیا بھر

میں اسلحہ کی خطرناک دوڑ سے آگاہ کیا گیا ہے۔ یہ رپورٹ جو اسلحہ کی روک تھام کے متعلق اقوام متحدہ کے خصوصی اجلاس سے چند دن پہلے شائع کی گئی ہے۔ یہ اجلاس اس ماہ کی ۲۳ تاریخ کو نیویارک میں بُلایا گیا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ہر سال ۳۵۰ ارب ڈالر اسلحہ کی خریداری پر خرچ کیے جاتے ہیں، جن میں سے ۷۵ فیصد کا تعلق چھ بڑے مُلکوں امریکہ، رُوس، چین، فرانس، برطانیہ اور وفاقی جمہوریہ جرمنی سے ہے۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ترقی پذیر مُلکوں کو ۱۹۷۰ء میں بیچے جانے والے اسلحہ کی قیمت ۲۔ ارب نوے کروڑ ڈالر تھی جبکہ ۱۹۷۶ میں یہ مقدار لے لے ارب ۳۰ کروڑ ڈالر تک جا پہنچی ہے۔ ادھر دُنیا بھر میں تقریباً ۶ کروڑ انسان اسلحہ سازی کے کام میں مصروف ہیں۔ رپورٹ میں جدید ساخت کے اسلحہ کی تکنیکی ترقی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ امریکہ نے ۹ ہزار بین البراعظمی ایٹمی میزائلوں کو اپنے اسٹریجیٹک ہوائی جہازوں پر سوار کر رکھا ہے۔ اور اسی قسم کے تین ہزار رُوس نے بھی تیار کر رکھے ہیں۔ اگر ترقی کی یہی صورتِ حال رہی تو دُور مار ایٹمی مزائلوں کی تعداد ۱۹۸۵ء تک بالترتیب ۸۵۰۰ اور ۹۵۰۰ تک پہنچ جائے گی جو بنیادی طور پر ان مُلکوں کی فوجی ضروریات سے کئی گُنا زیادہ ہوگی۔ [1]

انسانیت کی راہ میں تگ ودو:

اگرچہ آج کے دور میں بہت سے لوگ انسانیت کی راہوں کو عملی طور پر ترک کر چکے ہیں، نفسانی خواہشات اور حیوانی رجحانات کو اپنا چکے ہیں اور گمراہی کی راہوں پر عملاً گامزن ہیں، لیکن اکثریت کا یہ طریقہ کار اقلیت کی ذمہ داریوں کو ختم نہیں کر سکتا۔ خدا کی بارگاہ میں ان کے حقوق وفرائض کا خاتمہ نہیں کر سکتا، اقلیت پر مشتمل افراد کا فرض ہے کہ انسانی درجات تک پہنچنے کی راہوں کی تلاش کریں۔ عمر کے گراں قیمت سرمایہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خودسازی کریں۔ مکارم اخلاق اور انسانی صفات سے متصف ہوں، اپنی ابدی سعادت کے اسباب فراہم کریں اور یہ بات ہمیشہ کے لیے ذہن نشین کر لیں کہ گمراہ لوگوں کی گمراہی اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور نہ اُن کی فلاح وسعادت کے لیے سدِ راہ ہو سکتی ہے۔ ارشاد باری ہے

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٥﴾

”اے ایماندارو! اپنی خبر لو اور خود کو خدا کی نافرمانی اور احکامِ الٰہی کی سرپیچی سے بچاؤ اور جان لو کہ اگر تم ہدایت پا گئے تو دوسروں کی گمراہی تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گی، تم سب کو باری تعالیٰ کی طرف لوٹ

---

[1] روزنامہ اطلاعات شمارہ ۱۵۶۱۴

جاتا ہے اور وہی خدا تمہیں تمہارے ان اعمال سے آگاہ کرے گا جو تم انجام دیتے ہو۔[1]'

عقل کی راہنمائی سے استفادہ کرو:

جو شخص خود کو انسان بنانا چاہتا ہے اور انسانی صفات سے متصف ہونا چاہتا ہے اُسے چاہیے کہ وہ اپنے اندرونی سرمائے یعنی عقل سے استفادہ کرے۔ اسے اپنا رہبر و راہنما مانے، اس کے اوامر پر عملدرآمد کرے اور نواہی سے باز رہے اور یہ بذاتِ خود ایسا پروگرام ہے جس کا تذکرہ اسلامی مآخذ میں بھی موجود ہے اور ہادیانِ برحق نے بھی اپنے پیروکاروں کو اس پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کی ہے۔ اسلام کے عظیم الشان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

"استرشدوا العقل ترشدوا ولا تعصوه فتندموا"

"عقل سے راہنمائی اور ہدایت حاصل کرو، سیدھی راہ پر گامزن رہو گے۔ مبادا اس کی ہدایت سے سرپیچی کرو کہ پشیمان ہو گے۔"[2]

غلط اور صحیح رستے کی پہچان:

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"كفاك من عقلك ما اوضح لك سبل غيك من رشلك۔"

"تمہاری عقل سے یہ بات کوئی کم نہیں ہے کہ تم پر گمراہی کے راستوں سے ہدایت کی راہیں روشن کرتی ہے۔"[3]

عقل کی پیروی خود آگاہی اور معرفت نفس کا سبب بنتی ہے، خود آگاہی انسان کو حقیقی سوجھ بوجھ عطا کرتی ہے، ہر شخص اپنے آپ کو تخلیقی تناظر میں دیکھتا اور اپنی تمام اندرونی اور بیرونی، مادی اور معنوی، حیوانی اور انسانی جہات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

---

[1] سورہ ۵ آیت ۱۰۵

[2] مستدرک جلد ۲ ص ۲۸۶

[3] نہج البلاغہ کلمہ ۴۲۱

عقل کی اتباع کا نتیجہ:

عقل کی اتباع انسان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنی تمام وجودی حیثیتوں کو پیش نظر رکھتا ہے ہر ایک حیثیت کو فعالیت کی راہوں پر ڈالتا اور اسے اس کے شایانِ کمال تک پہنچاتا ہے اور یہی چیز بذات خود انسان بننے اور انسان بن کر رہنے کا ایک معنی ہے۔

جو لوگ معرفتِ نفس کی راہ میں عقل کی اطاعت کرتے ہیں، اپنی شناخت کے لیے فکری طاقت سے کام لیتے ہیں تو وہ اپنے اس گران قیمت سرمایہ سے آگاہ ہوجاتے ہیں جو اُن کے وجود کی گہرائیوں میں چھُپا ہوا ہے اور جو غیر محدود استعداد خداوند عالم نے اُنہیں عطا فرمائی ہے اس سے باخبر ہوجاتے ہیں۔ انسانی تخلیق کی عظمت کے بارے میں حیران ہوجاتے ہیں اور اپنے آپ کو بیسیوں اور سینکڑوں تعجّب اور استفہام کی علامتوں کے مقابل پاتے ہیں اور اپنی اندرونی حیرت کے اظہار کے لیے اس بیدار عارف کے یہ اشعار گنگناتے ہیں:

روز ہا فکر من انیست وھمہ شب سخنم
کہ چراغا فل ازاخوال دل خویشتنم
زکجا آمدہ ام ، آمد نم بہرچہ بود
بہ کجامی روم آخر، ننمائی وطنم
ماندہ ام سخت عجب کرچہ سبب ساخت مرا
یاچہ بودہ است مرادوی ازین ساختنم
مرغ باغ ملکوتم نیم از عالم خاک
دوسہ روزی فقسی ساختہ اندر بدنم
تابہ تحقیق مرامنزل ورہ ننمائی
یکدم آرام نگیرم نفسی دم نزنم
من بہ خود نامدم اینجا کہ بہ خود بازروم
آنکہ آورد وہ مرا باز بردور وطنم

یعنی ہر روز میری سوچ اور شب میری گفتگو یہی ہے کہ آخر میں اپنے دل کے حالات سے کیوں غافل

ہوں؟ میں کہاں سے آیا ہوں اور میرے آنے کا مقصد کیا ہے؟ آخر میں کہاں جاؤں گا؟ تو نے تو مجھے میرا وطن دکھلایا ہی نہیں! میں سخت تعجب میں ہوں کہ اس خالق نے مجھے کیوں پیدا کیا ہے؟ یا مجھے میری اس تخلیق کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو ملکوتی باغ کا طائر ہوں اس عالمِ خاکی سے میں نہیں، یہ تو صرف دو تین دن تک کے لیے عارضی طور پر مجھے میرے قفسِ عنصر میں ڈال دیا گیا ہے۔ جب تک تو مجھے میری منزل نہیں دکھائے گا اور میری راہنمائی نہیں کرے گا اس وقت تک نہ تو میں آرام کروں گا اور نہ ہی سُکھ کا سانس لوں گا۔ میں یہاں پر اپنی خوشی اور اپنی مرضی کے ساتھ نہیں آیا اور نہ ہی اپنی خوشی اور مرضی کے ساتھ واپس جاؤں گا۔ جو مجھے یہاں لایا ہے وہی مجھے میرے اصلی وطن کی طرف لوٹائے گا۔

حقیقی انسان کا معیار:

یہ سعادت مند گروہ اپنی آفرینش میں تفکر اور تدبر کی بنا پر انسان کو تمام وجودی جہات کے تناظر میں دیکھتا اور اسلام کی آسمانی تعلیمات کی روشنی میں اپنی مادی اور معنوی شان کو یکساں توجہ کا مرکز قرار دیتا ہے۔ ایک طرف تو اپنی جسمانی ضروریات کو پُورا کرنے اور مادی زندگی کو بسر کرنے کے لیے تگ ودو سے کام لیتا ہے اور دوسری طرف اخروی زندگی اور رُوح کی سربلندی کے لیے ریاضت سے کام لیتا ہے، لیکن معنوی ارتقاء کو جو کہ انسانیت کا حقیقی معیار ہے مادی اور حیوانی پہلو سے زیادہ اہم سمجھتا ہے، اسی لیے بسا اوقات دنیاوی چیزوں کی کمی اور قلت کو تو برداشت کر لیتا ہے لیکن معنوی کمزوریوں اور قلت کو گوارا نہیں کرتا۔

امام کی نظر میں عقلمند انسان:

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہشام سے فرماتے ہیں:

"یاهشام ان العاقل رضی بالدون من الدنیا مع الحکمة ولم یرض بالدون من الحکمة مع الدنیا، فلذلك ربحت تجارتهم۔"

"یعنی اے ہشام! عقلمند انسان معنوی کمال اور علم وحکمت کے حصول کے ساتھ دنیاوی زندگی کی ہر قسم کی کمی کو قبول کر لیتا ہے، لیکن علم ومعنویت کی کمی کے ساتھ دُنیا کی خوشحال زندگی پر راضی نہیں ہوتا۔ اسی

لیے عقلمند اور خود آگاہ افراد دنیاوی بازار میں اپنی انسانی تجارت کے سلسلے میں نفع کماتے ہیں۔"[1]

آج کے صنعتی تمدن نے جو راستہ اختیار کر لیا ہے اور دُنیا کے اکثر و بیشتر لوگ قولی اور فعلی لحاظ سے اس پر گامزن ہیں عقل مند انسانوں کی اس حکیمانہ روش کے بالکل برعکس ہیں جس کی نشاندہی حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ہشام سے کی ہے۔

صنعتی تمدن میں اکثریت کا طریقہ کار:

آج کا انسان زمین کی آبادکاری کے لیے عقل و ہوش سے کام لے کر اور اپنی جدّت و خلاقیت سے فائدہ اُٹھا کر کافی ترقی کر چکا ہے۔ اور مادی زندگی کی فلاح و بہبود اور حیوانی شہوات و غرائز کی زیادہ سے زیادہ تکمیل کے لیے کافی سے زیادہ کوشش کام میں لا چکا ہے اور مجموعی طور پر اس بارے میں اسے زبردست کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے، لیکن انسانی شناخت اور احیاء انسانیت کے سلسلے میں اس نے سوچا تک نہیں، اور انسان سازی اور مکارم اخلاق کی پرورش کی طرف اُس نے توجہ تک نہیں کی، اسی لیے اُس نے جس قدر دُنیاوی زندگی کی آسائش اور رفاہ اور جسمانی لذتوں کی فراوانی کے بارے میں ترقی کی ہے اسی نسبت سے معنوی اور روحانی لحاظ سے انحطاط اور پستی کی طرف چلا گیا ہے، اور انسانی زندگی طاق نسیان میں رکھ دی گئی ہے۔

باالفاظ دیگر آج کے دور میں انسانیت کی آدھی ساخت یعنی اس کے مادی اور حیوانی حصّے پر تو حد سے زیادہ دی جا رہی ہے لیکن اس کے دوسرے حصّے یعنی معنوی اور انسانی پہلو کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

غلط سوچ اور باطل تصّور:

صنعتی تمدن میں علم و دانش نے بہت جلد ترقی کی ہے، مغربی ممالک میں جہالت کی بیخ کنی کی جا چکی ہے، دیہاتوں اور قصبوں تک کے لوگ مدرسہ اور اُستاد کی نعمت سے بہرہ مند ہو چکے ہیں۔ اکثر چھوٹے اور بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں قائم کی جا چکی ہیں جوانوں کی بہت بڑی تعداد اعلیٰ تعلیمات حاصل کرنے میں مصروف ہے۔

یورپ اور امریکہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو یہ تصّور کرتے تھے کہ علم و دانش کی ترقی سے دُنیا بھر کے لوگ دین اور ایمان سے بے نیاز ہو جائیں گے، سائنسی کتابیں، دینی کتابوں کی جگہ لے لیں گی، کالج اور یونیورسٹیاں مساجد اور کلیسا کا کام دیں گی، اساتذہ اور پروفیسرز کلاسوں میں دینی علماء کا پارٹ ادا کریں گے۔ اُن کی دلیل یہ تھی کہ گناہ اور اخلاقی بے راہروی

---

[1] تحف العقول العقول ص ۳۸۷

جہالت اور لاعلمی کی پیداوار ہیں لہٰذا جب لوگ درس پڑھیں گے اور علم حاصل کرلیں گے تو آگاہ اور باخبر ہوجائیں گے اور باخبر اور آگاہ انسان گناہ کے نزدیک نہیں جاتا اور اپنے دامن کو گناہ و معصیت کی نجاست سے آلودہ نہیں کرتا، لیکن اُنہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ سائنس کا علم پڑھنے اور گناہ سے بچنے کا آپس میں کوئی تک نہیں۔ اخلاقی بے راہروی، ہوائے نفس اور سرکشی غرائز کی پیداوار ہے، لہٰذا فزکس یا کیمسٹری یا کوئی اور سائنسی علم خواہشات نفسانی کو مسخّر اور سرکش غرائز کو کنٹرول نہیں کرسکتا۔ یہ صرف ایمانی طاقت ہی ہے جو اس قدر اہم اور پیچیدہ کام کو انجام دے سکتی ہے، خواہشات نفسانی اور غرائز حیوانی پر حکم فرما ہوسکتی ہے اور انسان کو گناہ و معصیت سے بچا سکتی ہے۔

ایمان اور علم کا تقابل:

علم کی طاقت سے ہم طبعی ذخائر پر تسلط حاصل کرسکتے ہیں اور ایمان کی قوت سے خواہشات نفسانی پر مسلط ہوسکتے ہیں۔ علمی طاقت سے انسانی خواہشات کی تکمیل کرسکتے ہیں۔ ایمانی قوت سے اعلیٰ انسانی رجحانات کو قانع کرسکتے ہیں۔ علمی طاقت سے انسانی خواہشات کی تکمیل کرسکتے ہیں۔ ایمانی قوّت سے اعلیٰ انسانی رجحانات کو قانع کرسکتے ہیں۔ علمی طاقت، مادی زندگی کو فلاح و بہبود عطا کرتی ہے اور ایمانی طاقت ہمیں معنوی سربلندی عطا کرتی ہے۔ سائنس کا علم دنیاوی ضروریات کو پُورا کرتا ہے جبکہ خدا پر ایمان انسان کی رُوحانی ضرورتوں کی تکمیل کرتا ہے۔

بدقسمتی سے صنعتی تمدن میں جسم اور جان، اور مادہ و معنی کا توازن بگڑ چُکا ہے۔ اور اس غیر متوازن طریقہ کار اور خلافِ فطرت انداز نے دُنیا بھر میں اخلاقی بے راہروی کو فروغ دیا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جُرم و گناہ کو روز افزوں ترقی ملی ہے، چنانچہ جو لوگ دنیاوی بازار میں اپنی زندگی کے سرمایہ کو ایسے کاروبار میں لگاتے ہیں جہاں اُنہیں نقصان اور خسارے کے سوا اور کچھ نہیں مل پائے گا۔

ساری گفتگو کا خلاصہ:

اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ نکلا کہ انسان کا حیوانی زندگی بسر کرنا اس کی انسانی زندگی بسر کرنے سے مختلف ہے، یعنی حیوانی زندگی اور ہوتی ہے اور انسانی زندگی اور ہوتی ہے۔ حیوانی زندگی کھانے پینے، نیند و آرام، علاج معالجہ اور دوسری طبعی چیزوں سے بسر کی جاسکتی ہے لیکن انسانی زندگی صرف اور صرف خود آگاہی کی بُنیادوں پر استوار ہمیں خود آگاہی کی نعمت سے بہرمند ہونے کے لیے باطنی حجت خدا یعنی عقل کا سہارا لینا ہوگا۔ اپنی ذات کا معنوی اور رُوحانی جہات سے جائزہ لینا ہوگا، اور پھر جو امانتیں خدا نے ہمارے باطن میں ودیعت فرمائی ہیں اُن کی طرف توجہ کرنا ہوگی۔ اس کے بعد خدا کی ظاہری حجّت یعنی

خدا کے رُسولؐ کی امداد سے انسان سازی کی راہوں پر گامزن ہونا پڑے گا، خدائی تعلیمات کو اپنانا ہوگا اور ان تعلیمات کی روشنی میں اپنے آپ کو انسانی حیات سے زندہ کرنا ہوگا پھر کہیں انسانیت کے شایانِ شان کمالات تک رسائی ہوگی۔

بنابریں جو لوگ معرفت نفس کی راہوں میں اپنی عقل کو کام میں لائے اور خود آگاہ ہو گئے وہ انسانی حیات کے ساتھ زندہ ہیں خواہ کچھ پڑھیں یا نہ پڑھیں، لیکن جن لوگوں نے خود آ گاہی کے لیے عقل سے کام نہیں لیا اور نہ ہی وہ اپنی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں، خواہ وہ یونیورسٹیوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں بھی حاصل کر چکے ہوں وہ حیوانی زندگی بسر کر رہے ہیں اور حیات انسانی سے ان کا کوئی بھی حصّہ نہیں ہے، چنانچہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں:

"من استحکمت لی فیه خصلة من خصال الخیر احتملة علیها، واغتفرت فقدما سواها، ولا اغتفر فقد عقل ولادین، لان مفارقة الدین مفارقة الامن، فلا تیهنأ بحیاة مع مخافة وفقد العقل فقد الحیاة ولایقاس الابالاموات۔"

"جو شخص میرے مکتب کی پیروی کرتے ہوئے اپنے اندر صفات حمیدہ میں سے کسی صفت کو ثابت اور برقرار رکھتا ہے میں اُسے ایک ہی صفت کے ساتھ قبول کرلوں گا اور دوسری سے چشم پوشی کرلوں گا، لیکن عقل اور دین ایسی صفات کی عدم موجودگی میرے لیے قطعاً ناقابلِ برداشت ہے، کیونکہ دین سے جدا ہوجانے کی وجہ سے امن وامان تہہ وبالا ہوجاتا ہے اور جن کی زندگی میں خوف وہراس پایا جائے وہ قابلِ قبول نہیں۔ اور عقل کی جدائی سے حیات انسانی کا خاتمہ ہے۔ اور جس شخص میں سوچ وبچار اور عقل وفکر کا مادہ نہیں ہے وہ مُردوں کے سوا کسی اور کے ساتھ قابلِ قیاس نہیں ہے۔"[1]

---

[1] کافی جلد اوّل ص ۲۷

مجلس نمبر 7

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"ثُمَّ اَمَاتَه فَاَقۡبَرَه ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنۡشَرَه"۔ (قرآن کریم)

مُردوں کو دفن کرنا:

مُردوں کو مٹی میں دفن کرنا تاریخ انسانیت کی پُرانی رسم ہے اور دُنیا کے ہر گوشے میں موجود ہے حتیٰ کہ وحشی اقوام کے قدیمی اور پُرانے قبرستان اس حقیقت کے شاید ہیں کہ مختلف اقوام میں یہ طریقہ کار رائج تھا اور ہر قوم اپنے مخصوص آداب کے تحت اپنے مُردوں کو زمین میں دفن کیا کرتی تھی۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے آغاز میں آدم کے ایک بیٹے نے اپنے بھائی کو قتل کرڈالا اور چونکہ اولادِ آدم کا یہ پہلا بے جان جسد تھا لہٰذا قاتل کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ اسے کیا کرے؟ خداوندِ عالم نے ایک کوّا بھیجا جس نے اپنی چونچ سے زمین کو کھودا اور اسے بتایا کہ وہ کس طرح زمین میں قبر بنائے اور اپنے بھائی کا جسد خاکی اس میں دفن کرے، فرزند آدم نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اپنے آپ سے کہا:

يٰوَيۡلَتٰٓى اَعَجَزۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِثۡلَ هٰذَا الۡغُرَابِ فَاُوَارِىَ سَوۡءَةَ اَخِىۡ ۚ فَاَصۡبَحَ مِنَ النّٰدِمِيۡنَ ۛۚ ﴿۳۱﴾

"افسوس ہے مجھ پر کہ اس کوّے کی مانند بھی نہ ہوسکا اور اپنے مقتول بھائی کے جسد کو نہ چھپا سکا جو میرے لیے ننگ و عار کا باعث ہے۔ اور وہ اپنے کیے پر پشیمان ہوا۔"[1]

کوّے نے دفن کی عملی تعلیم دی:

اگرچہ آدمؑ کے بیٹے نے اپنے بھائی کے جسم کی تدفین کا عمل کوّے سے سیکھا، لیکن اس مقام اور موقع پر کوّے کا آنا کوئی اتفاقی بات نہیں تھی، بلکہ جس طرح آیت کی ابتداء میں صراحت کی گئی ہے کہ اُسے خدا نے بھیجا تھا، تاکہ وہ عملی طور پر آدمؑ کے بیٹے کو اس کے بھائی کی لاش دفن کرنے کا عمل تعلیم دے۔ اور اُسے اس بات سے آگاہ کرے۔

---

[1] سورہ ۵ آیت ۳۱

مُردوں کا جلانا:

قدیم زمانے سے ایسے لوگ بھی موجود چلے آ رہے ہیں جو اپنے مُردوں کو جلا دیا کرتے ہیں یا خود وصیّت کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد اُن کے جسم کو جلا دیا جائے۔ اور اب بھی ہندوستان میں اور کہیں کہیں دُنیا کے دوسرے خطّوں میں کم وبیش یہ کام انجام پا رہا ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ طبی لحاظ سے مردوں کا جلانا اُن کے دفن کرنے سے بہتر ہے، لیکن وہ اس نُکتہ سے بے خبر ہیں کہ میت کے بدن کو جلا دینے کا معنی یہ ہے کہ انسانی بدن کے کچھ حیاتی مواد اور تعمیری عناصر کو فنا کر دینا ہے۔ اگر یہی کام پوری دُنیا میں انجام دیا جاتا اور مشرق اور مغرب کے رہنے والے سب اپنے مردوں کو جلا دیا کرتے، تو طبعی ذخائر کو نقصان پہنچتا جس کی تلافی ناممکن ہوتی۔

موسم خزاں میں، روئے زمین کے جنگلوں میں موجود درختوں کے زرد پتے زمین پر جھڑتے ہیں آہستہ آہستہ اُن کو جذب کرتے ہیں جس سے اُن کے پھل اور پتے بنتے ہیں، چنانچہ اگر ہر سال ان جھڑنے والے پتّوں کو جلا دیا جائے اور اُن کے تمام مواد کو نذرِ آتش کر دیا جائے تو رفتہ رفتہ سارا جنگل لازمی مواد کی قلت کا شکار ہو جائے جس کے نتیجے میں درخت پژمُردہ اور کمزور ہو جائیں گے اور زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ وہ جنگل غذائی قلت کا شکار ہو کر ختم ہو جائے گا۔

مجُوسی اور اُن کے مُردے:

مجوسی لوگ اپنے مُردوں کے لیے ''دخمے'' بنایا کرتے تھے، ان میں سے کچھ دخمے تو تہہ خانوں کی صُورت میں زیرِ زمین ہوا کرتے اور کچھ چھت والے کمروں کی صُورت میں زمین کے اُوپر ہوتے اور کچھ محصور قلعوں کی مانند چھت کے بغیر زمین پر یا بلند ٹیلوں پر ہوا کرتے تھے۔ ان دخموں میں وہ بینچیں BENCHS بنا دیتے تھے جن پر مُردوں کو بٹھا دیا کرتے تھے چھت والے دخموں میں تو ان مردہ جسموں کی وہ کچھ عرصے تک حفاظت کیا کرتے تھے، لیکن بغیر چھت کے دخموں میں موجود لاشوں کو اکثر و بیشتر چلیں، کوّے اور گدھیں نوچ نوچ کر چٹ کر جاتے۔ اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان دخموں میں آگ جلا کر مُردوں کو نذرِ آتش کر دیتے۔

مُردوں کو نذرِ آتش کرنا:

''دخمے'' وہ تہہ خانے ہیں جن میں کفار عجم اپنے مُردوں کو رکھا کرتے تھے''(غیاث)''''دخمہ'' کا لفظ ادستا ZOROASTERS HOLY BOOK میں دخم اور پہلوی زبان میں دخمک آیا ہے جس کا معنی ہے داغنے کی جگہ، یعنی جہاں پر مُردوں کو جلاتے ہیں، کیونکہ اس لفظ کو بُنیاد ''دگ'' ہے جس کا معنی ہے جلانا۔ اور ''داغ'' کا لفظ بھی اسی سے

نکلا ہے۔ یقیناً پرانے زمانے میں ایرانی بھی اس عادت میں ہندوؤں کے شریک تھے، اور خود اوستا سے بھی یہی بات سمجھی جاتی ہے کہ قدیم زمانے میں ایرانی لوگ مُردوں کی لاشوں کو جلادیا کرتے تھے، چنانچہ مشہور شاعر فردوسی بھی اسی قدیم عادت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

همی هر کس آتشی برافروخت
یکی خسته بست و یکی کشته سوخت

ھخامنشی ACHAEMENID بادشاہوں مثلاً داریوش اوّل وغیرہ کے دخمے "نقش رستم" میں مقبروں کے اندر ہیں۔ پہاڑ کی کمر پر اور دہلیز اور چھوٹے سے کمروں پر مشتمل ہیں۔ اور اس قسم کے دخمے ایران میں بہت سے ہیں۔" جیسا کہ "نقشِ رستم" اور "پارسا گاڈ" میں ان کی یادگاریں اب بھی موجود ہیں۔"[1]

انبیاء اور مُردوں کی تدفین:

خالق حکیم کی مرضی اور نظام آفرینش کی مصلحت اسی میں ہے کہ مردہ جسموں کو خاک میں دفن کیا جائے، اور انسانی جسم کے تعمیری عناصر دوبارہ طبعی ذخائر کی طرف لوٹ جائیں، اسی لیے تاریخ انسانیت میں خدا کے تمام نبیوں نے مُردوں کے صرف دفن کرنے کی بات کی ہے اور ان میں سے کسی ایک نے بھی نہ تو اُنہیں جلانے کی دعوت دی ہے اور نہ ہی کھُلی یا بند فضا میں یُونہی رکھ دینے کو کہا ہے کہ انہیں درندے یا پرندے نوچ نوچ کر کھا جائیں۔

مجوسی اور زمانہ جاہلیت کے عرب:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"العرب فی الجاهلیة کانت اقرب الی الذین الحنیفی من المجوس...الی ان قال ...وکانت المجوس ترمی الموتی فی الصحاری والنواویس والعرب تواریها فی قبورها وتلحدلها وکذالك علی سُنة الرُسل۔"

"یعنی زمانہ جاہلیت کے عرب کچھ امور میں خدا کے دینِ حنیف کے مجوسیوں سے زیادہ نزدیک تھے جن میں سے ایک یہ بات بھی تھی کہ مجوسی اپنے مُردوں کو یا تو کھُلی فضا میں ڈال دیتے یا پھر دخموں میں

---

[1] لغت نامہ دھخدا ص ۲۸۹ (لفظ دخمہ)

چھپا دیتے، لیکن عرب اپنے مُردوں کو قبروں میں دفن کیا کرتے تھے اور اُن کے لیے لحد تیار کیا کرتے تھے۔ خدا کی جو سُنت انبیاءؑ پر نازل ہوئی وہ بھی اسی طرح تھی۔"[1]

اللہ کی رضا بھی مُردوں کو دفن کرنے میں ہے:

"قرآن پاک نے بھی میت کی تدفین کو ان اُمور کے ساتھ ذکر کیا ہے جو باری تعالیٰ کی مشیت کے مطابق جامۂ عمل پہنتے ہیں اور اسی سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خدا کی رضا بھی مردہ جسموں کے دفن کرنے میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ ۭ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾
ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَاۗءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾

"انسان کا ستیاناس ہو، وہ کِس قدر ناشُکرا ہے اور کِس چیز نے اُسے کفروانحراف کی راہ پر لا کھڑا کیا ہے؟ وہ اپنی تخلیق کے ابتدائی مواد پر غور نہیں کرتا تا کہ اسے اپنے خالق کی عظمت کا پتہ چلے؟ خدا نے اسے ایک ناچیز نطفہ سے خلق فرمایا۔ اپنے حکیمانہ ارادے کے ساتھ اس کے تمام اعضا و اجزاء کو اندازے کے مطابق بنایا، پھر رحم مادر سے اس کے باہر آنے کے راستے کو آسان بنایا۔ اس کے بعد اس سے یہ زندگی واپس لے لے گی، اور اسے ایک دفن شدہ چیز بنا دے گا۔ اور جس دن چاہے گا اسے دوبارہ زندگی عطا کرے گا اور قبر سے باہر نکالے گا۔"[2]

طلا اور جواہرات سے مُردوں کی زینت:

جو نُکتہ قابل توجّہ ہے وہ یہ ہے کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بعض لوگوں نے مُردوں کی تدفین کے بارے میں غلط قدم اُٹھانے شروع کر دیے، اور شہرت، خودنمائی، فوقیت طلبی، برتری حاصل کرنے اور دوسروں پر رقابت کی غرض سے اپنے مُردوں کو فاخرہ اور قیمتی لباس کے ساتھ دفن کیا کرتے تھے کچھ لوگ تو قیمتی لباس کے علاوہ انگوٹھی اور نگینے کی صورت میں طلا اور جواہرات بھی مردوں کے ساتھ دفن کیا کرتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اپنے مُردوں کے ساتھ طلائی اور جواہری بازوبند باندھ دیا کرتے تھے یا سونے اور جواہرات سے مرصّع ہاران کے گلے میں ڈال کر انہیں دفن کیا کرتے تھے۔ اور اس

---

[1] مستدرک جلد۱ ص ۱۱۸

[2] سورہ عبس۔

قسم کے اقدام کو وہ مرنے والے کے احترام کا نام دیا کرتے تھے اور اس طرح کی فضول کاری فراعنہ مصر یا اپنے زمانے کے دوسرے مقتدر بادشاہوں کے بارے میں زیادہ دیکھنے میں آتی ہے جو اپنے عروج پر تھی۔

فراعنہ مصر کی لاشیں:

کئی سال قبل میں نے روزناموں میں ایک خبر پڑھی تھی کہ مصر میں کسی مقام پر کھدائی کے دوران ایک تہہ خانہ ملا ہے جس میں ایک مومیائی لاش موجود تھی کہ جس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ تہہ خانہ کی دیواروں پر سونے کے ورق لگے ہوئے تھے اور لاش کے اطراف میں اس قسم کی گراں قیمت چیزیں بھی پڑی ملیں، یعنی گونا گوں جواہرات سے مرصع تخت وتاج، سونے چاندی کے چھوٹے بڑے سکے۔ ایک قیمتی تلوار جس کے دستہ اور نیام میں جواہرات جڑے ہوئے تھے، ایک انگوٹھی، ایک انگشتر جس پر نام کندہ تھا اور اس طرح کی کئی دوسری چیزیں۔

موسیٰ کے زمانے کا فرعون تہ خانے میں:

تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ مومیائی لاش حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے فرعون کی تھی۔ اس کے اطراف میں پڑے ہوئے سکّوں پر اس کا نام لکھا ہوا تھا، دیوار پر لگے ہوئے سونے کے اوراق کا وزن ۲۱۰ کلوگرام تھا۔ حکومتِ مصر نے فرعون کی ممی MUMMY کو عام لوگوں کے دیکھنے کے لیے تہہ خانے سے عجائب گھر منتقل کر دیا اور اس کے ساتھ ہی تہہ خانہ میں موجود تخت و تاج اور دوسری چیزوں کو بھی لاش کے ساتھ میوزیم بھیج دیا، ۲۱۰ کلوگرام سونے کو سرکاری خزانے کی تحویل میں دے دیا۔

موسیٰ علیہ السّلام کے زمانے کا فرعون دریائے نیل میں غرق ہوا اور جب وہ آخری لحات میں موت کو اپنے نزدیک دیکھنے لگا تو کہہ اُٹھا کہ میں اس خدائے واحد پر ایمان لایا جس پر بنی اسرائیل ایمان لا چکے ہیں تو اُسے جواب ملا تو مسلسل سرکشی اور طغیانی میں مبتلا رہا، جب موقع تھا اُس وقت تو تُو نے نہ سمجھا اور ایمان کا اظہار نہ کیا، اب جبکہ مجبور ہو گیا ہے تو ایمان کا اظہار کر رہا ہے، لیکن اس طرح کا ایمان اور ایسے موقع پر قابلِ قبول نہیں اور تجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ

”آج ہم تیرے بے جان جسم کو دریا سے باہر نکال پھینکیں گے تا کہ تیرے بعد آنے والے لوگوں کے لیے باعثِ عبرت ہو[1]“

---

[1] سورہ ۱۰ آیت ۹۲

لاش کی عجائب گھر میں منتقلی

اس عاجز انسان کی لاش جو خدائی کا دعویٰ کیا کرتا تھا، پانی سے باہر آ جانے کے فوراً ہی بعد اس زمانے کے لوگوں کے لیے درسِ عبرت تھی۔ اور اب بھی صدیاں گزر جانے کے بعد وہی لاش جسے تہہ خانے سے عجائب گھر منتقل کر دیا گیا ہے آج اور آنے والی کل کی نسلوں کے لیے سرمایہ عبرت ہے اور ان کی آنکھیں کھول رہی ہے۔ اور آج تک اسے دیکھنے والے اور آئندہ آنے والے لاکھوں، کروڑوں انسانوں کی عارضی طور پر ہی سہی تنبیہ کا سبب ہے۔ ایران کا ایک ادیب جو مصر گیا تھا اور اس عجائب خانے کو بھی دیکھا تھا جس میں فرعون کی ممی MUMMY رکھی ہوئی تھی تو اس نے اپنے تاثرات کو ان الفاظ میں قلم بند کیا:

به مصر رفتم وآثار باستان دیدم
به چشم آنچه شنیدم به داستان دیدم
بسی چنین وچناں خوانده بودم از تاریخ
چنین فتاد نصیم که آنچنان دیدم
رروزگار کہن درحریم الاہرام
نشان روز نود دولت جوان دیدم
گزشته دردل آئنده ہرچه
به مصراز توچه پنہاں که برعیاں دیدم
توتخت دیدی ومن بخت واژگون ازتخت
تونقش ظاہر ومن نقش ناتوان دیدم
توتاج دیدی دہن تخت رفته برتاراج
توعاج دیدی ومن شوت آستخوان دیدم
توسکه دیدی دم درواج سکه سکوت
توحلقه من به نگین نام بی نشان دیدم

توچشم دیدی ومن دیدہ حریصان باز
ہنوز ورطمع مُلک جاودان دیدم
تو چشم دیدی ومن دیدہ حریصان باز
ہنوزدرطمع مُلک جاودان دیدم
توآزمندی فرعون ومن نیاز حکیم
توگنج حسروومن رنج دیہقان دیدم
میاں این ہمہ آثار خوب وبدبہ مثل
دوچیز ازبدووزخوب توأمان دیدم
یکی نشانہ قدرت یکی نشانہ حرص
کہ باز ماندہ زمیراث حسروان دیدم

میں مصر گیا اور وہاں پر آثار قدیمہ کو دیکھا۔ جو کچھ پڑھا تھا وہی کچھ جا کر دیکھا۔ اہرام مصر کے علاقے میں تاریخی داستانیں جو مستقبل کے اندر چھپی ہوئی ہیں۔ تجھ سے کیا چیز مخفی ہے میں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ تو نے تو تخت دیکھا ہے، لیکن میں نے تخت کے اُجڑے ہوئے بخت دیکھے ہیں۔ تو نے ظاہری نقوش دیکھے ہیں، لیکن میں نے ناتوانی کے آثار ملاحظہ کیے ہیں تو نے تاج کو دیکھا ہے مگر میں نے اُجڑے ہوئے تخت کو دیکھا ہے۔ تو نے ہاتھی دانت دیکھے ہیں، لیکن میں نے مٹھی بھر ہڈیوں کا نظارہ کیا ہے مگر میں نے اُجڑے ہوئے ہیں تو نے سکے دیکھے ہیں میں نے سکہ چلانے والوں کی خاموشی دیکھی ہے۔ تو نے انگوٹھی کا مشاہدہ کیا ہے۔ لیکن میں نے بے نام ونشان نگینے دیکھے ہیں، تو نے صرف آنکھوں کو دیکھا ہے مگر میں نے حریصوں کی آنکھوں کو دیکھا ہے جو اب بھی جاودانی حکومت کے لالچ میں کھُلی ہوئی ہیں۔ تو نے فرعون کی حرص کے مناظر دیکھے ہیں، لیکن میں نے حکیم کی بے نیازی کو ملاحظہ کیا ہے تو نے بادشاہوں کے خزانے دیکھے ہیں، لیکن میں نے دہقانوں کے دکھ ملاحظہ کیے ہیں۔ ان اچھے اور بُرے دونوں آثار کے درمیان اچھائی اور بُرائی کی دو جڑواں مثالیں دیکھی ہیں، ایک تو قدرت کاملہ کی نشانی اور دوسرے حرص کی علامت جو بادشاہوں کی باقیماندہ میراث ہے۔

ناجائز اور ممنوع کام:

مردوں کو قیمتی لباس پہنانا اور اُنہیں طلا اور جواہرات کے ساتھ دفن کرنا اسلام کے مقدس دین میں ممنوع ہے مرنے والے کے ورثاء کا یہ عمل خواہ اس کے احترام اور عزت وتکریم کی صُورت میں ہو یا خودنمائی اور تعلّیٰ کی صُورت میں، دونوں صُورتوں میں اسلام اس غیر معقول کام کے مخالف ہے جو مال کے ضائع کرنے کا سبب ہوتا ہے۔

اسلام کے پیروکاروں پر فرض عاید ہوتا ہے کہ مُسلمان کی میت کا بھی اسی طرح احترام کریں جس طرح اس کی زندگی میں کیا کرتے تھے اور جو بات بھی اس کی ہتک اور توہین کا سبب بنتی ہے اس سے پرہیز کریں۔

متوفی کے احترام کی حدود:

اور پھر یہ کہ مبادا متوفی کا احترام اس کے ورثا تعلّی اور بلند پروازی کا سبب بن جائے اور اُنہیں تندروی بلکہ بے راہروی کی حدود تک پہنچا دے لہٰذا اسلا کے عظیم الشان شارع نے متوفی کے احترام کے لیے کچھ حدود مقرر کردی ہیں اور اپنے پیروکاروں کا حکم دیا ہے کہ ان حدود کی پابندی کریں اور عقل ومصلحت کی حدود کو نہ پھلانگیں۔

جو مُسلمان اس دُنیا سے رُخصت ہوتے ہیں ان کے بارے میں راہنمایان اسلام کی طرف سے دو قسم کی روایات ہم تک پہنچی ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے جس میں زیادہ تر متوفی کے بدن کے ساتھ احترام کے بارے میں ہیں اور ان میں متوفی کے ورثاء اور دوسرے لوگوں کے دینی فرائض بتائے گئے ہیں مثلاً متوفی کے غسل، کفن، نماز، تشیع اور دفن وغیرہ کا مسئلہ ہے اور دوسری قسم وہ ہے جس میں خود متوفی کی ذات سے متعلق باتوں کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ مثلاً قبر میں سوال وجواب، فشار قبر اور اسی طرح کی دوسری صُورتیں ہیں، اس قسم کی روایات میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قبر یا تو بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔

پہلی قسم کی روایات کا تعلق ادائے فرض سے ہے اور دوسری کا عقائد سے پہلی قسم کی روایات ان کاموں سے متعلق ہیں جو مشہود اور محسوس ہیں جنہیں بالغ اور عاقل افراد متوفی کے بارے میں اپنا دینی فریضہ سمجھ کر انجام دیتے ہیں جبکہ دوسری قسم کی روایات کا تعلق ان واقعات سے ہے جو مخفی ہیں اور عالم غیب میں متوفی کو درپیش آئیں گے۔ اس فصل میں دونوں قسم کی روایات پر قدرے تفصیل سے گفتگو ہوگی۔

تجہیز وتکفین میں جلدی کی جائے:

اسلام نے مُسلمان کی میت کے لیے جو سب سے پہلا احترام مقرر کیا ہے وہ ہے اس کی تجہیز وتکفین اور تدفین کے

بارے میں ہے کہ یہ سب کچھ جلد از جلد انجام دیا جائے کیونکہ اگر میت کے ان کاموں میں تاخیر کی جائے تو اس میں ایسی تکلیف دہ بدبو پیدا ہو جاتی ہے کہ لوگوں کی نفرت اور دُوری کا سبب بن جاتی ہے اور یہ بذاتِ خود ایک مسلمان کے جسم کی بہت بڑی توہین کا سبب ہوتی ہے۔ میت کو جلد از جلد دفن کرنے کے لیے شارع مقدس نے اس کی تجہیز و تکفین یعنی غُسل، کفن اور دفن وغیرہ کی ذمہ داری صرف اس کے رشتہ داروں پر ہی عاید نہیں کی بلکہ تمام مُسلمانوں پر ان فرائض کی ادائیگی لازمی قرار دی ہے۔ اگر کچھ لوگ بقدر کفایت اس کام کی بجا آوری کے لیے آگے بڑھیں اور میت کے مذکورہ اُمور اپنے ذمہ لے کر انجام دیں تو دوسرے لوگوں سے یہ فرض ٹل جاتا ہے ورنہ سب کے سب اللہ کی بارگاہ میں جوابدہ ہوں گے۔

متوفی کا غسل و کفن:

ایک اور احترام جسے شارع مقدس نے مُسلمان کے جنازہ کے لیے مقرر فرمایا ہے اور اسے دینی واجبات میں شمار کیا ہے وہ اس کے غسل و کفن کا مسئلہ ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ بعض مسلمان گھرانوں کے لوگ اپنے گھروں میں کبوتر یا بلی وغیرہ کو پالتے ہیں اور بڑی محبت سے ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ لیکن جب یہ جانور مر جاتے ہیں تو ممکن ہے چند لمحوں کے لیے اُن کے غم میں مغموم ہوں لیکن نہ تو وہ خود اس حیوان کے بدن کو محترم سمجھتے ہیں اور نہ ہی دوسروں سے اس بات کی توقع رکھتے ہیں بلکہ اسے بڑی بے نیازی کے ساتھ کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر ڈال دیتے ہیں جو دوسرے کوڑے کے ساتھ شہر سے باہر منتقل ہو جاتا ہے لیکن ایک انسان کی موت جو اس گھرانے کا ایک فرد ہوتا ہے اور گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ کئی برس تک مل کر رہا ہے جانور کی موت جیسی نہیں ہے۔ اور اس سے بے نیازی کا مظاہرہ نہیں کرتے، بلکہ خود بھی اس میت کا احترام کرتے ہیں اور دوسرے دوست واحباب سے بھی اسی قسم کے احترام کی توقع رکھتے ہیں۔

مُردے کے احترام میں حد سے تجاوز:

اسلام کے مقدس شارع نے مُسلمان کی میت کے صحیح معنوں میں احترام اور تکریم کے ساتھ مکمل موافقت فرمائی ہے اسی لیے حکم دیا ہے کہ مرنے والے کے جسم کو اچھی طرح صاف سُتھرا کرنے کے بعد تین غسل دیے جائیں، پہلا غسل اس پانی کے ساتھ دیا جائے جس میں سدر (بیری) کے پتے ملے ہوئے ہوں، دوسرا اس پانی کے ساتھ جس میں کافور ملا ہوا ہو اور تیسرا صرف اور صرف خالص پانی کے ساتھ۔ پھر چند کپڑوں میں کفن دیا جائے اور تشیع جنازہ کی صُورت میں اُسے قبر تک لے جایا جائے اور اسلامی احکام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اُسے دفن کر دیا جائے۔ عقلمندی اور اعتدال پر مبنی یہ عزت و تکریم ہر مُسلمان کے لیے ضروری ہے خواہ وہ امیر ہو یا غریب شہری ہو یا دیہاتی مرد ہو یا عورت!! اور مُسلمان اسلامی حکم سمجھ کر اس پر عمل پیرا

ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص اس حد سے آگے بڑھے اور تعلّی و برتری یا خودنمائی کے طور پر یا متوفی کے ساتھ محبت کے نام پر میّت کو طلا و جواہرات سے مزّین و مرصّع کر کے دفن کرے، یا کفن کی بجائے اُسے قیمتی کپڑوں میں ملبوس کر کے دفن کرے تو اسلام ایسی بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا، اور اس قسم کے کاموں کو ناجائز اور خلافِ شرع سمجھتا ہے۔ درحقیقت اسلام نے ایک طرف میت کے لیے غُسل و کفن کو فرض کر کے اس کے احترام کو بحال رکھا ہے اور دوسری طرف عقل و مصلحت کے خلاف کاموں کو انجام دینے سے روک دیا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں یا باپ، یا شوہر بیوی یا کسی اور رشتہ دار کو زیادہ محبوب ہوتا ہے اور محبت کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جب وہ مر جاتا ہے تو اس سے محبت کرنے والے اس کے بے جان جسم کو آسانی کے ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، اگر اُن کے بس میں ہو تو اُسے ہمیشہ کے لیے اپنے پاس ہی رکھ لیں، لیکن نظامِ خلقت کا جبر اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ اُنہیں اس کو مجبوراً چھوڑنا پڑتا ہے اور اپنی خواہش و تمنّا کے برخلاف اسے مٹی کے سپرد کرنا پڑتا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"ان الله تبارك وتعالىٰ تطول على عباده بثلاث، القى عليهم الريح بعد الروح، ولولا ذالك مادفن حميم حميا، والقى عليهم السلوة ولولا ذالك لا انقطع النسل، والقى على هذه الحبة الوابة، ولولا ذالك لكنزها ملوكهم كما يكنزون الذهب والفضة"

''خداوند عالم نے اپنے بندوں پر احسان فرمایا ہے کہ نظامِ خلقت میں تین چیزیں مقرر فرما دی ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ رُوح نکلنے کے بعد میت کے اندر بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی بھی شخص اپنے دوست کو دفن نہ کرتا۔ دوسری چیز یہ ہے کہ موت کے ماروں کو مرنے والے کا غم بھلا دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ لوگ ہمیشہ ایک ہی مصیبت میں پڑے رہتے اور نسلیں منقطع ہو جاتیں، کیونکہ غم کی شدت مصیبت زدوں کو جنسی میلان کی اجازت نہیں دیتی۔ تیسری چیز یہ کہ خداوند عالم نے غلّات کے کھانے پر حشرات اور چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑوں کو مقرر فرما دیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بادشاہ اور دوسرے طاقتور لوگ، دوسرے لوگوں کے خوراکی مواد کو سونے چاندی کی طرح ذخیرہ کر لیتے ہیں اور زمین میں دبا دیتے۔''[1]

---

[1] کافی جلد ۳ ص ۲۲۷

غُسل مس میت:

ایک اور مطلب جس کے بارے میں یہاں پر گفتگو کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے وہ "غسل مس میت" ہے چنانچہ جب میت ٹھنڈی ہوجائے اور کوئی شخص غسل دینے سے پہلے اس کے بدن کے کسی حصّے کو چھو لے تو اُسے چاہیے کہ وہ غُسل مس میت کرے روایات میں یہ چیز کئی بار اور کئی مقامات پر آ چکی ہے۔ اور فقہا نے بھی انہی روایات کی بنا پر فتویٰ دیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"من مس جسد میت بعد ما یبرو لزمه الغُسل"

"جو شخص میّت کے بدن کو ٹھنڈا ہونے کے بعد مس کرے اُسے غُسل کرنا پڑے گا۔"[1]

یہ شرعی حکم صرف انسانی میت کے ساتھ مخصوص ہے اور مردہ کُتے یا بلی یا کسی اور مردہ جانور کو ہاتھ لگانے سے غسل مس میت واجب نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ بار بار سوال کرتے ہیں کہ آیا انسان کا مُردہ، کُتے، بلی کے مُردے سے زیادہ نجس ہے کہ اس کے مُردے کو چھو لینے سے غسل واجب ہوجاتا ہے اور جانور کے مُردے کو مس کر لینے سے غُسل واجب نہیں ہوتا؟

میت کو زیادہ نہ چھوا جائے:

تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کی میت کو چھونے سے تمام بدن کا غسل اس کی نجاست کی وجہ سے واجب نہیں ہوتا' کیونکہ اگر یہ وجہ ہوتی تو فرض کیجئے کہ زندہ شخص کی انگلی کا پاک کرنا واجب ہوتا نہ کہ پُورا بدن۔ تو معلوم ہوا کہ غُسل مس میت کا وجوب کسی اور وجہ سے ہے۔ شاید یہ حکم ایک جرمانہ کی حیثیت سے ہو جسے شارع مقدس نے مقرر فرمایا ہوتا کہ لوگ میت کے آلودہ بدن کو کم سے کم چھوئیں اور اس طرح سے اُن کی صحّت پر کوئی اثر نہ پڑے۔

اور اب اس کی تشریح:

اکثر لوگوں کی موت اُن کی گونا گوں بیماریوں میں مُبتلا ہونے کی وجہ سے واقع ہوتی ہے اور ان میں اکثر و بیشتر بیماریاں عفونی INFECTED اور وبائی ہوتی ہیں اور مریض انسان کچھ مُدت بیمار رہنے کے بعد دُنیا سے رُخصت ہوتا ہے، عام طور پر اس قسم کے بیماریوں کے بدن کی سطح کم و بیش جراثیموں اور بیماری کے ایا م کی نجاستوں سے آلودہ ہوتی ہے۔ چونکہ بعض چھُوت کی بیماریاں بھی ہوتی ہیں جو میت کے بدن کو مس کر لینے سے دوسروں تک پھیل جاتی ہیں اور صحیح سالم افراد کو اپنی

---

[1] مستدرک الوسائل جلد ا ص ۱۵۰

لپیٹ میں لے لیتی ہیں جس کی وجہ سے شارع مقدس نے غسل مس میت کوفرض قرار دیا ہے۔اور حقیقت میں اس کوایک قانونی شکل دے کر مُردوں کے مس کرنے کو کم سے کم حد تک پہنچا دیا ہے۔

طبّی اصولوں کے خلاف کام:

اگر شارع اسلام نے میت کے چھونے پر کوئی پابندی نہ لگائی ہوتی اور مس میت کے غُسل کا جرمانہ عاید نہ کیا ہوتا تو میت کے ماں باپ یا دوسرے قریبی رشتہ دار اپنے عزیزوں کے بیماریوں سورنجاستوں سے آلودہ اجسام کو گلے لگاتے رہتے، انہیں چومتے، سُونگھتے اوراُن سے اظہار محبت کرتے اوراپنے دوسرے اعزاء واقربا سے بھی یہی تقاضا کرتے کہ اُنہیں چُومیں، پیار کریں، اُن کے منہ پر منہ رکھیں، اور یہ کام یقیناً طبی اُصولوں کے منافی ہوتا ہے۔

اوراس کے برعکس اگر شارع مقدس میت کے بدن کو ہاتھ لگانے تک کوحرام قرار دے دیتا اور کسی بھی صورت میں اُسے ہاتھ لگانے کی اجازت نہ دیتا تو یہ حُکم سنگدلی اور بے رحمی کا آئینہ دار ہوتا اورلوگ پُوچھتے کہ یہ کیسا مہربان خدا ہے جو جوان بیٹے کی موت کا داغ دیکھنے والی ماں تک کوبھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اسے ایک بارتو چُوم لے، اس کے چہرے پر اپنے چندآنسوگرائے اوراپنے بےقرار دل کوتسکین بخشے۔

قانونی مشکل:

اسلام نے ایک طرف توموت کا داغ دیکھنے والوں کے جذبات کا احترام کیا ہے اوردوسری طرف صحت وسلامتی کے اُصولوں کوپیش نظر رکھتا ہے لہٰذا ان دونوں اُموکومدِنظر رکھتے ہوئے اپنے پیروکاروں پرمس میت کاغُسل قرار دیا ہے اورایسا حُکم نافذ کر کےلوگوں کے لیے ایک قانونی مشکل ایجاد کردی ہے جس کی وجہ سے اُن کا مُردوں کے ساتھ جسمانی رابطہ کم سے کم ہوکر رہ گیا ہے۔

لہٰذا مذکورہ تصریحات کی روشنی میں انسان کے مُردے کا کُتے وغیرہ کے مُردے سے مقابلہ اورموازنہ نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ایک توغسل مس میت کے مسئلہ میں نجاست کے پہلو کو مدنظر رکھا ہی نہیں گیا، لہٰذا یہ کہا جائے کہ آیا انسان کا مُردہ زیادہ نجس ہے یا کُتے کا؟ اوردوسرے یہ کہ انسان کے انسانی مُردہ کوچھونے کا سبب مادری، پدری، برادری، خواہری اور اس قسم کے دوسرے لوگوں کی محبت اورشفقت ہوتی ہے جوانسانی فطرت کا تقاضا ہے جبکہ کُتے کے جسد کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی، لہٰذاانسان کے مُردے کاکُتے کے مُردے سے تقابل نہیں کیا جاسکتا۔

مُسلمانوں کی رُسول پاکؐ سے سرگوشی:

یہ دینی حکم، خدا کے اس فرمان سے مشابہ ہے جو ان لوگوں کے بارے میں صادر ہوا جو رُسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرگوشی کرنا چاہتے تھے اور کچھ باتیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کان میں بتانا چاہتے تھے جن کی خبر ساتھ میں بیٹھنے والوں کو نہ ہونے پائے۔ اب اس واقعہ کی تفصیل: اوائل اسلام میں منافقین کی سرگوشی ایک اجتماعی مشکل اور انقلاب دُشمن سرگرمی کی صُورت اختیار کر گئی تھی۔ وہ عام محفلوں میں ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے اور جستجو طلب لوگوں کے سامنے ایک دوسرے سے کانا پھُوسی کرتے، اس طرح سے اُن کا مقصد مُسلمانوں کے حوصلے پست کرنا ہوتا تھا۔ وہ ان لوگوں کو اسلام اور مُسلمانوں سے بدظن کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کرتے تھے جو بت پرستی اور عصر جاہلیت کو ابھی تازہ تازہ خیر باد کہہ کر حلقہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ منافقین اس طرح سے ان لوگوں کے درمیان اختلاف اور فتنے کی آگ بھڑکانا چاہتے تھے اور زمانہ قبل از اسلام کا خانماں سوز کینہ ان کے دلوں میں بیدار کرنا چاہتے تھے۔ اور اُن کا یہ طریقہ کار نہ صرف اُن کی دینی برادری میں رخنہ ڈالنے کا سبب بن سکتا تھا بلکہ ممکن تھا کہ اُن کے درمیان لڑائی اور جھگڑے کا موجب بھی بن جائے۔ لوگوں کو ایک دوسرے کی جان لینے بلکہ ناقابل تلافی نقصان کا موجب بھی بن سکتا تھا۔

منافقین کی سرگوشیاں:

قرآن مجید نے سُورہ مجادلہ میں منافقین کی گناہ آلود اور دُشمن ساز سرگرمیوں کے بارے میں گفتگو کی ہے اور ان مفسد اور نفاق پرور عناصر کو عذاب سے بھی باخبر کیا ہے جو اپنے غلط طریقوں سے اسلامی تعلیمات سے سرپیچی اور رُسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کیا کرتے تھے پھر فرمایا ہے کہ:

اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

''یقیناً سرگوشی شیطان کا عمل ہے اور اس نادر کام سے اس کا مقصد مومنین کو غمگین کرنا ہے۔''[1]

خودغرض اور دولت مندوں کا طریقہ کار:

رُسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک طرف تو آشوب گر، فتنہ پرور اور غدار منافقین کی مشکل میں مُبتلا تھے، دوسری طرف اُنہیں ایک اور مشکل بھی درپیش تھی اور یہ کہ کچھ خودغرض اور نسبتۂ خوشحال لوگ خود کو لوگوں کے سامنے بڑا آدمی ظاہر کرنے

---

[1] سُورہ ۵۸ آیہ ۱۰

کے لیےاورلوگوں کو یہ بتانے کے لیے کہ اُن کے رُسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نزدیکی اور گہرے مراسم ہیں گاہ گاہ آنحضرتؐ کے پاس آجاتے اور سرگوشی کی صُورت میں آپؐ سے کچھ باتیں کرتے۔ ان کا یہ طریقہ کار نہ صرف رُسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تکلیف دہ تھا بلکہ اخلاقی اور اجتماعی لحاظ سے بھی مُضر تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے عمومی اذہان میں مشکلات ایجاد کرنے کا باعث بھی تھا۔

ضروری کاموں کے لیے سرگوشی:

اگر رُسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سرگوشی کے اس غلط طریقہ کار کو خداوند عالم یکسر ختم کردیتا تو یہ مصلحت کے خلاف تھا کیونکہ ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ کچھ ایسی صورتِ حال پیدا ہوجائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہوں اور کسی ضروری اور اہم کام کے سلسلے میں آپ تک ایک مخفی بات پہچانی ہو اس وقت جب کہ لکھنے پڑھنے کے وسائل بہت کم تھے، آپؐ تک بات پہنچانے کے لیے سرگوشی سے بڑھ کر اور کوئی سریع اور جلدی کا ذریعہ نہیں تھا۔ اور اگر سرگوشی پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ لگائی جاتی تو ایسا کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا۔ اس سے جہاں مُسلمانوں کے دل میں شکوک وشبہات بڑھنے کا خدشہ تھا وہاں پر رُسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بھی مشکل اور تکلیف کا اندیشہ تھا، لہٰذا لوگوں کی غیر ضروری سرگوشیوں کو کم اور رُسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکلیف کو دُور کرنے کے لیے خداوند عالم کی طرف سے یہ حکم نازل ہوا۔

صدقہ کی ادائیگی کا حکم:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ

''اے ایماندارو! جب تم رسولؐ سے نجویٰ (سرگوشی) کرنا چاہو تو پہلے مستحقین کو کچھ پیسے صدقہ کے طور پر دے دیا کرو۔ پھر اپنی مجرمانہ باتوں کو پیغمبر کے کان میں کہا کرو، کیونکہ اسی ہی میں تمہاری بھلائی ہے اور یہی تمہاری پاکیزگی کا سبب ہے۔''[1]

درحقیقت خداوند عالم نے اس حکم کے ذریعے سرگوشی کرنے والوں پر کچھ مالیات عاید کردیے تاکہ غریب اور مستحق افراد کو بھی فائدہ پہنچے، اور صورتحال میں بھی تبدیلی واقع ہو، چنانچہ ایسا ہی ہوا جس سے غیر ضروری یا ریاکاری پر مبنی سرگوشیوں کا خاتمہ ہوگیا۔

---

[1] سُورہ ۵۸، آیت ۱۲

خلاصہ کلام، شارع اسلام نے مس میت کے غسل کو واجب قرار دے کر مُسلمانوں کے لیے ایک قانونی مشکل ایجاد کردی اور میت کو کم سے کم مس کرنے اور چھونے کے اسباب فراہم کردیے اور متوفی کی توہین وتحقیر کے بغیر طبی اصولوں کی حفاظت اور زندگی کے ماحول کی سلامتی کی حمایت کی اور رُسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرگوشی کے سلسلے میں بھی صدقہ کی ادائیگی کا حکم دیا تاکہ کوئی شخص ناراض بھی نہ ہو اور ہر ایرے غیرے کی توقعات بھی ختم ہوجائیں اور پیشوائے اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو درپیش مشکلات کا بھی خاتمہ ہوجائے۔

میت اور اس کے پسماندگان کا احترام:

نماز میت اور تشیع جنازہ اور دوسرے احترام ہیں جو آئینِ اسلام میں مردوں کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ ان دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ نماز میت واجب ہے اور تشیع جنازہ سُنت موکدہ۔ تشیع جنازہ سے صرف مُسلمان میت ہی کے احترام کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ اس کے پسماندگان کے لیے عزت افزائی اور ہمدردی کا پتہ بھی چلتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر تشیع جنازہ معرفت اور باطنی توجہ کے ساتھ انجام پائے تو تشیع کرنے والوں کی رُوح پر بھی معنوی اثر ڈالتی ہے اور ان کے لیے عبرت اور بیداری کا سبب بھی بنتی ہے۔ حدیث میں ہے:

"کان النبی ﷺ اذاشیع جنازة غلبه کائبة واکثر حدیث النّفس واقل الکلام۔"

''جب رسُول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی جنازے کی تشیع کرتے تو آپ پر غم واندوہ غالب آجاتے اور حدیثِ نفس میں مشغول ہوجاتے اور باتیں کم کیا کرتے تھے۔''[1]

اسی طرح ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

"عودوا المرضیٰ وتبعوا الجنائز یذکرکم الآخرة"

''تم لوگ بیماریوں کی عیادت کیا کرو، جنازوں کے پیچھے چلا کرو کہ تم اس سے آخرت کو یاد کرو گے۔''[2]

---

[1] سفینۃ البحار جلد ا ص ۷۳۶ (لفظ شیع)

[2] مستدرک الوسائل جلد ا ص ۱۱۹

معرفت اور بصیرت کا سبب:

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ان ذھاب الذاھبین بصیرۃ للقوم المتخلفین"

''گذشتہ نسلوں کا اس دُنیا سے اُٹھ جانا آئندہ نسلوں کے لیے سرمایہ عبرت ہے۔''[1]

نہج البلاغہ میں ہے۔

"وتبع جنازۃ فسمع رجلا یضحك فقال علیہ السلام کان الموت فیھا علی غیر نا کتب و کان الحق فیھا علی غیر ناوجب"

''حضرت علی علیہ السلام لوگوں کے ساتھ کسی جنازے کی تشیع کر رہے تھے کہ آپ نے ایک شخص کے بلند آواز کے ساتھ ہنسنے کی آواز سُنی تو ناراض ہو کہ فرمایا کہ وہ اس لیے ہنس رہا ہے کہ سمجھتا ہے کہ گویا موت اس دُنیا میں ہمارے غیر کے لیے مقرر کی گئی ہے اور اس سرائے فانی میں حق پر عملدر آمد کرنا ہمارے غیر کے لیے واجب کیا گیا ہے۔''[2]

خلافِ شرافت کام:

تشیع جنازہ کرنے والوں میں سے کسی شخص کے بلند آواز کے ساتھ ہنسنے میں دو بُرائیاں ہیں۔ایک تو اس کی غفلت اور عدم معرفت کی دلیل ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایک انسان کی موت سے اُس نے عبرت حاصل نہیں کی اور خوابِ غفلت سے بیدار نہیں ہوا، گویا خود اسے نہیں مرنا اور موت اس کی زندگی کو ختم نہیں کرے گی اور دوسرے یہ کہ ایک مسلمان کے جنازہ کی تشیع میں بلند آواز سے ہنسنے میں ایک تو خود متوفی کی توہین اور بے احترامی ہوتی ہے اور دوسرے مصیبت زدہ خاندان سے بے رُخی اور بے اعتنائی کا پتہ چلتا ہے اور یہ دونوں چیزیں عظمت، شرافت اور فضیلت کے برخلاف اور اسلامی اخلاق اور اسلامی برادری کے تقاضوں کے منافی ہیں۔

---

[1] فہرست غررص ۱۷۳

[2] نہج البلاغہ کلمہ ۱۱۹

احترام انسانیت:

جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات ایسا اتفاق بھی ہوجا تا تھا کہ رُسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے غیر مُسلم کے جنازہ کے احترام کو بھی انسانی عظمت کا احترام قرار دیتے ہوئے خود بھی اس پر عمل کر کے دکھایا، چنانچہ روایت میں ہے:

"قام النبی، واصحابه لجنازة یهودی حتی تورات وفی روایة قیل انه یهودی فقال الیست نفسا؟"

''یعنی کسی یہودی کے جنازے کو ایک جگہ سے لے جا رہے تھے کہ رُسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپؐ کے صحابی وہیں پر تشریف فرما تھے، آپؐ اور آپؐ کے صحابی کھڑے ہوگئے اور اس وقت تک کھڑے رہے جب تک کہ جنازہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہوگیا۔ آپ سے عرض کیا گیا کہ یہ تو یہودی کا جنازہ تھا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا تو کیا وہ انسان نہ تھا؟'' [1]

نتیجہ یہ نکلا کہ دینی پیشواؤں کی طرف سے مُسلمانوں کے مُردوں کے بارے میں جو روایات ہدیہ قارئین کی جا چکی ہیں وہ لوگوں سے متعلق فرائض کی انجام دہی کی نشاندہی کرتی ہیں جیسے غُسل وکفن، نماز اور تشییع جنازہ کی جلد تدفین جیسے اُمور ہیں۔ روایات کا ایک اور حصہ جو خود مرنے والے کی ذات کے ان حالات سے متعلق ہے جو عالمِ غیب اور مرنے کے بعد کے جہان میں اُسے درپیش آئیں گے اور یہ احادیث اعتقادی پہلو کی حامل ہیں۔ اب ہم اس سلسلے میں قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

رحمت اور عذاب قبر کے لحاظ سے قبر کا مقام:

قبر: قبر کے بارے میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"ان القبر روضة من ریاض الجنة او حفرة من حفر النار۔"

''قبر یا تو بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔'' [2]

---

[1] بحار، جلد ۱۸، ص ۲۵۴

[2] بحارالانوار جلد ۳، ص ۱۵۱

فشارِ قبر

ایک اور چیز جس کا ذکر روایات میں بھی آیا ہے اور اس کا تعلق بھی عالمِ غیب اور مرنے کے بعد کے زمانے سے ہے وہ ہے فشارِ قبر کا مسئلہ۔ اور یہ فشار اس معنی میں نہیں ہے کہ ہم اس کا مشاہدہ کر سکیں کہ قبر کے دونوں طرف کی دیواریں آپس میں مل جائیں گی اور میت کے جسد کو پیش ڈالیں گی، بلکہ اس فشار سے مراد وہ عذاب ہے جو اس عالم کے ماوراء متوفی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، جسے مادی اور ظاہر بین دنیاوی آنکھوں کے ساتھ نہیں دیکھا جاسکتا۔

مُحکم کاری کی اہمیت:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں یہ اطلاع دی گئی کہ سعد بن معاذ کا اس دُنیا سے انتقال ہو گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے، اصحاب بھی کھڑے ہو گئے، سب چل کر سعد کے گھر آئے، آپ کے حکم کے مطابق اُنہیں غُسل و کفن دیا گیا، رُسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبا کے بغیر اُن کی تشییع جنازہ فرمائی۔ کبھی آپؐ اُن کے تابوت کو داہنا کندھا دیتے کبھی بایاں، یہاں تک کہ جنازے کو قبر کے پاس لے جایا گیا، آنحضرتؐ بذاتِ خود قبر میں تشریف لے گئے اور اُنہیں خود ہی قبر میں لٹایا، قبر کی لحد کو اینٹوں سے بند کیا اور پتھروں اور مٹی سے اس کے سُوراخ بند کیے۔ آپؐ کا یہ طریقہ شاید بعض لوگوں کے لیے باعثِ سوال بن گیا کہ "آخر اس بات کا کیا فائدہ ہے کہ آپ اینٹوں کے درمیانی خلا کو پتھروں اور مٹی سے بند کر رہے ہیں؟ کیونکہ مٹی کا بوجھ لحد کی صُورت کو ختم کر دے گا اور قبر کا اندرونی حصہ مٹی سے بھر جائے گا چنانچہ جب قبر کی بھرائی کا کام ختم ہو گیا تو آپ نے کسی دوسرے شخص کے سوال کرنے سے پہلے خود ہی فرمادیا کہ مجھے معلوم ہے قبر خراب ہو جائے گی اور اس کا نظم بگڑ جائے گا۔

حدیث کی وضاحت:

"ولکن اللہ یحب عبدا اذا عمل عملا احکمہ"

"لیکن خدا کو یہ بات پسند ہے کہ جب بندہ کوئی عمل کرے تو اُسے ٹھوس طریقوں پر بجالائے"[1]

ایک دن میں نے ایک مسجد میں تقریر کے دوران اس حدیث کو پڑھا، مجلس میں کافی مجمع تھا، مجلس ختم ہو گئی اور میں منبر سے نیچے بیٹھ گیا تا کہ لوگ چلے جائیں اور راستہ کھُل جائے۔ اسی اثنا میں سامعین میں سے ایک شخص میرے پاس آیا اور

---

[1] بحارالانوار جلد ۳ ص ۱۵۱

سلام کے بعد کہنے لگا "میں آنحضرتؐ کے اس کلام کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکا، ذرا اس بارے میں وضاحت فرما دیجیے! میں نے اس کی بات مان لی اور عرض کیا کہ بیٹھ جائیے، چنانچہ وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔

میں نے کہا اکثر ایسا اتفاق ہوا کہ جب لوگوں نے مجھ سے سوال کیا ہے تو میں نے اُن کے پیشے کے بارے میں پُوچھا ہے اور بیان مطلب کے لیے اسی پیشے سے مثال اور تشبیہ پیش کی ہے اس سے ایک تو بات واضح ہو جاتی ہے اور دوسرے سوال کرنے والا قانع ہو جاتا ہے۔ تو کیا آپ مجھ سے اتفاق کریں گے میں آپ سے پُوچھوں کہ آپ کا کیا پیشہ ہے تو اُنہوں نے جواب دیا کہ میں ڈاکٹر ہوں اور میرا رشتہ ڈاکٹری، جنرل سرجری ہے۔ میں نے تھوڑی دیر سوچا پھر اس طرف متوجہ ہوا کہ سائل کا پیشہ مطلب کی وضاحت کے لیے معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا، جناب ڈاکٹر صاحب! اگر کسی شخص کو سیشن کورٹ سزائے موت دیتی ہے اور ہائی کورٹ بھی اس سزا کی توثیق کر دیتی ہے۔ سزا سے عملدآمد سے قبل وہ شخص بیمار ہو جاتا ہے۔ قانون کی رُو سے اُسے اس وقت تک سزائے موت نہیں دی جا سکتی جب تک وہ بالکل تندرست نہ ہو جائے۔

ایک سوال اور اس کا جواب:

فرض کیجیے آپ پولیس ہسپتال کے سرجیکل شعبہ کے انچارج ہیں اور جس شخص کو کل صبح چار بجے سزائے موت دی جانی ہے وہ آج رات کو دس بجے سخت APPENDICTIS میں مُبتلا ہو جاتا ہے اُسے جیل سے پولیس ہسپتال میں لے آتے ہیں۔ آپ کو اطلاع دی جاتی ہے اور آپ فوراً ہسپتال جا کر مریض کو آپریشن رُوم میں لے جاتے ہیں اور اُسے بے ہوش کر کے آپ اس کا ٹھیک ٹھیک آپریشن کریں گے یا نہیں؟ آیا آپریشن کے موقع پر تمام طبی اور جراحی اصولوں کو مدّنظر رکھیں گے یا نہیں؟ اُنہوں نے جواب دیا یقیناً ایسا ہی کریں گے، میں نے پوچھا کس لیے؟ یہ شخص تو چند دنوں کا مہمان ہے بعد میں تو اُسے تختہ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔ کیا ضرورت ہے کہ آپ اس کا صحیح طریقے پر آپریشن کریں اور اس بارے میں تمام طبی اور جراحی اُصولوں کی رعایت کریں؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ اس کی سزائے موت کا میرے پیشہ سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا پیشہ اس بات کا متقاضی ہے کہ آپریشن صحیح صورت میں انجام پائے خواہ اسے سزائے موت دیں نہ دیں!

کام ٹھوس طریقوں پر انجام دینا چاہیے:

میں نے کہا رُسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی یہی مطلب ہے گویا وہ یہ فرمانا چاہتے تھے کہ قبر ویران ہو جانے کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں، خدا تو بس یہ چاہتا ہے جو شخص جتنا کوئی کام کر سکتا ہے اُسے ٹھوس اور محکم طریقوں پر انجام دینا چاہیے۔

اور کسی عُذر کی وجہ سے اپنی پختہ کاری اور ٹھوس انجام دینے سے غفلت نہیں کرنی چاہیے' چنانچہ اُنہوں نے میرا یہ جواب سن کر شکریہ ادا کیا اور چلے گئے۔

بہرحال جب سعد بن معاذ کی تدفین کا کام مکمل ہو چکا تو سعد کی ماں نے اپنے متوفی بیٹے کو مخاطب کر کے کہا: ''سعد! تمہیں بہشت مبارک ہو۔'' یہ سُن کر رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"یااُمِ سعد مه لا تجزمی علی ربك فان سعدا قد اصابته"

''اے اُم سعد! جو کام خدا سے متعلق ہیں تم اُن کے بارے میں یقین سے کچھ نہ کہو، کیونکہ اس وقت سعد فشارِ قبر میں مُبتلا ہے۔''

سعد بن معاذ اور فشارِ قبر:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے لوگ قبرستان سے واپس آ گئے، کسی نے آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ یا رُسول اللہ! آپؐ نے سعد کے جنازے کی بہت ہی عزت وتکریم کی، اور اس کے ساتھ وہ طریقہ کار اختیار کیا جو کسی دوسرے کے ساتھ نہیں فرمایا، اس کے باوجود بھی آپؐ فرماتے ہیں کہ سعد فشارِ قبر میں مُبتلا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"نعم !انه کان فی خلقه مع اهله سوء"

''جی ہاں! سعد اس لیے فشارِ قبر میں مبتلا ہوا کہ اپنے اہل خاندان کے ساتھ اس کے اخلاق اچھے نہیں تھے۔''[1]

روایات کے مطابق کچھ اور عوامل ہیں جو فشارِ قبر کا سبب بن سکتے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے۔

"عن النبی قال!ضغطة القبر للمومن کفارة لما کان منه من تضیع النعم۔"

''یعنی رسول پاکؐ فرماتے ہیں کہ فشارِ قبر مومن کے لیے ان نعمتوں کے ضائع کر دینے کا کفارہ ہوتا ہے جن کی اُس نے دُنیا میں قدردانی نہیں کی۔[2]

---

[1] امالی صدوق ص ۲۳۱

[2] امالی صدوق ص ۳۲۲

ناجائز کاموں کا کفّارہ:

سوال قبر: منجملہ ان مطالب کے جو پیشوایان اسلام نے متعدد روایات کے ضمن میں بیان فرمائے ہیں اور جن کا غیبی اور اعتقادی پہلو ہے وہ ہے قبر کا سوال: جیسا کہ احادیث میں بتایا گیا ہے کہ قبر میں جن بنیادی چیزوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا وہ خدا، دین الٰہی، پیغمبر خداؐ اور امام برحق ہیں۔قبر میں پُوچھا جائے گا کہ تیرا خدا کون ہے، تیرا دین کیا ہے؟ تیرا نبی کون ہے؟ اور تیرا امام کون ہے؟ صاحب ایمان لوگ بڑے اطمینان کے ساتھ صحیح جواب دیں گے۔

قبر میں مومنین کی جزا:

"فیناوی منادٍ من السمآء صدق عبدی افرشوا له فی قبره الجنة وافتحوا له فی قبره بابا الی الجنة والبسوه من ثباب الجنة حتی یاتینا وما عندنا خیر له۔"

''تو آواز آئے گی میرے بندے نے سچ کہا ہے، اس کی قبر میں بہشت کا بستر بچھا دیجیے۔ اس کی قبر میں بہشت کا دروازہ کھول دیجیے، اور بہشت کا لباس اس کے زیب تن کیجیے اور قیامت تک اسے اس کی حالت پر رکھا جائے۔ یہاں تک کہ قیامت قائم ہوجائے اور میرے پاس پہنچ جائے گا۔ اور ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ اس کے لیے اس سے کئی درجے بہتر ہے۔''

بے ایمان لوگوں کی سزا:

یہی سوالات کفار اور بے ایمان لوگوں سے بھی کیا جائے گا تو وہ ان سوالات کا صحیح جواب نہیں دیں گے تو آواز آئے گی میرے بندے نے جھوٹ بولا اور خلاف واقعہ بات کی ہے۔

''افرشوالہ فی قبرہ من النار والبسوہ من ثباب النار وافتحوالہ بابا الی النار حتی یاتینا وما عندنا شر لہ۔''

''اس کی قبر میں آگ کا بستر بچھا دیجیے اس جہنمی لباس پہنا دیجیے اور اس کے لیے جہنم کا ایک دروازہ کھول دیجیے، یہاں تک کہ قیامت قائم ہوجائے اور ہمارے پاس پہنچ جائے اور جو کچھ ہمارے پاس اس لیے موجود ہے وہ اس سے کئی درجے بدتر ہے۔''[1]

---

[1] کافی جلد ۳ صفحہ ۲۳۹

سوال قبر کے بارے میں:

بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قبر میں تمام لوگوں سے سوال نہیں کیے جائیں گے، بلکہ ان کا تعلق صرف دو قسم کے لوگوں سے ہوگا، ایک خالص مومنین سے اور دوسرے خالص کفار سے جیسا کہ ابی بکر حضرمی کہتے ہیں۔

"قلت لابی جعفر علیه السلام اصلحك الله من المسولون فی قبورهم؟قال من محض الایمان ومن محض الکفر، قلت فبقیة هذا الخلق؟قال یلهی والله عنهم مایعبائهم۔"

''میں نے امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا، کن لوگوں سے قبر میں سوالات کیے جائیں گے؟ تو آپ نے فرمایا، خالص مومنوں اور خالص کافروں سے! میں نے پُوچھا تو دوسرے لوگوں کی کیا حالت ہوگی؟ فرمایا انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے گا اور ان سے کچھ نہیں پُوچھا جائے گا۔''[۱]

قبر میں خالص مومنین اور خالص کفّار سے سوال کیا جائے گا:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"انما یسئل فی قبره من محض الایمان محضاً ومحض الکفر محضاً واما ماسوی ذالك فیلهی عنهم۔"

''یعنی قبر میں خالص کافروں سے سوال ہوگا اور دوسرے لوگوں کو چھوڑ دیا جائے گا۔[۲]

امام محمد باقرؑ کی زرارہ سے گفتگو اور چند لوگوں کے بارے میں خاص ہدایت:

جو لوگ خالص ایمان یا خالص کُفر نہ رکھنے کی وجہ سے معاف ہیں اور ان سے قبر میں سوال نہیں کیا جائے گا، وہ کئی قسم کے لوگ ہیں، حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے ایک روایت کے ضمن میں اس قسم کے لوگوں کی نشاندہی کی ہے۔ زرارہ کہتے ہیں کہ میں اور حمران حضرت امام باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میں نے عرض کی:

"انا نمدالطمار فمن وافقنا من علویٰ وغیره تولیناه ومن خالفنا من

---

[۱] کافی جلد ۳ ص ۲۳۷

[۲] کافی جلد ۳ ص ۲۳۵

علوی اوغیرہ برئنا فقال لی یازرارۃ قول اللہ اصدق من قولك فاین الذین الذین قال اللہ عزّوجل "الا المستضعفین من الرّجالِ والنسآء والولدن لَایستطیعونَ حیلَةًحِیلَةً ولایھتدوُن سبیلاً؟" سُورہ ۴ آیت ۹۷ این المرجون لامر اللہ؟ این الذین خلطوعملا صالحًا وآخر سئیاً این صاحب الاعراف؟ این المولفة قلوبھم۔"

''ہم افکار واعمال کی رسی کو کام میں لاتے ہیں اور لوگوں کے عقائد واعمال کو اسی معیار پر پرکھتے ہیں۔ جوشخص ہم سے موافق ہوتا ہے خواہ وہ علوی سید ہو یا غیر علوی اور عام آدمی ہم اسے اپنا دوست بنا لیتے ہیں اور جوشخص ہم سے مخالف ہوتا ہے ہے،ہم اس سے دُور ہوجاتے ہیں خواہ وہ علوی ہو یا غیر علوی۔امامؑ نے فرمایا زرارہ! خدا کا فرمان تمہاری باتوں سے زیادہ سچّا اور حقائق کے زیادہ مطابق ہے۔اگر تمہاری بات صحیح مان لی جائے تو پھر مستضعف مرد اور عورتیں کہاں جائیں گے جو اپنی سعادت کی راہوں تک رسائی نہیں پا سکتے اور خود کو استضعفاف سے چھٹکارا نہیں دلا سکتے؟ وہ لوگ کہاں جائیں گے جن کے انجام کا کوئی پتہ نہیں اور اُنہیں خدا کے امر کی اُمید وانتظار کرنی چاہیے؟ وہ لوگ کہاں جائیں گے جنہوں نے اپنے اچھے اور بُرے کاموں کو آپس میں ملادیا ہے اور اُنہیں اپنے انجام کی کوئی خبر نہیں؟ اعراف والے لوگوں کا کیا ہوگا؟ مولفة القلوب کا کیا بنے گا؟ جن کی مالی امداد کی جائے تاکہ اُن کے دل حق سے مانوس ہوں اور دین کی طرف مائل ہوں۔'' [1]

کم فکر والے مستضعف افراد:

ان طبقات کی بہتر شناخت کے لیے یہاں پر بعض روایات کی مدد سے قدرے تفصیل سے گفتگو کی جاتی ہے۔مستضعف: کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کا استضعاف ان کی طبعی ساخت پر مبنی ہوتا ہے اور اُن کی فکری نارسائی اور ادراک کی کوتاہی کا نتیجہ ہوتا ہے، چنانچہ زرارہ کہتے ہیں'' میں نے امام محمد باقر علیہ السّلام سے مستضعفین کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ تو امام نے فرمایا:

"ھوالذی لایھتدی حیلة الی الکفر فیکفر ولایھتدی سبیلا الی الایمان،

[1] کافی جلد ۲ صفحہ ۳۸۲ و ۴۰۴

لا یستطیع ان یومن ولا یستطیع ان یکفر فھم الصبیان ومن کان من الرجال والنسآء علی مثل عقول الصبیان مرفوع عنھم القلم۔"

''یعنی مستضعف وہ ہوتا ہے جسے نہ کفر کا پتہ ہوتا ہے اور نہ ہی ایمان کا، نہ تو وہ مومن بن سکتا ہے اور نہ ہی کافر۔ اور وہ اطفال کا گروہ ہے اور ان عورتوں اور مردوں کا گروہ ہے جن کی عقلیں بچوں کی مانند ہوتی ہیں اور ایسے ہی لوگوں سے تکلیف کا قلم اُٹھالیا گیا ہے۔''[1]

جولوگ نہ مومن ہیں نہ کافر:

کچھ مستضعف لوگ وہ ہوتے ہیں جن کی عقلی طاقت طبعی ہے، ادراک وافکار کی قلت کا شکار بھی نہیں ہیں، ایسے افراد کو اگر آزاد ماحول مل جائے اور اپنے ارادے میں مصّمم ہوں تو راہ راست کو اختیار کرسکتے ہیں اور پُوری معرفت کے ساتھ خداوند متعال اور اس کی تعلیمات پر ایمان لا سکتے ہیں اور گمراہی کا رستہ اختیار کر کے ایمان کو چھوڑ کر کفر کی راہ کو بھی اپنا سکتے ہیں، لیکن خود غرض متکبرین اور زور وزر کے مالک اُنہیں کمزور اور ناچیز سمجھتے ہیں، ان کی شخصیت کو پامال کرتے ہیں اور اُن کی دینی وعلمی سرگرمیوں کے آڑے آتے ہیں۔ ایسے افراد استضعاف اور خود غرض متکبرین کے پنجہ میں ہونے کی وجہ سے نہ تو ایمان کی نعمت سے بہرہ مند ہیں اور نہ ہی کفر کو اپنائے ہوئے ہیں، یعنی نہ مومن ہیں اور نہ کافر۔ جیسا کہ حمران کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السّلام سے مستضعفین کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا:

"ھُم لیسوا بالمومنین ولا بالکفار فھم المرجون لامر اللہ۔"

وہ تو نہ مومن ہیں اور نہ ہی کافر بلکہ امر خدا کے انتظار میں ہیں۔

جو مستضعفین طبعی ساخت کی بنا پر عقل وہوش کی کمی کا شکار نہیں بلکہ اُن کا استضعاف صرف متکبرین کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اُن کے دو گروہ ہیں۔

پہلا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو اپنے آپ کو استضعاف سے نجات دلانے پر قادر ہیں اور بے ایمان متکبرین کے اثر ورسُوخ کے علاقہ سے باہر جا سکتے ہیں اور ایسے ماحول میں جا کر زندگی بسر کر سکتے ہیں جہاں پر اُن کے لیے معارف الٰہی حاصل کرنا آسان ہو اور سعی وعمل کی روشنی میں خود کو ایمان کے گراں قیمت سرمایہ سے مالا مال کر سکتے ہیں۔

---

[1] کافی جلد ۲ صفحہ ۳۸۲ و ۴۰۴

غلط ماحول میں پھنسے ہوئے افراد:

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کے ماحول میں نہ تو کوئی عالم موجود ہے جس سے وہ خدائی تعلیمات حاصل کر سکیں، اور نہ ہی اپنے لیے کوئی راہِ حل نکال سکتے ہیں کہ جس سے اُنہیں متکبرین کے غلط ماحول سے نجات مل سکے اور وہ کسی مناسب ماحول کی طرف ہجرت کر جائیں۔ قرآن پاک نے ایک ہی آیت کے ضمن میں ایسے دونوں گردہوں کی صورتِ حال کو بیان کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَفّٰىهُمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَالُوۡا فِیۡمَ كُنۡتُمۡ ؕ قَالُوۡا كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ قَالُوۡۤا اَلَمۡ تَكُنۡ اَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوۡا فِیۡهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاۡوٰىهُمۡ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتۡ مَصِیۡرًا ﴿۹۷﴾ اِلَّا الۡمُسۡتَضۡعَفِیۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالۡوِلۡدَانِ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ حِیۡلَةً وَّلَا یَهۡتَدُوۡنَ سَبِیۡلًا ﴿۹۸﴾ فَاُولٰٓئِكَ عَسَی اللّٰهُ اَنۡ یَّعۡفُوَ عَنۡهُمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوۡرًا ﴿۹۹﴾

''جن لوگوں کی موت کے فرشتے رُوح قبض کرتے ہیں جبکہ وہ لوگ اپنے نفسوں پر ظُلم کیا کرتے تھے، اُن سے وہ فرشتے پُوچھیں گے تم نے کیسی زندگی گزاری ہے؟ تو وہ جواب دیں گے ہم اپنی زندگی کے ماحول میں مستضعف تھے اور ہمیں کسی قسم کا ارادہ اختیار حاصل نہیں تھا تو فرشتے کہیں گے کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی تم اس میں ہجرت کر جاتے اور خود کو شرک کے ماحول سے بچاتے؟ ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔[۱]

جن کا عُذر قابلِ ہے:

''لیکن مردوں، عورتوں اور بچّوں کا وہ گروہ جو دُنیا میں حقیقی معنوں میں مستضعف تھے اور متکبرین کے تسلط سے خود کو نہیں چھڑا سکتے تھے اور اپنی نجات کا کوئی رستہ نہیں پاتے تھے، ان کا عُذر خدا کی بارگاہ میں معقول ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ خدا اُنہیں اپنی رحمت کے شاملِ حال کر کے اُنہیں بخش دے، کیونکہ خدا بڑا بخشنے والا اور معاف کرنے والا ہے۔[۲]''

---

[۱] سورہ نساء۔

[۲] سورہ ۴ آیات ۹۷ تا ۹۹

دین کونہ جاننے والے موحّدین:

جن لوگوں کے بارے میں خدا کی رحمت یا عذاب کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہے اور اُن کا انجام نامعلوم ہے اُنہیں امرِ الٰہی کا انتظار کرنا پڑے گا جیسا کہ امام محمد باقر علیہ السلام سے ''وآخرون مرجون الامر اللہ'' (سُورہ ۹ آیت ۱۰۶) کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

''قوم كانوا مشركين فقتلوا مثل حمزة وجعفر واشاهما من المومنين ثم انهم دخلوا فى الاسلام فوحد والله وتركو الشرك ولم يعرفوا الايمان بقلوبهم فيكونوا من المومنين فتجب لهم الجنة ولم يكونوا على جحود هم فجب فيكفر وافتجب لهم النار فهم على تلك الحال ''إما يعذبهم واما يتوبُ عليهم.''

''اس سے مراد مُشرک لوگ ہیں جنہوں نے حمزہ اور جعفرؑ جیسے عظیم لوگوں کو شہید کیا پھر وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اور توحید کا اقرار کیا لیکن ایمان کو کما حقہ نہیں پہچانا اور اس کی قلبی معرفت حاصل نہیں کی تا کہ اُن کا حقیقی معنوں میں شمار ہو اور بہشت کے مستحق قرار پائیں، اور ایسے ہی وہ اپنے شرک والحاد پر باقی نہیں رہے تا کہ اُن کا شمار کفار میں ہو اور عذاب کے مستحق قرار پائیں اور وہ اپنی اس کیفیت کی وجہ سے نامعلوم انجام کے حامل ہیں۔

اُنہیں امرِ الٰہی کا منتظر رہنا ہوگا، ہوسکتا ہے کہ وہ انہیں عذاب دے اور ہوسکتا ہے اُنہیں رحمت میں داخل کر دے۔''[۱]

اصحاب اعراف:

اصحابِ اعراف یا وہ لوگ جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہیں ان کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے پُوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

''قوم استوت حسناتهم وسئياتهم فان ادخلهم النار فبذنوبهم وان

---

[۱] کافی جلد ۳ ص ۴۰۷

ادخلهم الجنة فبرحمة۔"

"یہ وہ لوگ ہیں جن کی اچھائیاں اور بُرائیاں برابر ہیں۔ اگر خدا اُنہیں جہنم میں پھینک دے تو یہ اُن کے اپنے گناہوں کی وجہ سے ہوگا اور اگر بہشت میں بھیج دے تو یہ اس کی رحمت کی بنا پر ہوگا۔"[۱]

جن لوگوں کی مالی لحاظ سے اعانت کی جائے اور اخلاقی لحاظ سے اُن کے ساتھ پیار ومحبت کیا جائے تاکہ اس طرح سے وہ حق کی راہ اختیار کریں اور خدا کے دین کی طرف جھکاؤ پیدا کریں۔ ان کے بارے میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"المولفة قلوبهم قوم وحدوالله وخرجوا من الشرك ولم تدخل معرفة محمد رسُول الله قلوبهم وماجآء به فتالفهم رسُول الله وتالفهم المومنون بعدرسول الله يكمايعرفوا۔"

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے توحید کا اقرار کیا اور شرک سے باہر نکلے، لیکن نہ تو اُن کے دل میں رُسول خدا کی معرفت جاگزیں ہوئی اور نہ ان چیزوں کو تسلیم کیا جو خدا کی طرف سے رُسولؐ خدا پر نازل ہوئی ہیں۔ اسی لیے پیغمبر خدا اپنی مہربانی سے انکے دلوں کی تالیف فرمایا کرتے تھے اور پیغمبرؐ کے بعد مومنین نے بھی اسی طریقے کو اپنایا تاکہ بالتدریج وہ پیغمبر اور اُن پر نازل ہونے والی چیزوں کو پہچان سکیں۔"[۲]

تو اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ چند گروہ ایسے ہیں جن کا شمار نہ تو خالص مومنین میں ہوتا ہے اور نہ ہی خالص کافرین میں اور پیشوایان دین سے بیان شُدہ روایات کے مطابق قبر میں ان سے سوال نہیں کیے جائیں گے، کیونکہ ان میں سوالات کی شرائط نہیں پائی جاتیں اور ان کا معاملہ خدا کے سُپرد ہے وہ بروز قیامت جو چاہے ان کا فیصلہ کرے گا۔

قبر سے کیا مراد ہے:

جو بات یہاں پر شایانِ توجہ ہے وہ ہے قبر کی معرفت۔ یعنی ہم یہاں پر یہ بات جاننے کی کوشش کریں گے کہ جو قبر اپنے اندر مدفون شخص کو فشار دے گی اور خالص مومنین اور خالص کفار سے وہاں پر سوالات ہوں گے۔ جو قبر یا تو بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ سے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے، وہ کون سی قبر ہے؟ آیا زمین میں کھودا ہوا یہی گڑھا

---

[۱] تفسیر صافی ص ۱۹۳

[۲] کافی جلد ۲ ص ۴۱۲

جیسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں یا کوئی نامشہور اور غیر مرئی حقیقت ہے جس کا کسی اور عالم سے تعلق ہے؟

علامہّ مجلسی کا فرمان:

عالم عالی مقام، محدث عالی قدر، محقق بزرگوار خدمت گار مکتب اہلبیت علیہم السلام یعنی علامہّ علی رضوان اللہ علیہ نے بقاء روح، عالمِ برزخ، سوال قبر، فشار قبر وغیرہ کے بارے میں مذکورہ آیات واحادیث کو نقل کرنے کے بعد ''فذلکۃ'' کے عنوان سے یوں نتیجہ نکالا ہے:

"اعلم ان الذی ظهر من الایات الکثیرة ولاخبار المستفیضة والبراهین القاطعة هوان النفس باقية بعد الموت امامعذبة ان کان ممن محض الكفر اومتنعمة ان کان ممن محض الایمان اویلهی عنه ان کان من المستضعفین......ثم يتعلق الروح بالاجساد المثالية اللطيفة المضاهية فی الصورة الابدان الاصليةفينعم وبعذب فیها ولا یبعدان يصل اليه الآم ببعض مايقع علی الابدان الاصلية بسق تعلقه بها وبذالك یستقیم جمیع ماوردمن ثواب القبر وعذابه واتساع القبر وضیقه وطيرانه فی الهوآء وزيارته لاهله ورويته الائمة باشكالهم ومشاهدة اعدائهم معذبين وساير ماوردفی امثال ذالك فالمرادبالقبرفی اکثر الاخبار مایکون الروح فیه فی عالم البرزخ وهذايتم علی تجسم الروح وتجرده۔"

''یعنی آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بہت سی آیات روایات اور قطعی دلائل کی رُو سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی رُوح باقی رہتی ہے، یا تو معذب ہوتی ہے اگر خالص کُفر کی مالک ہو، یا نعمتوں میں ہوتی ہے اگر اس میں خالص ایمان ہو، یا پھر اسے اپنے حال پر باقی چھوڑ دیا جاتا ہے اگر مستضعفین سے ہو......پھر یہی رُوح لطیف مثالی جسم سے متعلق ہوجاتی ہے جو ظاہر میں اصلی اور دنیاوی بدن سے مکمل طور پر مشابہ ہوتا ہے اور عذاب یا نعمتوں کا حصول بھی اسی مثالی جسم کے ساتھ متعلق ہوتے ہیں اور بعید نہیں ہے جو تکلیفیں اصل بدن کو ہوتی ہیں رُوح بھی ان سے متاثر ہو، کیونکہ

موت سے قبل رُوح کا اس جسم سے تعلق رہا ہے۔

پھر فرماتے ہیں، قبر کا ثواب وعذاب اور وسعت وتنگی رُوح کی ہوا میں پرواز، اہل خاندان کا دیدار، آئمہ معصومینؑ کی اصلی صورت میں زیارت آئمہ کے دُشمنوں کو عذاب میں معذب دیکھنا وغیرہ کہ جن کا ذکر روایات میں آیا ہے سب سچ ہے اور معیار عقل پر پُورا اترتا ہے پس روایات کی رو سے قبر سے مراد، عالم برزخ میں رُوح کی قرارگاہ ہے خواہ ہم رُوح کو جسم لطیف مانیں یا اس کے تجرد کے قائل ہوں۔"[1]

مرحوم فیض کاشانی کے الفاظ:

محدث عالی قدر، حکیم الٰہی اور محقق بزرگ مرحوم فیض کاشانی نے بھی اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں بیان کیا ہے۔

"وقد تبین ان اھل کُل نشاۃ انما یدرك الموجودات التی فیھا علی سبیل المشاھدۃ والتی فی غیرھا علی سبیل الحکایۃ فشھادۃ کل نشاۃ غیب فی اخریٰ وعیانھا علم وخبر فی غیرھا الناس نیام اذاما تو انبتھوا "فالصور الدنیا ویۃ الی الاخر دیۃ کالصور المنامیۃ الی الانتباھیۃ۔ ومن ھنا یظھر انہ لایلزم ان یشاھد تلك الامور فی القبر بھذہ الآلات الجسدانیۃ لانھا من نشاۃ الاخریٰ ومن یشاھدھا فی الدنیا فذاك من ظھور سلطان الاخرۃ علیہ کمایشاھد النبی جبریل ولا یشاھدہ غیرہ من الحاضرین۔"

"یعنی یہ بات واضح ہے کہ ہر نشاۃ اور عالم کے لوگ اس عالم کو بطور مشاہدہ درک کرتے ہیں، جبکہ دوسری نشاۃ کے لوگ اسے بطور حکایت ونقل کے درک کرتے ہیں۔ پس ہر عالم کی مشہود چیزیں دوسرے عالم کے لیے غیب کی حیثیت رکھتی ہیں، اس کا عیان دوسرے عالم کے لیے خبر کی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ پیغمبرؐ کا یہ فرمان کہ "لوگ سوئے ہوئے ہیں جب مریں گے تو بیدار ہوں گے۔" بھی اسی چیز کو موید ہے یعنی دنیاوی صُورتوں کو اُخروی صورتوں سے ہوتی ہے تو اس بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جو اُمور مرنے کے بعد قبر میں مردوں کو درپیش آتے ہیں ضروری نہیں ہے تو اس بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جو اُمور مرنے کے بعد قبر میں مردوں کو درپیش آتے ہیں ضروری نہیں ہے کہ

---

[1] بحار الانوار جلد ۳ ص ۱۶۷

ہم اُنہیں اپنی آنکھوں سے بھی دیکھیں یا اپنے کانوں سے سُنیں، کیونکہ قبر کا تعلق ایسے عالم سے ہے جو عالم دُنیا سے مختلف ہے اور اگر کوئی شخص دنیا میں عالم آخرت کی چیزوں کو دیکھتا بھی ہے تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں عالمِ آخرت کا تسلطّ اُن کے لیے عیاں ہوتا ہے جیسا کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جبرئیل کو دیکھا کرتے تھے لیکن دوسرے لوگ اسے نہیں دیکھ پاتے تھے۔"[1]

کائنات کو ایک حیثیت کا حامل سمجھا جاتا ہے:

سائنسی ترقی اور مادی علوم کی پیش رفت نے آج کے دور مین دُنیا بھر کے بہت سے لوگوں کو علمی لحاظ سے مغرور کر دیا ہے وہ غیر محسوس حقیقتوں کو تسلیم نہیں کرتے، اور اس کائنات کو مادہ کے سوا کچھ نہیں سمجھتے، ان میں سے کچھ لوگ تو ایسے بھی ہیں جو ماوراءِ طبیعت کا کھلم کھُلا انکار کرتے ہیں اور دُنیا کی ہر موجود چیز کی ہست وبود کو مادہ کے برابر سمجھتے، ہیں۔ اور کچھ لوگ ماوراء طبیعت کی طرف توجہ نہیں کرتے اور اسے قطعاً اہمیت نہیں دیتے۔

یہ دونوں گروہ عالم کی ہر چیز کو اور کائنات میں رونما ہونے والے تمام واقعات کو علتوں کا معلول اور عوامل مادی کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ہر حقیقت کو طبعی معیار پر پرکھا جانا چاہیے، جو بات اس معیار پر پُوری نہ اُترے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اسی لیے وہ خالقِ کائنات، جاودانی رُوح، فرشتوں کے وجود، انبیاء کی وحی، مرنے کے بعد عالم، قیامِ قیامت، غرض جو کچھ بھی خدائی ادیان میں مذکورہ ہے لیکن ان کے مادی معیار پر پُورا نہیں اُترتا سب کی نفی کرتے ہیں۔

جن حقائق تک رسائی حاصل نہیں ہوسکی:

اُنہیں کہنا چاہیے کہ آیا آج کا انسان علم کے آخری درجے تک پہنچ چُکا ہے؟ علم دانش کے تمام مراحل کو طے کر کے تمام چیزوں کو حقیقتوں تک رسائی حاصل کر لی ہے؟ آیا آج کا انسان اسی حد تک پہنچ چُکا ہے کہ اگر اُس نے کسی چیز کو موجود معیار کے مطابق نہ پایا تو اُسے حق حاصل ہے کہ اُسے غیر واقعی کہہ دے اور قطعی طور پر اس کا انکار کر دے؟ آیا یہ امکان نہیں ہے کہ کل کے انسان کو کچھ ایسے حقائق کا پتہ چل جائے اور ایسے اسرار سے آگاہی حاصل ہو جائے کہ موجودہ معیار اُن کی شناخت سے عاجز ہیں اور آج کا انسان ان کے وجود سے بے خبر ہے؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ آج بھی عالمِ طبیعت اور مادی دُنیا میں کچھ ایسے مطالب اور مسائل موجود ہیں جن کا جواب آج کے علم کے پاس نہیں ہے، اور آج کے دانشور اپنی علمی منطق کی رو سے ان کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کر سکتے؟

---

[1] علم الیقین ص ۸۹۰

نا قابلِ عبور فکری بھول بھلیاں:

''لے کنٹ ڈونونی کہتے ہیں: جس طرح الیکٹرون E L E C T R O N کے پلٹنے والے ''ارتقا'' اور ایٹم ATOM'' جو کہ الیکٹرون سے مل کر بنا ہے۔'' کے ''ارتقا'' اور ایٹم اور حیات (جو کہ اٹیم سے وجود میں آئی ہے) کے نہ پلٹنے والے تکامل کے درمیان نا قابل عبور فکری بھول بھلیاں معلوم ہوتی ہیں۔ انسان اپنی ساخت کے لحاظ سے تو حیوان ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس دُنیا میں ایک نامعلوم مرکز سے ایسی سرشت اور خیالات لے کر آیا ہے جو خالص انسانی اور نہایت اہمیت کے حامل ہیں، یہی وجہ ہے کہ تمام ''ارتقائی نظریے'' انسانی طرزِ عمل کی وضاحت نہیں کر سکتے۔[1]

موت اور رُوح و بدن کی علیحدگی:

آپ سب حضرت جو اس مجلس میں تشریف فرما ہیں دو حیثیتوں کے حامل ہیں، ایک ظاہری اور دوسری باطنی ایک مادی اور دوسری معنوی، ایک رُوحانی اور دوسرے جسمانی، ایک محسوس اور دوسری غیر محسوس ایک مرئی (قابلِ رویت) اور دوسری غیر مرئی اور بعضوں دانشمندوں کی اصطلاح کے مطابق ایک ناسوت اور دوسری ملکوت۔ حیثیتیں آپس میں ملی ہوئی ہیں اور ہمارے جسم و رُوح آپس میں متحد ہیں، لیکن موت ان دونوں کو آپس سے جُدا کرے گی اور جسم کو رُوح سے علیحدہ کر دے گی۔

بعض لذتیں یا تکلیفیں یا خوشگوار اور ناخوشگوار حالات جو ہمیں نصیب ہوتے ہیں۔ بعض تو ہماری جسمانی حیثیت کے ہوتے ہیں اور مشہود و محسوس ہوتے ہیں اور کچھ رُوحانی حیثیت کے ہوتے ہیں اور غیر محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن صورتِ حال خواہ کچھ بھی ہو دونوں قسم کی خوشیاں بھی ہمیں ہی محسوس ہوتی ہیں جس سے ہم خوش ہوتے ہیں اور دونوں قسم کی تکلیفیں بھی ہمیں ہی محسوس ہوتی ہیں جن سے ہم پریشان ہوتے ہیں۔

مادی اور محسوس دباؤ:

فرض کیجئے کہ کسی شخص کو شکنجہ میں جکڑنے اور اس پر تشدد کرنے کے لیے اُسے شکنجہ کی مشین کے ذریعہ تشدد کا نشانہ بناتے ہیں تو وہ چیخ و پکار کرتا ہے اور اپنے کیفیت ظاہر کرتا ہے اور کہتا ہے مجھے سخت تکلیف ہو رہی ہے۔ جوں جوں شکنجہ بڑھتا جائے گا تکلیف اور درد میں اضافہ ہوتا جائے گا اور رفتہ رفتہ شکنجہ کے دباؤ کی وجہ سے اُس کی ہڈیاں چٹخنے لگیں گی، گوشت پوست

---

[1] سرنوشت بشر ص ۱۲۱

پسنے لگیں گے اور اعصاب ورگیں پسنے لگین گی، آخر کار وہ نہایت ہی دردناک، رقت بار اور دلخراش حالت میں موت سے ہمکنار ہوجائے گا۔

معنوی اور غیر محسوس دباؤ:

ایک اور فرض یہ ہے کہ کسی نیک، پاک دل اور حسّاس شخص پر معاشرے میں ناجائز طور پر سنگین تہمت لگائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ ناکردہ گناہ کی بنا پر معاشرے میں قابلِ نفرت اور مطرود ہوجاتا ہے، اور وہ بھی عوامی ردّعمل کی بنا پر گوشہ نشینی اختیار کرلیتا ہے، شہر کو ترک کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے اور آبادی سے بہت دُور جاکر رہائش اختیار کرلیتا ہے، اگر اس موقع پر اس کا کوئی دوست اسے ملنے کے لیے جائے اور اس سے حالات دریافت کرے تو وہ یہی کہے گا کہ میں تو سخت پریشان ہوں۔ شکنجوں میں جکڑا ہوا ہوں، دُنیا مجھ پر تنگ ہوگئی ہے، تکلیف اور مصائب کی وجہ سے زندگی سے تنگ آ گیا ہوں، موت آجائے تو بہتر ہے، ممکن ہے یہ اندرونی تنگی رفتہ رفتہ بڑھتی رہے اور اسے اس حد تک بےقرار اور بےآرام کردے اس سے ہر قسم کا آرام رُخصت ہوجائے نیند تک نہ آئے، آخر سخت رُوحانی شکنجے اور باطنی پریشانی کی وجہ سے اس کی زندگی کا چراغ گُل ہوجائے اور وہ عالمِ آخرت کو رہسپار ہوجائے۔

محسوس اور غیر محسوس شکنجے:

مذکورہ دونوں قسم کے انسان تنگی اور شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے اور دونوں ہی نے اسی وجہ سے دُنیا کو خیر باد کہا ہے، البتہ اس فرق کے ساتھ کہ پہلے قسم کے شخص کی تنگی اور دباؤ ظاہری تھے جب کہ دوسری قسم کے شخص کی تنگی اور دباؤ باطنی تھے۔ پہلے کا شکنجہ مشہود اور ظاہر تھا جبکہ دوسرے کا غیر مشہود اور باطنی، پہلا شخص ان سخت شکنجوں کی وجہ سے دُنیا سے رُخصت ہوا جو اس کے جسم پر وارد ہوئے جن کی وجہ سے اس کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور عضلات ورگیں پائمال ہوگئیں جب کہ دوسرا شخص جسمانی شکنجے میں جکڑا ہوا نہیں تھا، بلکہ کھُلی فضا میں مکمل آزادی کے ساتھ رہ رہا تھا، لیکن روحانی دباؤ اور اندرونی بےچینی کی وجہ سے فکری پریشانی اور زبردست باطنی تکلیف کا شکار ہوتا تھا جس کی وجہ سے اس کا قرار اور چین ختم ہوگیا اور اس باطنی کیفیت نے اس کے توازن کو اس حد تک بگاڑ دیا کہ وہ دُنیا سے رُخصت ہوگیا۔

مذکورہ تصریحات سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ جو قبر روایات کے مطابق یا بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ یہ ظاہری و مشہود اور محسوس گڑھا نہیں جسے قبرستان میں کھودا جاتا ہے بلکہ علامہ مجلسی کے فرمان کے مطابق اور پیشوایانِ دین کے بقول قبر سے مراد عالمِ برزخ میں رُوح کی قرار گاہ ہے، اسی طرح فشارِ قبر

سے مراد یہ نہیں ہے کہ گورستان میں کھودی ہوئی قبر کے کنارے آپس میں مل جائیں گے اور متوفی کے جسم کو پیس ڈالیں گے بلکہ اس سے مراد بھی غیر مرئی اوران دیکھا فشار ہے جو برزخی قبر میں متوفی کے برزخی جسم پر وارد ہوتا ہے اور اُسے سخت بے چین اور بے قرار کردیتا ہے۔

فشارِ قبر سے مراد:

مرنے کے بعد کے عالم اور آخرت کے ثواب وعذاب کے بارے میں بہت سی آیات اور روایات ملتی ہیں، جن سے بہت سی آیات وروایات مادی نقطہ نظر اور ظاہری حساب وکتاب کے لحاظ سے ہمارے لیے قابلِ حل نہیں ہیں۔ اگر انسان اپنی حد حدود کو پہچانے اور اپنی نارسا عقل وفہم کو حقائق کو پہچاننے کا معیار قرار نہ دے، اور جس چیز کے متعلق نہیں جانتا اس کے بارے میں لب کشائی نہ کرے تو کُفر والحاد کا شکار نہیں ہوگا، راہِ حق سے منحرف نہیں ہوگا اور اپنے آپ کو عذابِ الٰہی کا مستحق نہیں بنائے گا۔ جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"لو ان العباد اذا جھلوا وقفوا ولم یجحدوا لم یکفروا"

''خدا کے بندے جس چیز کو نہیں جانتے اگر وہ اس کے بارے میں خاموشی اختیار کرلیں اور اُسے نہ جھٹلائیں تو کُفر اور بے دینی میں مُبتلا نہیں ہوں گے۔''[1]

---

[1] کافی جلد ۲ ص ۳۸۸

مجلس 8

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کَلَّا ؕ اِنَّہَا کَلِمَۃٌ ہُوَ قَآئِلُہَا ؕ وَمِنۡ وَّرَآئِہِمۡ بَرۡزَخٌ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾ (المومنون)

برزخ یا مرنے کے بعد کا عالم:

انبیاءعظام کے آفاقی مکتب کی رُو سے دنیاوی زندگی کے خاتمہ اور موت کے آجانے پر انسان کی رُوح اس کے بدن سے جُدا ہوکر عالمِ برزخ میں منتقل ہوجاتی ہے............اور اس جہان میں اپنی زندگی کو جاری رکھتی ہے۔ اگر متوفی نیک اور پارسا لوگوں میں سے ہے تو اپنے اچھے اعمال کی جزا پائے گا اور اس عالم میں نعمتوں سے بہرہ ور ہوگا اور اگر بُرے اور گناہگاروں میں سے تھا تو اپنے غلط کاموں کی وجہ سے عذاب میں مُبتلا ہوگا۔ اور یہی صورتِ حال قیامِ قیامت تک برقرار رہے گی اور جب قیامت قائم ہوجائے گی تو سب لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے اور اپنے حساب وکتاب کے لیے عدلِ الٰہی کی بارگاہ میں پیش ہوں گے۔

برزخ کا ثواب وعقاب:

لُغت عرب میں دو چیزوں کے درمیانی فاصلے کو ''برزخ'' کہتے ہیں۔ اور چونکہ مرنے کے بعد کا عالم دُنیا کی عارضی زندگی اور عالمِ جاودانی کی زندگی کے درمیان حدِ فاصل ہے، لہٰذا قرآنی آیات اور دینی رہنماؤں کی روایات میں اسے ''عالمِ برزخ'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"البرزخ القبر وھو الثواب والعقاب بین الدنیا والآخرۃ۔"

''یعنی برزخ قبر ہے اور وہ دُنیا اور آخرت کے درمیان ثواب اور عذاب ہے۔''[1]

شُہدأ کی جزا:

عالم برزخ میں مومن اور نیک لوگوں کو جزا اور ثواب، اسی طرح بے ایمانی اور گناہگار افراد کی سزا وعذاب کے بارے میں بہت سی آیات اور روایات مذکور ہیں، اور یہاں پر قرآن کی ایک آیت اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک

---

[1] مجمع البحرین (مادہ برزخ)

حدیث پر اکتفا کیا جاتا ہے، ارشاد رب العزت ہے۔

"ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً بل احیاءٌ عند ربھم یُرزقون۔ فرحین بما اتیھم اللہ من فضلہٖ ویستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم من خلفھم الا خوفٌ علیھم ولا ھُم یحزنونَ۔

"جو لوگ خدا کی راہ میں مار ڈالے گئے اُنہیں مُردہ گمان نہ کرو بلکہ وہ خدا کے نزدیک زندہ ہیں اور خدا کے رزق سے روزی پاتے ہیں، مسرور اور شادمان ہیں اس فضیلت پر جو اللہ نے اُنہیں عطا فرمائی ہے اور ان نیک دل لوگوں کو خوشخبری دیتے ہیں جو دُنیا میں اُن کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں اور جہاد کی راہ پر گامزن ہیں کہ اُن پر نہ تو کسی قسم کا خوف ہے اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔"[1]

مومنین کی ارواح اور برزخی بہشت:

ابوبصیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مومنین کی ارواح کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: "فی حجرات الجنة یاکلون من طعامھا ویشربون من شرابھا ویقولون ربنا اقم السّاعة۔"

"وہ بہشت کے حجروں میں مقیم ہیں، بہشت کی غذا کھا رہی ہیں اور بہشتی مشروبات نوش کر رہی ہیں اور خدا سے درخواست گزار ہیں کہ قیامت کو جلد برپا کرے تا کہ وہ اپنی آخری جزا کو حاصل کریں۔"[2]

قیامت سے پہلے عذاب:

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾

"آل فرعون کو بُرے عذاب نے گھیر رکھا ہے، وہ صبح شام آگ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں اور

---

[1] سورہ ۳ آیات ۱۲۹ تا ۱۷۰

[2] تفسیر برہان ص ۶۶۴

جب قیامت کا دن ہوگا تو فرشتوں سے کہا جائے گا کہ اُنہیں سخت ترین عذاب میں پہنچا دو۔'[۱] '

فرعون والوں کو قیامت میں عذاب:

اسی سلسلے میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"ذالك فی الدنیا قبل یوم القلیة لان فی النار القیامة لایکون غدووعشی ثم قال ان کانو یعذبون فی النار غدواوعشیا ففیما بین ذالك هم السعدآء لاولکن هذا فی البرزخ قبل یوم القیامة الم تسمع قوله عزوجل "یوم تقومُ الساعَةُ ادخل آلَ فرعون اشدَّ العذاب"

"صبح وشام کا یہ عذاب جو کہ آیت میں مذکور ہے، قیامت سے پہلے کے عذاب کی نشاندہی کرتا ہے، کیونکہ آتش قیامت میں صبح وشام کا وجود نہیں ہوگا۔ پھر فرمایا: اگر آل فرعون قیامت میں صبح، شام معذّب ہوں تو ان دونوں وقتوں کے درمیانی عرصے میں تو وہ بڑے خوش نصیب ہوں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ صبح شام کا یہ عذاب قیامت کے پہلے برزخ میں ہے۔ آیا تم نے خدا کا یہ فرمان نہیں سُنا جو وہ فرماتا ہے۔ قیامت کے دن حکم ہوگا کہ آلِ فرعون کو سخت ترین عذاب میں بھیج دو۔"[۲]

مکتبِ انبیاء کے مطابق عالم کے عمومی نظام میں باری تعالیٰ کی حکیمانہ قضا کا یہی تقاضا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی رُوح دوبارہ اس دنیا میں واپس نہ آئے اور اس جہان میں اپنی نئی زندگی کا آغاز نہ کرے بلکہ یونہی وہ وقتی طور پر عالمِ برزخ میں رہے یہاں تک کہ قیامت برپا ہوجائے اور وہ آخرت کی جاودانی منزل میں منتقل ہوجائے۔

تناسخ اور دانشمندوں کا ردّعمل:

ہندوستان اور چین میں صدیوں سے ایک نظریہ حکم فرما چلا آرہا ہے جس کا نام "نظریہ تناسخ (آواگون) ہے۔ اس نظریہ میں انبیاء کی فرمائش کے برخلاف دُنیا میں روح کی واپسی اور نئی زندگی کے آغاز کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ مُرورِ ایّام کے ساتھ اس نظریہ نے رفتہ رفتہ دُنیا کے بہت سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرالی اور لوگوں نے اسے ایک حقیقت سمجھنا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے تو اسے ایک مذہبی عقیدہ کی حیثیت سے قبول کرلیا۔ اس طویل

---

[۱] سُورہ ۴۰ آیات ۴۵ تا ۴۶

[۲] تفسیر مجمع البیان، مجلد ۷، ۸ ص ۵۲۶

عرصے کے دوران میں روئے زمین کے عظیم سکالروں نے اسے ہدفِ تنقید بنایا اور اپنی کتابوں میں اس کے باطل ہونے کے دلائل بھی بیان کیے۔

چونکہ تناسخ اور عودارواح (رُوح کی واپسی کا مسئلہ) برزخ اور مرنے کے بعد عالم سے مربوط ہے، علاوہ ازیں ابھی کچھ دن پہلے تہران کے ایک ہفت روزہ میں اس کے بارے میں کئی قسطوں پر مشتمل مقالات بھی لکھے جا چکے ہیں جن سے بعض نوجوانوں کے ذہنوں میں تشویش بھی پیدا ہوئی ہے لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی جائے۔

تناسخ اور دُنیا میں واپسی کا مسئلہ:

نظریہ تناسخ کے ماننے والوں کی طرف سے اس بارے میں جو کچھ کہا یا لکھا جا چکا ہے اس سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے چونکہ اس دُنیا میں عقائد وافکار کے لحاظ سے لوگوں کی مختلف قسمیں ہیں اسی طرح اخلاق اور اعمال کے لحاظ سے بھی وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، کچھ لوگ تو وہ ہیں جو سعادت کی سربلندیوں پر فائز ہیں۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو شقاوت وبدبختی کے گڑھوں میں پڑے ہوئے ہیں اور کچھ درمیانی درجات کے مالک ہیں، لازمی طور پر ان کی کیفیت بھی مختلف ہوتی ہے، اور اس لحاظ سے کہ آیا وہ مرنے کے بعد دوبارہ دُنیا میں لوٹ آئیں گے یا نہیں۔ ان کی کیفیت مختلف ہوتی ہے۔

ارتقاء پانے والے اور حدِ کمال تک پہنچنے والے سعادت مند:

حکیم سبزواری قدس سرہ نے ارتقاء پانے والے سعادت مند لوگوں کے بارے میں تناسخ کا عقیدہ رکھنے والوں کے نظریہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"ان الکاملین من السعداء یتصل نفوسھم بعد المفارقۃ بالملأ الاعلی وتنال من السعادۃ مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔"

"جو لوگ سعادت کی راہوں پر چل کر منتہائے کمال کو جا پہنچے ہیں مرنے کے بعد اُن کی ارواح ان پاک اور بلند درجات لوگوں سے جا ملتی ہیں جو اعلیٰ علیین میں موجود ہیں۔ اور اُنہیں ایسی بلند اور رفیع منزلت نصیب ہوتی ہے۔ جسے نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سُنا اور نہ ہی کسی کے دل میں اس قسم کا تصوّر پیدا ہوا ہے۔" [1]

---

[1] شرح منظومہ، ص ۳۱۳

خداؤں اور بزرگوں کی راہیں:

''مرنے کے بعد ارواح کے لیے دوراہیں ہوتی ہیں، جنہیں بالترتیب ''خداؤں کی راہ'' اور ''بزرگان ماسلف کی راہ'' کہا جاتا ہے۔ ''خداؤں کی راہ'' وہ راہ ہوتی ہے جسے عقلمند اور سمجھ دار لوگ اپناتے ہیں جو جنگلوں اور پہاڑوں کی عزلت گاہوں میں رہ کر اور دُنیا سے منہ موڑ کر حقیقت مطلقہ تک رسائی حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔ مرنے کے بعد یہ ارواح آگ کی طرف جاتی ہیں، پھر دن کی روشنی اور چاند کی آدھی روشنی کی طرف جاتی ہیں۔ اس کے بعد سال کی نیم روشنی میں پھر سُورج اور چاند کی جانب بڑھتی ہیں آخرکار خود برہمن کی بارگاہ میں جا پہنچتی ہیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ رُوح خداؤں کی جانب پرواز کے وقت روشن ترین علاقوں کی طرف گامزن ہوتی ہے اور جہاں ساری کائنات کی روشنیاں متمرکز ہوتی ہیں، روشنی کے یہ درجات ان مقامات پر واقع ہیں جہاں سے برہمن کی طرف جانے والے راستے گزرتے ہیں اور خود ''برہمن'' نوروں کا نور اور روشنیوں کی روشنی ہے۔''[1]

کمال مطلق کا حصّول:

تکمیل یافتہ اور ارتقاء کے آخری مراحل پر پہنچا ہوا سعادت مندوں کا یہ گروہ، مرنے کے بعد کمال مطلق تک رسائی حاصل کر لیتا ہے، غیر محدود نور کے ساتھ جا ملتا ہے اور حقیقی سربلندی اور سرفرازی کو پا لیتا ہے۔ ایسے سعادت مند افراد میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہوتی کہ دوبارہ دنیا میں لوٹ آئیں اور پھر سے اپنے اعمال کے ذریعہ اس کی کمی پُورا کریں۔

پست درجے کے شقی اور بدبخت افراد: سعادت مند اور ارتقاء یافتہ افراد کے برعکس کچھ ایسے پست درجہ کے لوگ بھی ہیں جو شقاوت اور بدبختی کی آخری حد تک پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی کبھی دنیا میں واپس نہیں لوٹ سکتے، کیونکہ وہ اپنی زندگی کے دوران گمراہی اور انحراف کے رستوں پر اس حد تک گامزن رہے کہ سعادت اور خوش بختی کی راہیں اپنے لیے مسدود کر دیں اور ابدی پستی کو اس حد تک اپنا لیا کہ وہ دُنیا میں دوبارہ واپس آ ہی نہیں سکتے تاکہ اپنی گزشتہ بداعمالی کی تلافی کر کے سعادت وکمال کے درجہ تک جا پہنچیں خواہ وہ کمال بالنسبۃ اور محدود ہی کیوں نہ ہو۔

انتہائی پستی اور بدبختی:

''مرنے کے بعد انسان کی رُوح توالد وتناسل اور تجدید حیات کے سلسلے کو طے کرتی ہے اور مسلسل ایک عالم سے

---

[1] ادیان ومکتبہائے فلسفی ہند، فلسفی ہند، جلد اوّل مطبوعہ تہران یونیورسٹی ص ۱۱۲

دوسرے عالم کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے اور توالد وتناسل کا یہ پے در پے سلسلہ غیر منتہی ہے اور ابدالا باد تک جاری رہے گا سوائے ایک خالص حالت کے اور وہ یہ کہ رُوح یا تو اعلیٰ علیین کے جاودانی مقام پر پہنچ کر ''برہما'' کے ساتھ وحدت تامہ حاصل کرے یا پھر اسفل السافلین جا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سرنگوں ہو جائے۔ [۱]

گناہگار اور شقی لوگوں کا ناقص گروہ: متوسط گروہ اور دنیا کی طرف بازگشت نظریہ تناسخ کے طرفداروں اور حامیوں کا عقیدہ ہے جب متوسّط گروہ کے افراد مرجاتے ہیں تو ان کی روح دوبارہ اس دُنیا میں لوٹ آتی ہے۔ اسی طرح ان کا یہ عقیدہ بھی ہے۔ ایسے افراد جن کے مختلف گروہ ہیں ان کے مختلف اخلاق وعادات بھی ہیں اور ان مختلف اخلاق وعادات کے لحاظ سے ہی وہ دُنیا میں مختلف اور گونا گوں میں صُورتوں میں عود کر آتے ہیں۔ اسی لیے اُنہوں نے ہر صُورت کا علیحدہ نام رکھا ہوا ہے، چنانچہ:

انسانی صُورت میں لوٹ آنے کو ''نسخ'' کہتے ہیں۔

حیوانی صورت میں لوٹ آنے کو ''مسخ'' کہتے ہیں۔

نباتات کے اندر انسانی رُوح کے حلول کر جانے کو ''فسخ''

جمادات کے ساتھ انسانی رُوح کے تعلق حاصل کر لینے کو ''رسخ'' کہتے ہیں۔

انسانی یا حیوانی صُورتیں:

''کرما کے مطابق ہر شخص اس دہقان کی مانند ہے جو اپنے بوئے ہوئے کو کاٹتا ہے اور اس کے اعمال، اقوال اور افکار اس کی روح میں اثر پیدا کرتے ہیں اور اسے اس طرح کی شکل میں تبدیل کرتے ہیں کہ تناسخ کی حالت یعنی بعد کی زندگی میں اسی مناسبت سے اپنی شکل وصُورت تبدیل کر لیتا ہے اور اسی نسبت سے ہی ایک نیا پیکر اختیار کر لیتا ہے۔'' جو لوگ اپنی زندگی میں اعمال صالحہ بجالاتے ہیں اور نیک چال چلن کے مالک ہیں، تو مرنے کے بعد اُن کی رُوحیں حسبِ مراتب برہمن، کھتری یا ویسیا عورت کے جیسی اچھی اور مستطاب عورتوں کے رحم میں چلی جاتی ہیں، لیکن بدکردار اور شریر لوگوں کو رُوحیں کتیا، بھیڑنی، سُورنی یا پھر اُچھوت قسم کی نچلے طبقے کی عوت کے رحم میں چلی جاتی ہیں۔'' [۲]

تکمیل طلب تناسخ:

تناسخ کے معتقدین کے مطابق بعض صُورتوں میں رُوح کی دُنیا میں واپسی، نقائص کی تلافی، تکمیل نفس اور علیٰ انسانی

---

[۱] تاریخ جامع ادیان ص ۱۰۵

[۲] تاریخ جامع ادیان۔ص ۱۰۶

مدارج کے حصول کے لیے ہوتی ہے۔ جناب فرید وجدی اس بارے میں کہتے ہیں:

"التناسخ هو مذهب بعض الاديان مراده ان الروح بعد مفارقتها لابدان تعود الى ابدان اخرىٰ حيوانية اوانسانية لتتم تكلمها وتستاهل الحياة بين الارواح العالية فى خطيرة القدس۔"

''تناسخ''، بعض ادیان کا مذہب ہے۔ اور خلاصہ کے طور پر وہ یہ ہے کہ رُوح بدن سے جُدا ہوجانے کے بعد کسی انسان یا حیوان کے بدن میں چلی جاتی ہیں وہ اس لیے تاکہ اپنے کمال کو پایہ تکمیل تک پہنچائے اور بہشت برین میں بلند ترین رُوحوں کے ساتھ رہنے کے قابل ہوجائے۔[۱]

مکتب اسلام میں تناسخ کی حقیقت

نیک کاموں کی انجام دہی اور اعلیٰ علیین میں بلند ارواح کے ساتھ رہنے کے لیے تگ ودو کی خاطر دُنیا کی طرف باز گشت مکتبِ اسلام کی رُو سے بھی اور آفرینش کے طرزِ عمل کے لحاظ سے بھی ناقابلِ قبول نظریہ ہے۔ اور قرآن مجید نے بڑی صراحت کے ساتھ اس نظریہ پر خط تنسیخ کھینچ دیا ہے۔

غلط سوچ:

بے باک اور جسور گناہگار جو دُنیا میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں کرتے اور خود کو شُتر بے مہار کی مانند ہر پابندی سے آزاد سمجھتے ہیں، جب موت اُن کے سر پر آئے گی، غیب کے پردے اُن کی آنکھوں کے آگے سے اُٹھا دیے جائیں گے اور وہ اپنا خطرناک انجام بچشم خود دیکھیں گے، تو پھر اُنہیں پتہ چلے گا تو اور سخت پریشان ہوں گے، لہٰذا وہ دوبارہ زندگی کی درخواست کریں گے اور کہیں گے ''پروردگار! تو حکم دے تاکہ ہمیں دُنیا کی طرف پلٹا دیں، تاکہ جو نیک کام ہم نے دُنیا میں انجام نہیں دیے تھے اُنہیں اپنی آئندہ زندگی میں انجام دیں اور اپنی پہلی ساری کمی پوری کریں۔'' تو جواب ملے گا:

كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿١٠٠﴾

''ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، یہ انہونی اور بے بُنیاد بات ہے کہ اس کے کہنے والا وہ خود انسان ہی ہے جس کے بارے میں خود بھی نہیں کیا جاسکتا اور ان کے مرنے کے بعد تا قیامِ قیامت عالم برزخ ہے۔''[۲]

---

[۱] دائرۃ المعارف فرید وجدی جلد نمبر ۱۰ صفحہ ۱۷۲

[۲] سورہ ۲۳ آیۃ ۱۰۰

سزا اور جزا:

تناسخ کا عقیدہ رکھنے والے لوگ اس کے ثبوت میں جو دلائل پیش کرتے ہیں ان میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ نیک لوگ اپنی زندگی میں نیک عمل انجام دینے کی پاداش اسی زندگی میں پالیں اور بُرے لوگوں کو اپنے غلط کاموں کی سزا بھی اسی دُنیا میں ملے۔

کتنے لوگ ایسے ہیں جو اس دُنیا میں مکمل شرافت اور انسانیت کی زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن ساری زندگی مختلف محرومیوں کا شکار بھی رہتے ہیں، ان کی زندگی فقر و تنگ دستی، دُکھ درد اور بیماریوں کے ساتھ گزرتی ہے۔ لہٰذا ایسے لوگ بعد کی زندگی میں اپنے اخلاق حمیدہ اور اعمال پسندیدہ کا اجر حاصل کرتے اور اسودہ زندگی کا مزا اُٹھاتے اور صحت و سلامتی کی نعمت سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

اسی طرح بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کی ساری زندگی بُرائیوں میں گزرتی ہے۔ بُرے اخلاق اور ناپسندیدہ افعال کا ارتکاب کرتے ہیں۔ لوگوں کو اُن کی بری باتوں اور گناہ آلود کردار سے تکلیف ہوتی ہے، لیکن وہ خود انتہائی صحیح و سالم زندگی بسر کرتے اور انواع و اقسام کی نعمتوں اور لذتوں سے بہرہ مند ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کی دوسری زندگی ان کے اخلاق کے مطابق یا تو حیوان اور حشرات کے پیکر میں چلی جاتی ہے یا پھر ناقص، اپاہج بیمار اور معاشرے کے دھتکارے ہوئے افراد میں منتقل ہو جاتی ہے اور ہر صُورت میں وہ رُوحانی اور جسمانی عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

''ایک پیکر سے دوسرے پیکر کی طرف ارواح کی منتقلی یا بالفاظ دیگر تولد اور حیات کی تجدید ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ ایک ہی سطح پر برقرار رہے بلکہ ممکن ہے کہ ایک محدود زمانے میں مختلف علوی اور سفلی عالموں میں نمودار ہوتی رہیں یا یہ کہ کرۂ ارضی پر مختلف عالموں میں زندگی کے لباس میں ملبوس ہوتی رہیں مثلاً کبھی تو نباتات اور اشجار میں، کبھی حیوانات اور جانوروں میں اور کبھی اس سے بھی گھٹیا مراتب میں ظہور پذیر ہوں۔ اور کبھی کائنات کے بالاترین عالموں میں ظاہر ہوں، جیسے خاکروب اور جاروب کش افراد کی رُوحیں دوسری زندگی میں کسی راجے یا برہمن کے بدن میں داخل ہو جائیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انسانی رُوحیں مرنے کے بعد بھڑ، کیڑے یا کسی گھاس کے ساتھ متعلق ہو جائیں۔''[1]

اخلاقی معیار کے مطابق ہی شکلیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

حکیم سبزواری شرح منظومہ میں کہتے ہیں۔

---

[1] تاریخ جامع ادیان ص ۱۰۵

"واما غیر الکاملین کالمتوسطین والنا تصین فی الغایة ولا شقیآء علی طبقاتہم فنقل نفوسہم من ھذا الابدان الی ابدان اخریٰ فای خلق یغلب علی النور الا سقھبد وایة ھئة ظلمانیة تتمکن فیہ یوجب ان یکون بعد فساد صیفیة منتقلاً الی صیصة متناسبة لتلك الھئیة الظلمانیة من الحیوانات المتنسکة الروس کانتقال نفس الحریص الی الخنیریر ونفس السارق الی الفارۃ۔"

''جہاں تک غیر مکمل یعنی متوسطین ، انتہائی ناقص اور اشقیا کے مختلف طبقات کی رُوحوں کا تعلق ہے تو وہ ان ابدان سے دوسرے ابدان کی طرف منتقل ہوجاتی ہیں، لہٰذا جو عادت اور خلق پر غالب آ جائے اور ہر ظلمانی اور تاریک شکل وصُورت کہ جس میں وہ موجود ہوتی ہیں، اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ اس بدن کے فنا ہوجانے کے بعد کسی ایسے حیوان کے بدن میں منتقل ہوجاتی جو اس مذموم صفت اور ظلمانی صُورت کے شایانِ شان ہوتی ہے جیسے حریص کی رُوح سور میں اور چور کی رُوح چوہے میں چلی جاتی ہے۔'' [1]

کتاب ''اسرار حکیم'' میں تناسخ کی بحث میں دوسرے جانوروں کا نام بھی لیا ہے کہ اخلاق زمیمہ اور ملکات غیر پسندیدہ سے آلودہ روحیں دنیا میں دوبارہ واپس آ کر ان جانوروں کے بدنوں میں جا گزین ہوجاتی ہیں، چنانچہ کہتے ہیں: سئور حیوانی شہوت کی زیادتی کے لیے ہے، درندے حیوانی غصے کی زیادتی کے لیے ہے، شیر، تکبر کے لیے ہے، چیونٹیاں حرص کے لیے ہیں، سانپ اور بچھو لوگوں کو ستانے کے لیے ہیں۔

درندہ صفت انسان:

انسانی معاشروں میں ایسے بہت سے لوگ مل جاتے ہیں جن کی شکل وصورت انسانوں جیسی ہوتی ہے، انسانوں ہی کے درمیان زندگی بسر کرتے ہیں اور لوگ بھی انہیں انسان سمجھتے ہیں لیکن روحانی پہلو اور نفسانی ملکات کے لحاظ سے درندوں، کاٹنے والے جانوروں یا دوسرے حشرات اور حیوانات کی صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[1] شرح منظومہ سبزواری ص ۳۱۳

"فالصورة صورة انسان والقلب قلب حیوان"

"ان کی ظاہری صورتیں تو انسانوں جیسی ہوتی ہیں، لیکن باطنی شکلیں جانوروں جیسی۔"[۱]

حیوانی صورت میں حشر ونشر:

قیامت کے دن، دلوں کے حال ظاہر ہو جائیں گے، اندر کی باتیں باہر آ جائیں گی اور ہر شخص کو اس کی باطنی صورت اور روحانی حالت کے مطابق محشور کیا جائے گا۔ جو شخص دنیا میں انسان بن کر رہا اور انسانی صفات کو اپنائے رکھا وہ آخرت میں بھی انسانی صورت میں محشور ہوگا، لیکن جو شخص ظاہر میں تو انسان تھا، لیکن باطن میں کاٹنے یا چیز نے پھاڑنے والے یا کسی اور طرح کے جانوروں کی خصوصیات کا حامل تھا اسی جانور کی صورت میں محشور ہوگا جس کی صفات کا یہ آئینہ دار تھا، جیسا کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"یحشر الناس علی نیاتهم یوم القیامة۔"

"لوگ قیامت کے دن اپنی باطنی نیتوں اور اندرونی ملکات کے مطابق محشور ہوں گے۔"[۲]

انبیاء کی تعلیمات کے خلاف نظریات:

فاسد الاخلاق اور گناہگار انسانوں کی ان کے نفسانی ملکات کے مطابق صُورتوں کی تبدیلی عالمِ آخرت کے سینکڑوں عذابوں میں سے ایک ہے جس کا دنیاوی عذاب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن تناسخ کے نظریہ کے قائل حضرات اس اخروی سزا کو دنیا میں واپس پلٹ آنے کی صُورت میں تصوّر کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ: سوائے معدودے چند لوگوں کے جو یا تو ارتقاء کی آخری منزل پر فائز ہیں یا پھر اسفل سافلین میں گر چکے ہیں اور دُنیا میں پلٹ کر واپس نہیں آئیں گے، باقی تقریباً تمام کے تمام بنی نوع انسان، مرنے کے بعد دُنیا میں لوٹا دیے جاتے ہیں اور ہر مرحلے میں اپنے اعمال کی سزا یا جزا اسی دُنیا میں ہی حاصل کرتے ہیں۔

خدا کا انکار، قیامت کی تکذیب:

بنابریں تناسخ کا عقیدہ رکھنے والوں کی نظر میں قیامِ قیامت حساب وکتاب، بہشت دوزخ غرض کہ عالم آخرت

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۸۷

[۲] مشکوٰۃ الانوار ص ۱۴۷

کا ثواب وعذاب کوئی حیثیت اور حقیقت نہیں رکھتے اور اس قسم کا نظریہ اور انبیاء کی بُنیادی تعلیمات اور مقدس دین اسلام کی ضرورت کے بالکل برخلاف ہے اور آئمہ اطہار نے اسے صاف لفظوں میں کُفر سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ روایت میں ہے مامون الرشید نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے یہ عقیدہ رکھنے والوں کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

"من قال بالتناسخ فھو کافر باللہ العظیم، یکذب بالجنة والنار"

''یعنی جو شخص تناسخ کا عقیدہ رکھتا ہے۔ وہ خدا کا منکر اور بہشت اور دوزخ کو جھٹلاتا ہے۔''[1]

واضح دینی راستے سے انحراف:

ایک زندیق نے حضرت جعفر صادق علیہ السلام سے مختلف مسائل کے بارے میں گفتگو کی اور اسی دوران میں ایک سوال یہ بھی کیا کہ تناسخ کے عقیدہ کی اصل وجہ کیا ہے اور اس عقیدہ کے ماننے والوں کی کیا دلیل ہے؟ تو امام نے اس کے اس سوال کا تفصیل سے جواب دیا اور یہ بھی فرمایا۔ تناسخ کے سچے پیرکاروں نے دین کے واضح اور روشن راستے کو چھوڑ کر گمراہیوں کو اپنے دل میں صحیح سمجھ لیا اور اپنے آپ کو حیوانی شہوتوں اور نفسانی خواہشات میں کُھلا چھوڑ دیا۔

"وزعموا انہ لاجنة ولانار ولا بعث ولانشور ولقیامة عندھم خروج الروح من قالبه وولوجه فی قالب آخر فان کان محسنا فی القالب الاوّل اعید فی قالب افضل منه حسنا فی اعلیٰ درجة من الدنیا وان کان مسیئا اوغیرہ عارف صارفی بعض الدواب المتعبة فی الدنیا اوھوام مشوھة الخلقة۔"

''وہ یہ سمجھتے ہیں کہ نہ تو کوئی بہشت ہے اور نہ دوزخ، نہ حشر ہے نہ نشر اور اُن کے نزدیک قیامت یہ ہے کہ رُوح ایک قالب سے نکل کر دوسرے قالب میں داخل ہو جاتی ہے۔ اگر پہلا قالب اچھا اور نیک تھا تو اس کی بازگشت ایسے قالب میں ہوگی جو دُنیا میں پہلے سے زیادہ نیکوکار اور اعلیٰ درجے پر ہوگا۔ اور اگر پہلا قالب بدکار یا جاہل تھا تو اسے ایسے چوپایوں کے پیکر میں منتقل کر دیا جاتا ہے جو بوجھ اٹھاتے اور بار برداری کرتے ہیں اور اُن کی زندگی بڑی مشکل سے گزرتی ہے، یا پھر ایسے چھوٹے چھوٹے اور بدصُورت پرندوں کے بدن میں بھیج دیا جاتا ہے جو رات کو اُڑتے اور

---

[1] سفینۃ البحار، مادہ نسخ ص ۵۸۵

قبرستانوں میں بسیرا کرتے ہیں۔''[۱]

تناسخ اور دُنیا میں ارواح کے پلٹ آنے کا مسئلہ صرف مکتبِ انبیاء کے مخالف، خدا کے انکار کا موجب، معاد کی نفی کا سبب، عالم آخرت کے ثواب وعذاب کا باعث ہی نہیں بلکہ دانشوروں، سکالروں اور فلاسفروں نے بھی اسے مسترد کردیا ہے اور فلسفی کتابوں میں اس کے باطل ہونے کی کئی دلیلیں بھی پیش کی ہیں۔ اس بارے میں مزید معلومات کے لیے اُن میں سے چند ایک دلائل یہاں پر ذکر کیے جاتے ہیں، لیکن ان دلائل کو بیان کرنے سے پہلے روح کے بارے میں پائے جانے والے اختلافات کو بیان کیا جاتا ہے۔

رُوح کی تخلیق کے بارے میں دونظریے:

جولوگ رُوح کو ایک خلق شدہ چیز اور حادث مخلوق مانتے ہیں اس کی پیدائش کے بارے میں اُن کے دو نظریے ہیں کچھ لوگ تو وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ رُوح کی تخلیق بدن کی پیدائش سے پہلے ہوئی ہے اور بدن کے ختم ہوجانے کے بعد رُوح باقی اور پائیدار رہتی ہے بنابریں ان لوگوں کے عقیدہ کے مطابق انسانی رُوح، روحانیہ الحدوث'' بھی ہے اور'' روحانیہ البقا'' بھی۔

اور کچھ لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں ہر انسان کی رُوح اس کے جسم کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اور اس کی پیدائش نطفہ کے مختلف مراحل طے کرنے، جسم کے مسلسل متغیر رہنے اور مادہ کے انتہائی ارتقاء کی صُورت میں ہوتی ہے اسی لیے اُن کے نزدیک انسانی رُوح ''جسمانیۃ الحدوث'' اور'' روحانیۃ البقاء'' ہوتی ہے۔

جسم سے پہلے رُوح کی تخلیق:

بعض مُسلمان علماء اور فلاسفہ کا تعلق پہلے گروہ سے ہے اور جسم کی تخلیق سے پہلے رُوح کی تخلیق کے قائل ہیں، مرحوم شیخ صدوق رضوان اللہ علیہ کا شمار بھی اسی گروہ میں ہوتا ہے یہ عُلماء اپنے موقف کے ثبوت میں پیشوایانِ اسلام کی بعض روایات سے استشہار کرتے ہیں جن میں سے آنحضرتؐ کی ایک یہ حدیث بھی ہے۔

''خلق اللہ الارواح قبل الاجساد بالفی عام۔''

''خدا نے اجسام کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال قبل ارواح کو پیدا کیا ہے۔''[۲]

---

[۱] احتجاج طبرسی جلد ۲ ص ۸۹

[۲] احتجاج طبرسی جلد ۲ ص ۸۹

شیخ صدوق کا فرمان:

لیکن شیخ مفید نوراللہ ضریحہ، عقائد صدوق کی شرح میں فرماتے ہیں:

"واماماذکرہ ابوجعفر ورواہ ان الارواح مخلوقة الجساد بالفی عام فما تعارف منھا استلف وماتناکر منھااختلف. فھو حدیث من حدیث الاجساد وخبر من طرق الافرارالہ وجد غیر ماظنہ وھوان اللہ خلق الملائکة قبل البشر بالفی عام. فماتعارف منھا قبل خلق البشر اسلف عند خلق البشر ومالم یتعارف منھا اذذاك اختلف بعد خلق البشر۔"

"جو کچھ ابوجعفر (شیخ صدوق) نے کہا اور روایت بیان کی ہے کہ اجسام کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل رُوحوں کو پیدا کیا گیا ہے۔ یہ حدیث آحاد میں سے ہے اور افراد کے ذرائع کی خبر ہے اور اس کا معنی وہ نہیں جو شیخ صدوق نے سمجھا ہے ایسی روایات میں روح سے مراد ملائکہ ہیں جنہیں خالقِ کائنات نے بشر کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل خلق فرمایا ہے جن کی دنیاوی تخلیق سے پہلے باہم آشنائی ہوگئی وہ تخلیق انسان کے بعد اس سے جا ملے، اور جن کی آشنائی نہیں ہوئی وہ ایک دوسرے سے جُدا ہوگئے۔"[1]

رُوح کی جسم کے ساتھ تخلیق:

بعض مُسلمان علماء اور فلاسفہ کا تعلق دوسرے گروہ سے ہے جو رُوح کو "جسمانیة الحدوث" اور "روحانیة البقاء" سمجھتے ہیں، اور مرحوم صدر المتالہین شیرازی بھی اسی دوسرے گروہ سے ہیں وہ اس بحث میں "حرکت جوہری" کو اپنے استدلال کی بُنیاد اور اصل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں: "روح ایک مجرد چیز جسم ہے ارتقائی مراحل طے کرنے اور مادہ کے تبدیلی اختیار کرنے کی وجہ سے معرضِ وجود میں آتی ہے، اور ایک آیت کے ضمن میں ایک مختصر سے جُملے کے ساتھ اس بات کی تائید کرتے ہیں۔

خداوند عالم نے قرآن شریف میں رحم مادر میں انسانی نطفہ کے مختلف مراحل کو طے کرنے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے، ہم نے نطفہ کو علقہ بنایا، علقہ کو گوشت کا لوتھڑا بنایا، اس لوتھڑے میں ہڈیاں پیدا کیں اور ہڈیوں پر گوشت چڑھایا" پھر فرماتا ہے۔ "ثم انشانا خلقاً آخرً" آخری مرحلہ میں اس نطفہ میں ہم نے تبدیلی کی اور اس ترقی یافتہ جسم کو ایک اور

---

[1] کتاب اسماء والعالم ص ۴۲۵ و ص ۴۰۹

مخلوق بنایا۔"

انسانی رُوح یا دوسری مخلوق:

یہ دوسری مخلوق انسانی رُوح ہی کو بننا مناسب ہے جس روح کو خود خدا نے اپنی طرف منسوب فرمایا اور سربلندی اور ارتقاء کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے اسے نامحدود لیاقتوں سے نوازا ہے اور تخلیقی نقطہ نظر سے یہ دوسری مخلوق اس قدر اہم ہے کہ خداوند عالم اس کی تخلیق کے بعد خود کو اعلیٰ ترین تعظیم کا مستحق سمجھتے ہوئے خود کو بہترین خالق بتایا ہے اور فرمایا ہے۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَؕ﴿۱۴﴾[۱]۔

"پس کس قدر باعظمت ہے وہ خدا جو سب سے بہترین خالق ہے۔"

زندیق کا سوال اور امام کا جواب:

جس روایت کی طرف ابھی اشارہ ہو چکا ہے، زندیق کے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے رُوح کے بارے مین کچھ سوالات تھے زندیق نے کہا:

"فاجرنی عن الروح اغیر الدم؟ قال نعم :الروح علی ماوصفت لك ماوتها من الدم فاذاجمد الدم فارق الروح البدن قال هل یوصف بخفة وثقل؟ قال لیس لها ثقل ولا وزن، قال افتلاشی الروح بعد خروجه عن قالبه ام هو باق؟ قال بل هو باق الی وقت ینفخ فی الصور۔"

"آیا رُوح خُون کے علاوہ کوئی چیز ہے؟ فرمایا ہاں! جس طرح کہ میں نے پہلے تفصیل سے بتایا ہے کہ رُوح کا مادہ خون سے ہے اور جب خون، چلنا بند ہو جائے تو رُوح جسم کی چھوڑ دیتی ہے۔ اُس نے پوچھا آیا رُوح کو ہلکا یا بھاری کہا جا سکتا ہے؟ تو امام نے ارشاد فرمایا رُوح نہ تو کوئی بوجھل چیز ہے اور نہ ہی اس کا وزن ہو سکتا ہے اُس نے پھر سوال کیا کہ آیا بدن کو چھوڑ دینے کے بعد رُوح فنا ہو جاتی ہے یا ویسے ہی باقی رہتی ہے؟ امام نے فرمایا رُوح اس وقت تک باقی ہے جب صُور پھُونکا جائے گا۔"[۲]

---

[۱] سورہ ۲۳ آیت ۱۴

[۲] احتجاج طبرسی جلد ۲ ص ۹۷

امام کے فرمان سے استفادہ:

جولوگ رُوح کو''جسمانیۃ الحدوث'' اور''روحانیۃ البقاء'' سمجھتے ہیں وہ امام کے اس فرمان سے کہ''رُوح کا مادہ خُون سے ہے'' روح کے جسمانی حدوث کے لیے اور''اُس وقت تک باقی ہے جب صور پھُونکا جائے گا'' سے رُوح کی بقا کے لیے استدلال کرتے ہیں وہ ہم رُوح کو''جمانیۃ الحدوث'' اور''روحانیۃ البقاء'' مانیں یا اسے''رحانیۃ الحدوث'' اور روحانیۃ ابقاء تسلیم کریں، دونوں صورتوں میں فلاسفہ اور دانشور، تناسخ اور مردوں کے رُوح کی دُنیا میں واپسی کے نظریہ کوئی دلائل سے مسترد کر چکے ہیں۔

صدرالمتالہین کا کلام:

ا مشہور فیلسوف صدرالمتالہین شیرازی فرماتے ہیں:

"قد علمت ان النفس فی اوّل الکون دوجتها درجة الطبیعة ثم یتوقی شیاء حسب استکمالات الماوة حتی یجاوز درجة البنات والحیوان فالنفس متی حصلت بها فعلیة ما فیتحیل ان یرجع تارة اخری الی القوة المحضة والا ستعداد ثم ان قد مضی ان الصورة والمادہ شیء واحد له جهتا فعل وقوة وهما معایتحر کان فی الاشکمال باراء کل استعداد فعلیة خاصة فمن المحال ان یتعلق نفس جاوزت درجة البناتیة والحیوانیة الی مادة المنی والجنین۔"

''آپ جان چکے ہیں کہ نفس، اپنے تکونِ کے پہلے مرحلہ میں، اس کا درجہ، درجہ طبیعت ہے۔ پھر مادہ کی ترقیاتی حرکات کے لحاظ سے ترقی کرتا رہا ہے حتّٰی کہ نبات وحیوان کی حدود سے گزر جاتا ہے۔ بنابریں جب نفس کسی مرحلہ میں قوت سے فعل کی صُورت اختیار کرتا ہے تو وہ فعلیت خواہ کتنا ہی ناچیز کیوں نہ ہو محال ہوتا ہے کہ دوبارہ قوت اور استعداد کی طرف پلٹ جائے۔ علاوہ ازیں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ صُورت اور مادہ دونوں اصل میں ایک چیز ہیں جن کی دو جہات ہیں، ایک فعل اور دوسری قوت اور یہ دونوں مل کر ترقیاتی مراحل کو طے کرتے ہیں اور قابلیت اور استعداد کے مقابلے میں مخصوص فعلیت کو

پا لیتے ہیں، بنابریں جو روح، نباتات اور حیوانات کی رُوح سے گزر جائے اُس کا منی اور جنین سے دوبارہ تعلق حاصل کرنا محال ہو جاتا ہے۔"[1]

تناسخ باطل ہے:

"اما التناسخ فلانه اذا اشتغلت النفس بتدبير نطفة استعدت بقول التاثير والتدبير واستحقت لافاضه النفس عليه من الواهب الذى هومبدا النفوس والصور على كُل قابل مستحق استحقاقا بابطع لاباالجزاف فيودى ذالك الى ان يجمع لبدن واحد نفسان وهو محال لامتناع كون الشيء ذاذاتين اعنى ذانفسين وما من شخص الوهو يشعر بنفس واحدة له فالتناسخ مطلقا ممتنع۔"

"رہا تناسخ کے باطل ہونے کا مسئلہ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب نفس نطفہ جو کہ تاثیر اور تدبیر کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتا ہے کی تدبیر کے ساتھ مشغول ہو جاتا ہے، اور نفوس وصورتوں کو پیدا کرنے والا اس کے طبعی استحقاق کی بنا پر اُسے اپنے فیوض سے نوازتا ہے۔ اگر تناسخ کا عقیدہ رکھنے والوں کے بقول ایک اور نفس کا بھی اس سے تعلق ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بدن کی دُو روحیں ہوتیں ہیں، اور یہ بات ناممکن ہے، کیونکہ یہ بات بالکل ہی محال ہے کہ ایک چیز کی دو ذاتیں یعنی دُو روحیں ہوں، اس لیے وجدانی طور پر ہر شخص اپنے اندر صرف ہی نفس کو محسوس کرتا ہے۔ بنابریں تناسخ کا نظریہ مطلقاً باطل اور قطعاً صحیح نہیں ہے۔"[2]

رُوح اور زندگی میں رُونما ہونے والے واقعات:

۳۔ ہر انسان کی رُوح اپنے اندر زندگی کے دوران میں رونما ہونے والے اکثر واقعات کو لیے ہوئے ہے......اور ایامِ زندگی میں رونما ہونے والے حادثات کو یاد رکھے ہوئے ہے۔ علماء اور دانشوروں کی رُوحیں تو عام حالاتِ زندگی کے علاوہ مختلف علوم وفنون کی حامل بھی ہوتی ہیں جو وہ اپنی زندگی کے دوران میں حاصل کرتے ہیں اور جب موت آ جاتی ہے اور رُوح

---

[1] شواہد الربوبیۃ ص ۱۶۱

[2] مبداء ومعاد ص ۲۳۸

بدن سے جدا ہوجاتی ہے تو موت کے بعد نہ صرف اس کی معلومات اور اطلاعات ختم ہوجاتی ہیں، بلکہ بعض آیات وروایات کے مطابق متوفی کی رُوح کی معلومات میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہوجاتا ہے۔ اور اپنی دنیاوی اچھائیوں اور بُرائیوں کو پہلے سے زیادہ یاد میں لے آتی ہے۔

اگر تناسخ کا مفروضہ صحیح ہوتا اور مرنے کے بعد ارواح کی دوبارہ بازگشت کا نظریہ دُرست ہوتا تو تمام لوگ کم وبیش اپنی گذشتہ زندگی کے دورانوں کو یا کم از کم موجودہ زندگی سے پہلی زندگی کے دورانیے کو تو یاد رکھے ہوتے اور اُنہیں معلوم ہوتا کہ وہ کہاں رہتے تھے، کس مُلک کے باشندے تھے، کسِ زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ کون لوگ ان کے دوست اور کون ان کے دُشمن تھے وغیرہ؟ لیکن ایک صدی کے دوران متولد ہونے والے اربوں لوگوں میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا گیا جسے اپنا سابقہ دور یاد ہو اور اپنی سابقہ زندگی کے بارے میں کچھ بتا سکے۔

دینی اور علمی لحاظ سے تناسخ کا بطلان:

تو اس تمام گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ دینی اور علمی ہر لحاظ سے تناسخ ایک باطل تصوّر ہے اور مرنے کے بعد مُردوں کی رُوح کا واپس دُنیا میں لوٹ آنا ایک غلط، ان ہونا اور غیر واقعی نظریہ ہے۔ اور دینی پیشواؤں کے فرامین سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ مرنے کے بعد اور اصلی بدن سے جُدا ہوجانے کے بعد لوگوں کی رُوحیں عالمِ برزخ میں ان مثالی قالبوں میں چلی جاتی ہیں جو اصلی بدن کے عین مشابہ ہوتے ہیں اور اپنے اعمال کے مطابق تا قیامِ قیامت یا نعمتوں سے بہرور ہوتی رہیں گی یا عذاب میں مبتلا رہیں گی۔

مومن اور برزخ کی نعمتیں:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مومنین کی ارواح کے بارے میں یونس بن ظبیان سے فرماتے ہیں۔

"فاذاقبضه الله عزوجل میرتلك الروح فی قالب کقالبه فی الدنیا فیاکلون ویشربون فاذا قدم علیهم القادم عرفوه بتلك الصورة التی کانت فی الدنیا:

"جب امرِ الٰہی کے تحت رُوح قبض ہوجاتی ہے تو اس اصلی جسد کے مشابہ ایک قالب میں مستقر ہوجاتی ہے۔ باایمان لوگ مرنے کے بعد نعمتوں سے بہرہ مند ہوتے، کھاتے اور پیتے ہیں اور جب کوئی شخص

ان کے پاس پہنچتا ہے تو وہ اسے اسی دنیاوی صُورت میں ہی پہچان لیتے ہیں۔"[1]

مشرک اور برزخ کا عذاب:

ابو بصیر کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے ارواح مشرکین کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا:"

فی النار یعذبون، یقولون ربنا لاتقم لنا الساعة ولا تنجز لنا ماوعدتنا ولا تلحق آخرنا باولنا۔"

عملدرآمد نہ کر اور ہمارے بعد میں آنے والے لوگوں کو ہمارے اگلے (پہلے) لوگوں کے ساتھ ملحق نہ فرما۔"[2]

انسان کے زندگی اور موت کے ساتھی:

ایّام زندگی کے خاتمہ اور دورانِ حیات کے اختتام پر موت آجاتی ہے جس کے نتیجہ میں انسان کے تمام دنیاوی رابطے منقطع ہوجاتے ہیں سوائے ان اچھے یا بُرے اعمال کے جو وہ اپنی زندگی بھر میں انجام دیتا رہا ہے۔ یہ اعمال ہمیشہ اُس کے ساتھ رہیں گے۔ اور کبھی بھی اس سے جُدا نہیں ہوں گے جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"ان للمرٔ المسلم ثلاثة اخلاء فخلیل یقول له "انامعك حیاومیتا" وهوعمله وخلیل یقول له "انا معك حتی تموت" وهوماله ، فاذامات صارللورثة، خلیل یقول له "انامعك الی باب قبرك ثم اخلیك" وهوولده"

"مسلمان شخص کے تین دوست ہیں۔ ان میں سے ایک دوست اسے کہتا ہے کہ میں زندگی اور موت میں تمہارا ساتھی ہوں اور میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا وہ ہے اس کا عمل، دوسرا دوست اُسے کہتا ہے میں صرف مرنے تک تمہارا ساتھی ہوں، جونہی تمہیں موت آجائے گی میں تمہیں چھوڑ دوں گا، وہ ہے اس کا مال، کیونکہ جونہی انسان مرجاتا ہے اس کا مال اس سے جُدا ہوجاتا ہے اور ورثاء کو منتقل ہوجاتا ہے، تیسرا دوست اُسے کہتا ہے کہ میں صرف قبر کے دروازے تک تمہارا ساتھی ہوں اس

---

[1] اصول کافی جلد نمبر ۳ صفحہ ۲۴۵

[2] اصول کافی جلد نمبر ۳ صفحہ ۲۴۵

کے بعد تمہیں چھوڑ دوں گا، وہ ہے اس کی اولاد۔"[1]

متوفی کا قبر میں ہم نشین:

قیس بن عاصم کہتے ہیں میں اور بنی تمیم کے کچھ افراد دُور دراز سے مدینہ پہنچے اور حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں شرفیاب ہوئے۔ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یا رُسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں کچھ ایسی نصیحتیں فرمایئے جس سے ہم کو فائدہ پہنچتا رہے، کیونکہ ہم بادیہ نشین ہیں اور صحرا و بیابان ہی میں ہماری آمد و رفت رہتی ہے اور شہروں میں ہمارا آنا جانا بہت کم ہوتا ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"یاقیس ان مع الزذلك ان مع الحیواۃ موتا وان مع الدنیا آخرۃ وان لکل شیء حسیبا،وعلی کل شیء رقیبا، وان لکل حسنة ثواباولکل سئیة عقابوولکل اجل کتابا، وانه لابدلك یاقیس من قرین یدفن معك وهوحی وتدفن معه وانت میت، فان کان کریما اکرمك وان کان لیمااسالك. ثم لایحثر الامعك ولا تبعت الامعه ولا تسئل الاعنه فلا تجعله الاصالحافانه ان اصلح انست به. وان فسولا تستوحش الامنه وهو فعلك۔"

"اے قیس! عزت کے ساتھ ذلت اور زندگی کے ساتھ موت ہے اور دُنیا کے ساتھ آخرت ہے۔ یقیناً نظامِ آفرینش میں ہر چیز کے لیے حساب اور محاسبہ ہے، ہر چیز پر ایک نگران مقرر ہے۔ ہر اچھے کام کے لیے اجر ہے، ہر بُرے کام کے لیے سزا ہے، اور ہر چیز کی مدّت کے لیے ایک نوشتہ اور کتاب ہے۔ اے قیس! تمہارے لیے ایک مصاحب اور ہم نشین لازمی ہے جو تمہارے ساتھ سپردِ خاک کیا جائے گا۔ تمہارے دفن کے موقعہ پر وہ زندہ ہوگا اور تم مُردہ ہوگے۔ اگر تمہارا ہم نشین کریم اور باعزت ہے تو تمہاری بھی عزت کرے گا اور اگر پست اور ذلیل ہے تو تمہیں بھی دکھ پہنچائے گا۔ بروزِ قیامت وہ تمہارے بغیر اور تم اس کے بغیر محشور نہیں کیے جاؤ گے۔ اور تم سے صرف اسی کے بارے میں سوال کیا جائے گا، پس ایسا مصاحب تلاش کرو جو صالح اور نیک ہو۔ کیونکہ اگر وہ نیک اور صالح ہوگا تو تم بھی

---

[1] معانی الاخبار ص ۲۳۲

اس کے ساتھ مانوس رہو گے اور اگر فاسد ہوگا تو اس کے علاوہ کسی اور سے خائف اور ہراساں نہیں ہو گے، وہ ہم نشین خود تمہارا عمل ہی ہے۔"[۱]

عمومی افکار اور اعمال کا موازنہ:

دُنیا بھر کے لوگ اپنی ساری زندگی میں اور زندگی کے مختلف میدانوں میں مختلف اعمال بجالاتے رہتے ہیں خواہ ان اعمال کا تعلق عبادت سے ہو یا اخلاق سے، فرد سے ہو یا اجتماع سے، عزت وناموس سے ہو یا جان ومال سے، اور اکثر لوگوں کے اعمال غلط اور صحیح ہونے کی حیثیت سے ملے جُلے ہوتے ہیں، ان ہی اعمال کا برزخ اور قیامت میں محاسبہ کیا جائے گا، ان کی جانچ پڑتال کی جائے گی، لیکن قبل اس کے کہ اس کے اعمال کا برزخ میں محاسبہ کیا جائے، اس کے اخلاق واعمال کے بارے میں دُنیا میں عمومی افکار اور عام لوگوں کی رائے بھی ایک ترازو کی حیثیت رکھتی ہے اور معاشرہ کے عام اور بے غرض لوگ اس کے نیک وبد اعمال کے بارے میں فیصلہ کر لیتے ہیں۔

نامہ اعمال کا عنوان:

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اسلام نے بھی افراد کے بارے میں لوگوں کی آراء اور باتوں کو خاص اہمیت دی ہے اور روایات میں آیا کہ متوفی کے بارے میں معاشرہ کے افراد کے فیصلے برزخ کے محاسبہ میں بڑی حد تک موثر ہیں۔ اور اس کے نامہ اعمال میں سرفہرست ہوتے ہیں۔ جیسا کہ پیغمبر ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

"اول عنوان صحیفة المومن بعد موته مایقول الناس فیه ان خیر فخیرا، وان شرا فشرا۔"

"مومن کے نامہ اعمال میں جو چیز سب سے پہلے عنوان کی صورت میں دیکھی جائے گی وہ وہی چیز ہوگی جو لوگ اس کے بارے میں کہتے ہیں۔ اگر اچھا کہتے ہیں تو اچھا عنوان ہوگا اور اگر بُرا کہتے ہیں تو بُرا عنوان ہوگا۔"[۲]

حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السّلام مالک اشتر کے نام خط میں کہتے ہیں۔

"انما یستدل علی الصالحین بما یجری اللہ لهم علی السن عباده۔"

---

[۱] امالی صدوق

[۲] بحارالانوار جلد ۱۷ ص ۱۷۰

''منجملہ ان چیزوں کے جونیک اور صالح افراد کی لیاقت اور نیکی کی گواہ ہیں وہ چیز بھی ہے جو خداوند عالم اُن کے بارے میں لوگوں کی زبان پر جاری کرتا ہے۔''[۱]

بے غرض لوگوں کی رائے:

لوگوں کے بارے میں بے غرض اور بے لوث افراد کی نیک یا بدرائے بے اثر نہیں ہے، بلکہ معاشرہ میں ان کی گفتار اور اُن کے کردار سے وابستہ ہوتی ہے۔ جو لوگ عملی طور پر صاحبانِ فضیلت اور نیکوکار ہیں، عام لوگوں کے بارے میں اُن کے قانونی اور اخلاقی حقوق کی رعایت کرتے ہیں، وہ معاشرے کے محبوب بن جاتے ہیں، دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں اور لوگ اُنہیں اچھے لفظوں سے یاد کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ حق اور فضیلت کی پرواہ نہیں کرتے، دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ ان کی حُدود کی پرواہ نہیں کرتے، معاشرے میں ان کا کوئی مقام نہیں ہوتا لوگ انہیں بُرے لفظوں سے یاد کرتے، اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

نیکیوں کے گواہ:

بنابریں لوگوں کی باتیں متوفی کے نامہ اعمال اور برزخی کیفیت کے بارے میں اس لیے موثر ہیں کہ وہ دنیاوی زندگی میں اُن کی نیکی اور اعمال صالحہ کے گواہ رہے ہیں، اسی لیے آئمہ اطہار السّلام نے اپنے پیروکاروں کی ہدایت کی ہے کہ اُن کا کردار ایسا ہونا چاہے کہ لوگ اسے پسند کریں، اور اُن کی زندگی اور موت میں اُنہیں نیکی اور اچھائی سے یاد کریں، جیسا کہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

خالطوالنّاس مخالطة ان میتم معها بکواعلیکم وان عشتم حنواالیکم۔''

''لوگوں کے ساتھ ایسا میل جول رکھو کہ اگر تم مرجاؤ تو وہ اس پر افسوس کے آنسو بہائیں اور اگر زندہ ہو تو تمہاری مُلاقات کے مشتاق ہوں۔''[۲]

---

[۱] سفینۃ البحار جلد ۲، مادہ صلح

[۲] نہج البلاغہ کلمہ ۱۰

انجامِ فرائض کا خاتمہ:

دُنیا انجامِ فرائض کا گھر ہے اور برزخ و آخرت سزا اور جزا کا مقام اور موت ان دونوں کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ موت کے آجانے سے سعی و عمل کا مرحلہ ختم ہوجاتا ہے، انسان اپنے کاردکوشش سے رک جاتا ہے اور نیک و بد سرگرمیوں کی طاقت اس سے چھین لی جاتی ہے، اسی لیے مرنے کے بعد کوئی شخص عملی طور پر اس بات کی قدرت نہیں رکھتا کہ اپنی موجودہ کیفیت کو تبدیل کر سکے اور اپنے نامہ اعمال میں کسی قسم کی تبدیلی لا سکے۔ بقول مولائے کائنات علی بن ابی طالب علیہ السلام۔

"لا عن قبیح یستطیعون انتقالا ولا فی حسن یستطیعون ازدیادا۔"

''جو لوگ دُنیا سے جا چکے ہیں نہ تو اس بات پر قادر ہیں کہ اپنے انجام شدہ قبیح عمل کو پلٹا سکیں اور نہ ہی اپنے نیک اعمال میں اضافہ کر سکیں۔''[1]

برزخ اور قیامت کا باہمی فرق:

اگرچہ عالمِ برزخ اور عالمِ آخرت دونوں سزا اور جزا کے گھر ہیں لیکن کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عالم برزخ کی موجودگی کے ساتھ ساتھ عالم دُنیا اور انجامِ فرائض کا گھر اسی طرح باقی اور موجود ہے۔ ہر روز کچھ لوگ مرتے رہتے ہیں اور عالم برزخ میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اور کچھ لوگ پیدا ہوتے اور دُنیاوی زندگی کا آغاز کرتے رہتے ہیں، لیکن عالمِ آخرت کی یہ کیفیت نہیں ہے، کیونکہ خداوندِ عالم کی قضا اس بات کی متقاضی ہے کہ قیامت کے قیام سے پہلے دنیاوی زندگی کا خاتمہ ہوجائے، منظومہ شمسی تباہ ہوجائے، کُرہ ارضی ختم ہوجائے، انسان اور دوسری مخلوقات کا ایک ساتھ ہی خاتمہ ہوجائے، غرض روزِ جزا کے برپا ہونے سے قبل نہ تو کوئی انسان باقی رہے گا اور نہ ہی انجامِ فرائض کی کوئی جگہ۔

برزخ اور نعمت و عذاب میں افزائش:

اسی فرق کی وجہ سے جب تک قیامت قائم نہیں ہوجاتی اہل برزخ کا تھوڑا بہت رابطہ دُنیا جو کہ فرائض کی انجام دہی کا گھر ہے، سے برقرار رہتا ہے اور ممکن ہے کہ بعض عوامل اور شرائط کی بنا پر عالمِ برزخ میں نعمت سے بہرہ مند ہونے والے بعض افراد کی نعمتوں میں اضافہ ہوجائے اور وہ بالاترین اور اعلیٰ ترین مقامات کو پالیں، اور اسی طرح برزخ میں معذب کچھ

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۸

افراد کے عذاب وسزا میں کمی بھی واقع ہو جائے یا بالکل ہی اُن سے عذاب اُٹھا لیا جائے۔ اور یا پھر اُن کے عذاب میں شدت اور اضافہ ہو جائے۔ عالم برزخ میں نعمت سے بہرہ مند یا عذاب میں مبتلا بعض افراد کی کیفیت ایسا موضوع ہے جس کی نشاندہی روایات میں بھی کی گئی ہے اور ہم یہاں پر نمونہ کے طور پر ان میں سے کچھ چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

نوجوان نسل کے ازدواج میں امداد کرنا:

ایک باعظمت اور مخیر انسان یہ عزم صمیم کر لیتا ہے کہ شادی کے قابل جو جوان لڑکے اور لڑکیاں اس کے پڑوس میں رہتے ہیں اور مالی استطاعت نہیں رکھتے، اُن کی شادی کے اسباب فراہم کرے، اور اُن کے اخراجات برداشت کرے، چنانچہ اس بارے میں وہ تھوڑا بہت اقدام بھی کرتا ہے اور اس کارِخیر کا اچھا اخلاقی اور سماجی نتیجہ بھی دیکھ لیتا ہے تو اس بات کا پُختہ ارادہ کر لیتا ہے کہ اسے وسیع بُنیادوں پر انجام دیا جائے اور اپنے شہر کے تمام بے بضاعت نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کرے۔ اس کام کے لیے وہ باقاعدہ ایک ادارے کی بُنیاد رکھتا ہے، اپنی جائیداد کا کافی حصّہ اس کارِ خیر کے لیے وقف کرتا ہے اور اس وقف کو چلانے کے لیے اپنے بعد اپنی اولاد کو اس کا متولی قرار دیتا ہے۔ ادارہ کام کرنا شروع کر دیتا ہے اور سالانہ کئی افراد کی شادیوں کے اخرجات برداشت کرتا ہے اور اُنہیں عائلی زندگی اور زناشوئی کی نعمت سے مالا مال کرتا ہے کچھ عرصے کے بعد جوانوں کی شادیوں کے اخراجات برداشت کرتا ہے اور اُنہیں عائلی زندگی اور زناشوئی کی نعمت سے مالا مال کرتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد جوانوں کی عفت و پاکدامنی کے تحفّظ کے سلسلے میں اس ادارے کی کارکردگی اور شُہرت دُور دُور تک پھیل جاتی ہے اور ہر شہر کے مخیر اور صاحبانِ استطاعت افراد بھی اس قسم کے کام میں اس شخص کے نقشِ قدم پر چلنے کی سوچتے ہیں اور اسی طرح کے ادارے کھولنے کا قصد کر لیتے ہیں اور زرِ کثیر خرچ کر کے کئی بے بضاعت لڑکوں اور لڑکیوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر کے جوان نسل کو انحراف اور اخلاقی بے راہروی سے بچا لیتے ہیں۔

آئمہ اطہار سے ہم تک پہنچنے والی روایات کے مطابق جو شخص معاشرے مین کسی نیک کام اور کارِ خیر کی بُنیاد رکھے اور پھر دوسرے لوگ اس کے اس کام میں پیروی کریں تو جتنی مرتبہ وہ نیک کام دوسروں کے لیے موردِ عمل قرار پائے گا اتنی مرتبہ اس کارخیر کی بُنیاد رکھنے والے کو خواہ وہ زندہ ہو یا مر گیا ہو بارگاہ ایزوی سے ثواب ملے گا اور وہ نت نئی نعمت سے بہرہ ور ہو گا جیسا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

نیک کام کی بُنیاد:

"قال رسُول اللہ: من سن سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها الی یوم

القیامة من غیر ان ینقص من اجورهم شیأ۔"

"رسُول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص معاشرہ میں کسی نیک کام کی بُنیاد رکھے تو اس نیک کام کی بُنیاد کا ثواب اور اس پر عمل کرنے والوں کا ثواب بھی اُسے ملے گا اور عمل کرنے والوں کے ثواب میں بھی کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی۔"[۱]

بُرے کاموں کی بُنیاد:

بُرے کاموں کی بُنیاد کے گناہوں کے آثار بھی گناہ کے لحاظ سے وسیع اور طویل ہیں۔اور روایات کے مطابق جو شخص بھی معاشرے میں کسی بُرائی کی بُنیاد رکھے گا اور دوسرے لوگ اس پر عمل کریں گے تو جب تک اس پر عمل درآمد ہوتا رہے گا اس وقت تک بانی کے نامہ عمل میں گناہ لکھے جاتے رہیں گے خواہ وزندہ رہے یا مر جائے۔اور وہ نت نئی سزا کا مستوجب ہوتا رہے گا۔جیسا کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"ایما عبد من عباد الله، سن سُنة ضلالة کان علیه وزر من فعل ذالك میں غیر ان ینقص من اوزارهم۔"

"اللہ کے بندوں میں سے جو بندہ بھی لوگوں میں کسی گمراہ کُن کام کی بُنیاد رکھے گا تو اس کے لیے بھی ان لوگوں جیسا گناہ ہوگا جو اس کے مرتکب ہوں گے اور گمراہی پر عمل کرنے والوں کے گناہ سے بھی کچھ کم نہیں کیا جائے گا۔"[۲]

ان دونوں روایات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کسی کام کی بنیاد کا اثر پائدار اور دائمی ہوتا ہے۔اور جتنی مرتبہ بھی اس نیک کام پر دوسرے لوگ عمل کرتے ہیں اس کا بانی خواہ دُنیا میں زندہ ہو یا مرکر برزخ میں پہنچ چُکا ہو ہر مرتبہ دوسرے لوگوں کے عمل کی طرح کے ثواب کا مستحق ہوگا اور جتنی مرتبہ بُرے کاموں کی بُنیاد پر عملدرآمد ہوتا رہے گا تو بانی کے لیے بھی دوسرے لوگوں کے عمل کی وجہ سے ہر مرتبہ نیا گناہ لکھا جاتا رہے گا خواہ وہ بانی زندہ ہو یا مُردہ۔

صدقہ جاریہ کا ثواب:

صرف نیک کاموں ہی کی بُنیاد کا مرنے کے بعد اس کے بانی کو ثواب نہیں ملے گا بلکہ انسان نے اپنی زندگی میں جن

---

[۱] تحف العقول ص ۲۴۳

[۲] سفینۃ البحار ص ۶۶۵ (مادہ سنن)

صدقات کو جاری کر دیا ہو اُن کا ثواب بھی اُسے اس وقت تک ملتا رہے گا جب تک یہ صدقات جاری رہیں گے۔ اور وہ برزخ میں اُن کے ثواب سے بہرمند ہوتا رہے گا۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"لیس یتبع الرجل بعد موته من الاجر الاثلاث خصال، صدقة اجراها فی حیاته فهی تجری بعد موته الی یوم القیامة. صدقة موقوفة الاتورث اوسنة سنها فکان یعمل بهائوعمل بها من بعده غیرهٗ اوولد صالح یستغفرله۔"

"جب انسان مرجاتا ہے اور اس دُنیا سے اُٹھ جاتا ہے تو اُسے کوئی اجر نہیں ملتا مگر تین راستوں سے، پہلا تو وہ صدقہ ہے جسے اُس نے اپنی زندگی میں جاری کیا اور مرنے کے بعد قیامت تک جاری رہا، جیسے وہ اوقات ہیں جن کا وارث کوئی نہیں ہوسکتا۔ یا کسی اچھے کام کی بُنیاد ہے اور مرنے کے بعد اس پر دوسرے لوگ عمل کرتے رہے یا وہ نیک اولاد ہے جس کی اُس نے اچھی تربیت کی اور وہ اس کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں۔"[1]

متوفی کا دائمی ثواب:

جن صدقاتِ جاریہ کا ذکر روایات میں آیا ہے اُن کا وسیع مفہوم ہے اور بہت سے مقامات پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جن میں سے کچھ کا تذکرہ مندرجہ ذیل حدیث میں ہے۔ ابنِ عباس کہتے ہیں۔

"قال رسول الله: سبعة اسباب یکتسب للعبد ثوابها بعد وفاته، رجل غرس نخلاً اوحفر براواجری نهر اوبنیٰ مسجدا او کتب مصحفا اوورث علماً اوخلف ولدا صالحاً یستغفرله بعد وفاته۔"

"سات اسباب ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک سبب کو بھی اپنالے تو مرنے کے بعد اُس کے نامہ اعمال میں ثواب لکھا جاتا رہے گا، جو شخص کوئی پھلدار درخت لگادے، کوئی کنواں کھودے، کوئی نہر جاری کردے، کسی مسجد کی بُنیاد رکھ دے، قرآن پاک لکھ ڈالے، اپنے علم کا وارث چھوڑ جائے اور کسی صالح فرزند کی صحیح تربیت کر کے اس دنیا میں چھوڑ جائے اور وہ اس کے لیے

---

[1] خصائل صدوق ص ۱۵۱

استغفار کرتا رہے۔''[۱]

مرجانے والوں کے لیے صدقات:

اگر متوفی کے لیے کوئی اور شخص بھی کارِ خیر انجام دے تو اس سے بھی عالمِ برزخ میں اُسے فائدہ پہنچے گا، اسی طرح کسی صدقہ کو متوفی کے لیے ثواب کی غرض سے جاری کر دے اور لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے تو اس کا ثواب بھی متوفی کو ملے گا۔ سعدؓ بن عبادہ کہتے ہیں:

"ان بکرا اخابنی ساعدة توفیت امه وهو غائب عنها، فقال یارُسول الله! ان امی توفیت وانا غائب عنها، فهل ینفعُها ان تصدقت بشئی عنها؟ قال نعم! قال فانی اشهدك ان حائط المخرف صدقة علیها۔"

''بنی ساعدہ کا ایک شخص سفر میں تھا کہ اس کی ماں فوت ہوگئی، رُسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا کہ میری غیر حاضری میں میری ماں کی وفات ہوگئی۔ اگر میں اس کے لیے کوئی چیز صدقہ میں دے دوں تو اسے اس کا کوئی فائدہ بھی ہوگا؟ فرمایا، بالکل! اُس نے کہا تو پھر آپ گواہ رہیں کہ میرے خرما کا باغ جو پھل دے رہا ہے، میں نے اس کے لیے صدقہ میں دے دیا ہے۔''[۲]

والدین کی نیک اولاد:

نیک اولاد بھی دوسرے جاری صدقات کی مانند عالم برزخ میں والدین کے لیے اجر کا سبب ہوتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی اولاد دُنیا میں اپنے ماں باپ کے لیے استغفار کرتی ہے تو خداوند عالم برزخ میں اُنہیں اپنی رحمت اور مغفرت میں شامل فرمالیتا ہے۔ بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی بچہ اپنے ماں باپ کو یاد کیے بغیر کوئی نیک عمل انجام دیتا ہے اور چونکہ وہ نیک عمل والدین کی صحیح تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے اسی لیے خداوندِ عالم برزخ میں اُنہیں اپنے بچے کے نیک عمل کے صدقہ میں ثواب عطا کرتا اور اُن کے عذاب کو ختم کرتا ہے جیسا کہ رُسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

"مر عیسیٰ بن مریم بقبر یعذب صاحبه ثم مر به من قابل فاذا هو لیس

---

[۱] مجموعہ ورام جلد ۲ ص ۱۱۰

[۲] المجالس الفاخرۃ تالیف سید شرف الدین ص ۴۱

یعذب فقال یارب مررت بھذا القبر عام اوّل فکان صاحبہ یعذب ثم مررت بہ العام فاذا ھو لیس یعذب فاوحی اللہ عزوجل الیہ یاروح اللہ انہ ادرک لہ ولد صالح فاصلح طریقا وآوی یتیما فغفرت لہ بما فعل ابنہ۔"

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک قبر سے گزر رہے تھے کہ اس قبر والے پر عذاب ہو رہا تھا۔ دوسرے سال پھر وہیں سے گزرے اور قبر والے پر عذاب نہیں ہو رہا تھا۔ اُنھوں نے خدا سے درخواست کی کہ اس کی وجہ بتائے۔ خداوند عالم نے اُن پر وحی کی کہ قبر والے کا ایک نیک بیٹا تھا جو اس دوران میں بالغ ہو گیا اور اس بلوغ کے بعد اُس نے دو اچھے کام کر ڈالے۔ ایک تو چلنے والوں کے لیے راستہ صاف کر دیا اور دوسرا کسی یتیم بچے کو سر چھپانے کی جگہ دی، لہٰذا میں نے بیٹے کے نیک عمل کی وجہ سے اس کے باپ کو معاف کر دیا۔''[1]

غرض جو شخص اس دُنیا میں کسی نیک کام کی بنیاد رکھ کر، یا صدقہ جاری کر کے یا نیک فرزند چھوڑ کر جائے تو جب تک نیک کاموں کی تاثیر باقی رہے گی برزخ میں اُس کے نتائج اور فوائد ملتے رہیں گے، یا تو وہ اجر اس کے عذاب کی کمی کا سبب بنے گا یا بالکل عذاب ہی ختم کر دے گا اور یا پھر اس کی نعمتوں میں اضافہ کر دے گا یا درجات میں بلندی کا سبب بنے گا۔

برزخ میں متوفی کا حصّہ:

سب سے بڑا عامل جو مُسلمانوں کو برزخ کے عذاب میں مبتلا رکھے گا مخلوقِ خدا کے حقوق اور اُن کے مال و عزت میں جو مرنے والے کے ذمہ واجب الادا ہوتے ہیں جب تک کہ ان حقُوق کو ادا نہیں کرے گا اور مال و عزت کے نقصان کی تلافی نہیں کرے گا اس عذاب سے کبھی نجات نہیں پا سکے گا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ متوفی کے ایسے باوفا اور خیر خواہ دوست ہوتے ہیں جو اُس کے حالات سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں اور اُس کے مالی اور ناموسی قرضوں سے باخبر ہوتے ہیں، اُن کی حدامکان کوشش ہوتی ہے کہ جیسا بھی ہو اس کے قرضے ادا کیے جائیں اور جن لوگوں سے معاف کرایا جا سکتا ہے اُن سے معافی مانگیں تا کہ مرنے والے کو عذاب سے چھٹکارا مل جائے۔

---

[1] بحار جلد ۳۱ ص ۳۵۱

مرنے سے پہلے وصیت:

بسا اوقات خود متوفی میں مالی استطاعت ہوتی ہے موت سے پہلے ایسے قرضوں کی ادائیگی کی فکر میں ہوتا ہے اور اپنے مرنے سے پہلے ہی وصیت کر جاتا ہے کہ اس کے وصی لوگوں کو اس کے قرضے ادا کردیں، جن سے معاف کرانا ضروری ہے اُن سے معافی مانگیں، اور کوشش کریں تاکہ کسی کا مال یا ناموس کا قرضہ اس کے ذمّہ باقی نہ رہ جائے۔ آیا متوفی کے دوست یا وصّی اس کی تمام مشکلات کو حل کر سکتے ہیں، اس کے ذمہ تمام قرضے ادا کر سکتے ہیں اور اسے ہر لحاظ سے نجات دلا سکتے ہیں؟ یہ بات مشکل معلوم ہوتی ہے۔

اپنے وصی خود بنو:

بہتر یہی ہے کہ جب تک ہر شخص قیدِ حیات میں ہے۔ اپنے کاموں کو خود ہی اصلاح کرے، اپنے آپ کو سدھارے، لوگوں کے واجب الادا قرضے اُنہیں ادا کرے، ان کے حقوق جو اس کے ذمہ ہیں، اُنہیں واپس لوٹائے۔ صاحبان حقوق سے معافی مانگ کر ان کی رضامندی حاصل کرے۔ خلاصہ کلام، جن کاموں کے متعلق وہ یہ چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد اس کے اوصیاء انجام دیں وہ کام خود اپنی زندگی ہی میں انجام دے کر جائے۔ اسی چیز کو امیر المومنین علی علیہ السلام نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

"یابن آدم کن وصّی نفسكَ فی مالكَ واعمل فیه ماتوثر ان یعمل فیه من بعدكَ۔"

''اے آدم کے بیٹے! تو اپنے مال میں اپنی ذات کا خود وصی بن، اور جن کاموں کے بارے میں تو اس بات کو پسند کرتا ہے کہ دوسرے لوگ تیرے مرنے کے بعد اُنہیں انجام دیں، تو خود ہی اپنی زندگی میں اُنہیں انجام دے کر جا۔''[1]

---

[1] نہج البلاغہ کلمہ نمبر ۲۵۴

مجلس نمبر 9

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰلَیۡتَ قَوۡمِیۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِیۡ رَبِّیۡ وَ جَعَلَنِیۡ مِنَ الۡمُکۡرَمِیۡنَ ﴿۲۷﴾ ۔"(یٰس)

آسمانی ادیان کی بُنیاد:

آسمانی ادیان جوانسانی سعادت کا سرمایہ ہیں، باطنی ایمان اور قلبی یقین کی بنیادوں پر استوار ہیں اللہ کے تمام انبیا نے ہر دور میں اپنی دینی تعلیمات کی روشنی میں لوگوں کو اس بات کی دعوت دی ہے کہ خالق کائنات اس کی صفات خدا کے فرشتوں اللہ کی وحی انبیاء کی نبوت قیامت کے قیام مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے اعمال کی جانچ پڑتال اور خدا کے ثواب وعذاب پر ایمان اور یقین رکھیں۔

غیر محسوس حقائق:

ہم جانتے ہیں کہ ان تمام حقائق کا تعلق غیب سے ہے جو ہر ایک سے پوشیدہ ہیں، انسان خدائی راہنمائی کے بغیر خدا کو کماحقہ نہیں پہچان سکتا۔ اسے جسم سے منزہ اور جسمانی اعضاء سے مبرا نہیں جان سکتا، انسان انبیاء کی ہدایت کے بغیر حضرت باری تعالیٰ کی تمام صفات کے بارے میں نہیں سوچ سکتا اور ہر صفت کو حقیقت کی نگاہوں سے نہیں جان سکتا، مثلاً وہ اپنی فکر کے ذریعہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ خداوند عالم عفو ورحمت کے موقع پر ارحم الرحمین اور عذاب وسزا کے معاملہ میں اشد المعاقبین کیسا ہے؟ بلکہ یہ اور اس قسم کی دوسری خدائی صفات مکتبِ انبیاء میں بیان ہوئی ہیں، اسی طرح انسان، خدا کی وحی، فرشتوں کے وجود، انبیاء کی نبوت، عالم آخرت، قیامِ قیامت، مردوں کے زندہ ہونے، دنیاوی کاموں کے بارے میں حساب وکتاب، بہشت ودوزخ اور اس قسم کے کئی دوسرے امور سے بے خبر اور ناآگاہ ہے۔

غرض تمام خدائی ادیان ایک سلسلہ غیب اور غیر محسوس حقائق پر مشتمل رہے ہیں اور ہر ایک آسمانی دین کے حقیقی پیروکار تمام زمانوں میں اپنے دور کے انبیاء کی ہر بات اور دینی تعلیم کو وحی الٰہی سمجھتے تھے اور ہر اس غیب پر ایمان رکھتے تھے جو دین پر مشتمل تھا۔ قرآنِ کریم اسلام پر ایمان رکھنے والے اور صحیح معنوں میں متقی افراد کے بارے میں یوں فرماتا ہے۔

ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚۖ فِیۡہِ ۚ ہُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ

”یہ کتاب کہ جس میں کوئی شک نہیں ہے ان پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور راہنمائی ہے جو غیب اور دین کی ان دیکھی چیزوں پر ایمان رکھتے۔“[1]

دین میں غیب مطلق کا تصوّر:

ایک نکتہ جو زیادہ توجہ کے قابل ہے وہ یہ کہ دین خدا میں غیب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مطلقاً غیب اور دوسرے نسبتہً غیب۔ مطلقاً وہ ناشناختہ حقائق ہوتے ہیں جو کسی بھی وقت کسی بھی صُورت میں کسی بھی انسان کے لیے ظاہر نہیں ہوتے اور انسان کسی بھی صورت میں ان کی حقیقتوں تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا۔ جیسے خدا کی ذات اور اس کی صفات کا غیب۔ جو انسان کائنات کی دوسری چیزوں کی طرح خدا کی مخلوق ہے وہ اپنے فکر وخرد کی طاقت کے ذریعہ اپنے خالق کی حقیقت کو کب ورک کرسکتا ہے؟ اور اس کی غیر محدود ذات اور صفات کا اپنے محدود علم کے ذریعہ کب احاطہ کرسکتا ہے؟ جیسا کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام خدا کی عظمت کے بارے میں فرماتے ہیں۔

انسانی عقل کی نارسائی:

"کلت الالسن عن غایة صفته والعقول عن کنه معرفة"

”زبانیں اس کے کمال کی صفات کو بیان کرنے سے اور عقلیں اس کی ذات کی حقیقت کو پہچاننے سے عاجز اور ناتواں ہیں۔[2]

نیز دعائے عرفہ میں اپنے رب کی بارگاہ میں عرض پرواز ہیں:

"انت الذی قصرت الاوهام عن ذاتیتك وعجزت الانهام عن کیفتك"

بارالٰہا! تیری ذات تو ایسی ہے کہ جس کی پہچان کے لیے ادارکات کوتاہ اور نارسا ہیں اور تیری کیفیت کی شناخت کے لیے عقول وافہام عاجز اور ناتواں ہیں۔“[3]

---

[1] سُورہ ۲ آیہ ۲

[2] صحیفہ سجادیہ، پیر کے دن کی دعا

[3] صحیفہ سجادیہ عرفہ کے دن کی دعا

دین میں نسبتۂ غیب کا تصوّر:

دین میں نسبتۂ غیب ان حقائق کو کہتے ہیں جو ایک لحاظ سے مخفی اور دوسرے لحاظ سے ظاہر ہیں، جیسے مرنے کے بعد کے عالم کی حقیقتیں جو دنیاوی زندگی میں انسان کے لیے مخفی اور ان دیکھی ہیں۔لیکن وہ جونہی موت کی وادی میں اُترنا شروع کرتا ہے وہ غیبی حقائق بھی یکے بعد دیگرے ظاہر ہونا شروع ہوجاتے ہیں فرشتوں کا مشاہدہ کرتا ہے گذشتہ لوگوں کی ارواح کو دیکھتا ہے، برزخ کے ثواب وعذاب سے آگاہ ہوتا ہے۔غرض مرنے کے بعد کی دُنیا کے حقائق سے آگاہ ہوتا ہے۔

برزخ میں مومن کی آرزو:

اگر دُنیا میں ایماندار تھا، خدا نے اس کی لغزشوں کو معاف کردیا اور اسے اپنی نعمت اور رحمت میں شامل کردیا تو اس بات کی تمّنا کرے گا کہ اس کے دوست احباب اور عزیز واقارب بھی اس کی اس کیفیت سے مطلع ہوجائیں جو اُن کے اُوپر مخفی ہے اور خود اس کے لیے ظاہر وعیاں ہے۔اور اُنہیں یہ بھی پتہ چل جائے کہ رحمتِ الٰہی میرے شامل حال ہوچکی ہے۔قرآن میں ہے۔

يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿٢٧﴾

''اے کاش! میری قوم جان لیتی کہ میرے رب نے مجھے معاف کردیا ہے اور مجھ کو عزت اور تکریم بخشی ہے۔''[1]

دولت جمع کرنے والوں کی برزخ میں آرزو:

اگر دُنیا میں غلط رستوں پر چلتا رہا جب برزخ میں اپنی لغزشوں اور اپنے گناہوں سے مطلع ہوگا تو سخت پریشان اور غمگین ہوگا اور اس بات کی آرزو کرے گا کہ اپنی تاریک اور گھمبیر انجام سے اپنے دوست واحباب اور عزیز واقارب کو مطلع کرے اور اُنہیں اس بات کی طرف توجہ دلائے کہ جس راہ پر چلتا رہا ہے وہ اس پر نہ چلیں اور اپنے نامہ اعمال کو سیاہ نہ کریں جیسا کہ رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

"وهو نيادى ياأهلي ويا ولدى لاتلعبن بكم الدنيا كما بعت بي فجمعت المال مين من حله وغيره حله، ثم خلفته يغرى فلمهناله ولتبعة على

---

[1] سورہ ۳۶، آیہ ۲۶

فاخذروا مثل ماحل بی۔"

"مرنے کے بعد متوفی کی روح پکارتی ہے اے میرے اہل وعیال! خبردار رہنا! دُنیا تمہیں اپنے کھیل میں نہ لگادے جس طرح اُنہوں نے مجھ سے کھیل کھیلا ہے اور مجھے غافل کردیا ہے۔ میں نے مال کو ہر حرام اور حلال ذرائع سے اکٹھا کیا اور پھر دوسروں کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔ اب عیش وآرام اور زندگی کے مزے تو اُن کے لیے ہیں اور خطرناک انجام میرے لیے ہے۔ لہٰذا تم اس وبال سے بچو جو میرادامن گیر ہو چکا ہے۔"[1]

برزخ والوں کے لیے قیامت کے غیب:

جولوگ اس دُنیا سے اُٹھ جاتے ہیں تو اُن کے لیے عالم برزخ کے غیب جو مرنے کے بعد کے عالم کا ایک حصّہ ہیں ظاہر ہوجاتے ہیں، لیکن اس کائنات کا خاتمہ، قیامت کا قیام، مردوں کا زندہ ہوجانا، حساب وکتاب کی آخری جانچ پڑتال، انسانوں کا آخری انجام اور اس قسم کے دوسرے اُمور جو قیامتِ کبریٰ سے متعلق ہیں پر وہ غیب میں رہتی ہیں اور جورُوحیں اس وقت عالمِ برزخ میں ہیں وہ اپنے مستقبل کے حالات سے بالکل بے خبر ہیں اور اُنہیں معلوم نہیں ہے کہ قیامت کے دن اُن کی کیا کیفیت ہوگی۔ برزخیوں کے لیے قیامت کا غیب اسی نسبت سے ہے جس نسبت سے دُنیاوالوں کے لیے برزخ کا غیب ہے۔

بہشت والے دوزخ والوں سے پُوچھیں گے:

جس طرح زندگی کے خاتمہ اور موت کے آجانے سے متوفی پر برزخ کے غیب ظاہر ہوجاتے ہیں اسی طرح دُنیا کی زندگی کے خاتمہ اور قیامت کے قیام کے وقت برزخ والوں کے لیے آخرت کے غیب عیاں ہوجائیں گے۔ اس دن مومنین اور کفّار کو انبیاء کرام کے فرامین کی اصل حقیقت معلوم ہوگی۔ اُنہیں غیب کی خبروں کا پتہ چلے گا جو وحی کے ذریعہ انبیائؑ اُنہیں دے چکے تھے۔ حساب میزان، بہشت اور دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اور خداوندِ عالم کے ثواب وعذاب کی تمام خصوصیت سے آگاہ ہوجائیں گے قرآن فرماتا ہے۔

وَنَادٰٓی اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلۡ

---

[1] بحارالانوار جلد ۳ ص ۱۳۶

وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ

''بہشت والے جہنم والوں کو پکار کر پُوچھیں گے کہ جس چیز کا خداوندِ عالم نے ہم سے برحق وعدہ کیا تھا ہم نے تو اُسے پالیا ہے آیا تم سے جو تمہارے رب نے برحق وعدہ کیا تھا اُسے تم نے پالیا ہے تو وہ جواب میں کہیں گے کہ ہم نے بھی خدا کے برحق وعدہ کو پالیا ہے۔''[۱]

لوگ اپنے کل سے بے خبر ہیں:

جس دُنیا میں ہم زندگی بسر کررہے ہیں، بہت سے غیب موجود ہیں لیکن ان میں سے بیشتر مرنے کے بعد غیب کی مانند نسبی ہیں جو مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ واضح اور آشکار ہوتے جائیں گے۔ خداوندِ عالم نے اپنے علم وحکمت کی وجہ سے آئندہ کے دروازے لوگوں پر بند کردیے ہیں اور جو حوادث آئندہ دنوں، مہینوں یا سالوں میں رونما ہوں گے وہ لوگوں سے مخفی رکھے ہیں اور نظامِ عالم کی ایسے انداز میں بُنیاد رکھی ہے کہ لوگ اپنے اور دوسرے لوگوں کے آئندہ حالات سے باخبر نہ ہوسکیں اور کائنات کے غیب سے واقف نہ ہولیکن۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

''وما تدرِی نفس ماذا تکسب غداً وما تدرِی نفسٌ بایِّ ارضٍ تمُوتُ۔''

''کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ کل کیا کرے گا اور کوئی نہیں جانتا کہ کس سرزمین میں مرے گا۔''[۲]

یقیناً یہ بے خبری اور ناآگاہی انسانی زندگی کی انفرادی اور اجتماعی مصلحتوں پر مبنی ہے، اگر اس کے علاوہ کوئی اور بات ہوتی تو اُمید اور آرزو کی حالت جو تمام تحرکات اور سرگرمیوں کا سبب ہے اور زندگی کی رونق اس سے وابستہ ہے یکسر ختم ہوجاتی اور لوگوں کو زندگی میں عظیم خلل اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔

لاعلمی کی وجہ سے مسرّت اور خوشی:

مثال کے طور پر: انسان کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ اس کی یقینی موت کب آئے گی؟ اور اسی لاعلمی کی بنا پر وہ اپنی زندگی کے ساتھ خوش ہے اور وجد وسُرور کے ساتھ زندگی بسر کررہا ہے۔ اگر بالفرض اس کی موت سے صرف دو دن باقی رہ گئے ہوں اور چُونکہ اُسے اس بات کا علم نہیں ہے لہٰذا وہ لمبی عمر کی آرزو میں خوشی خوشی اپنے کاموں میں مشغول ہے اسی طرح پوری دلچسپی اور سرگرمی کے ساتھ اپنے کاروبار میں لگا ہوا ہے، لیکن اگر اُسے پتہ چل جائے کہ اس کی حتمی موت دو دن بعد بلکہ دو سال

---

[۱] سُورہ ۷ آیت ۴۴

[۲] سُورہ ۳۱ آیت ۳۴

بعد واقع ہوگی اور فلاں دن اور فلاں گھڑی وہ یقیناً موت کا جام نوش کرے گا تو آج ہی سے وہ خود کو مُردہ سمجھنے لگے گا، مایوسی اور نا اُمیدی کے سمندر میں ڈوب جائے گا اور اُس کی بقیہ زندگی تلخی، ترشی اور افسردگی کا شکار ہوجائے گی۔

علم غیب کی آرزو:

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم علم غیب جانتے اور اپنے مستقبل سے باخبر ہوتے تو بہت نفع کماتے اور نقصان اور خسارے سے بچ جاتے۔ مثلاً فلاں تجارتی سودے کے لیے ایسی چیزیں خریدتے جو مستقبل میں مہنگی ہوجاتیں اور ایسی چیزیں بیچتے جو بعد میں سستی ہوجاتیں۔

ان سے کہنا چاہیے، اگر مراد علم غیب سے تمہاری مراد عمومی ہے یعنی خداوند عالم انسان کو اس طرح خلق فرماتا ہے کہ سب لوگ غیب کو جانتے ہوتے، تب بھی تمہارا مقصد پُورا نہ ہوتا اور تمہاری آرزوں کی کما حقہ تکمیل نہ ہوپاتی، کیونکہ یہ صرف آپ ہی نہیں ہیں جنہیں منافع کی خواہش اور نقصان سے بچنے کی آرزو ہوتی ہے بلکہ آپ کی طرح دوسرے لوگ بھی تو غیب جانتے ہوتے اور اُن کی بھی یہی تمنّا ہوتی، لہٰذا وہ بھی آپ ہی کی طرح عمل کرتے، بنابریں اگر کسی کے پاس قابلِ فروخت مال ہوتا اور اسے معلوم ہوتا کہ کل اس کی قیمت بڑھ جائے گی تو وہ آج آپ کو فروخت نہ کرتا بلکہ کل کے لیے اپنے پاس رکھتا تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ منافع ملے۔ اسی طرح اگر کوئی جانتا ہوتا کہ جو مال آپ کے پاس ہے کل اس کی قیمت گر جائے گی تو وہ آج آپ سے نہ خریدتا بلکہ کل کی انتظار میں رہتا اور کم قیمت پر آپ سے وہ مال خریدتا۔

بے جا توقع:

اور اگر غیب جاننے سے آپ کی مراد یہ ہے کہ صرف آپ ہی غیب کو جانتے اور دوسرے تمام لوگ لاعلم اور ناآگاہ ہوتے تاکہ آپ زیادہ سے زیادہ منافع کما سکتے اور نقصان اور خسارے سے بچ جاتے، البتہ ایسی صُورت میں آپ اپنے مقصد کو تو پہنچ جاتے، لیکن یہ بات آپ کو ذہن نشین کرنی پڑے گی کہ اس طرح سے آپ کی سوچ کا مقصد یہ ہوتا کہ اے کاش! خداوند عالم اپنی تخلیق کے حکیمانہ نظام کو میرے بارے میں پیشِ نظر نہ رکھتا، مجھے تمام انسانوں کی تخلیق کے قانون سے مستثنیٰ قرار دے دیتا اور علم غیب کا جوہر میرے وجود میں برقرار کرتا۔ آیا حکمت والے خدا سے اس قسم کی توقّع رکھنا صحیح ہے؟ اور آیا اس قسم کی خودغرضی پر مبنی سوچ بجا ہے؟

غیب کا علم صرف خدا جانتا ہے:

تمام کائنات اور جہان ہستی میں علم غیب صرف اور صرف ذات اقدس پروردگار سے مخصوص ہے اور زمین وآسمان کی

کوئی بھی مخلوق خواہ وہ انسان ہو یا غیر انسان بالاصل اور بالذات غیب سے آ گاہ نہیں ہے، اور بذاتِ خود اس مقدس حریم میں داخل نہیں ہے، جیسا کہ خدا فرماتا ہے:

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ

''کہہ دیجیے کہ علمِ غیب صرف اور صرف خداوند دانا وتوانا سے مخصوص ہے اور زمین وآسمان میں رہنے والا کوئی بھی غیب کو نہیں جانتا۔''[1]

صرف وہی لوگ کسی حد تک اس صفت سے موصوف ہو سکتے ہیں جن کے بارے میں خدا کا ارادہ ہوتا ہے اور جتنی مقدار کہ خدا کو منظور ہوتی ہے غیب سے مطلع ہوتے ہیں اور اسی بات کی قرآن مجید کی بعض آیات میں تصریح کی گئی ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ص

''ایسا نہیں ہوسکتا کہ خدا تمہیں غیب سے آ گاہ کرے، لیکن خدا اپنے رُسولوں کے درمیان سے جن لوگوں کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے اور اُنہیں اس فیض سے بہرہ مند کرتا ہے[2]۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ

''خدا عالم الغیب ہے اور کسی کو اپنے غیب سے آ گاہ نہیں کرتا، مگر جس رُسول کو وہ پسند فرماتا ہے۔[3]''

خدا کے حُکم سے غیب سے آ گاہی:

بنا بریں غیب سے آ گاہی کا ایک راستہ تو خداوندِ عالم کی رضا اور اجازت ہے، یہ جو خدا کے برگزیدہ اولیاء وانبیاء اپنی زندگی میں غیب کی خبریں دیا کرتے تھے تو وہ اذن پروردگار اور اس کی مقدس ذات کے الہام کی وجہ سے تھا۔

سچّے خوابوں کے ذریعہ غیب کا علم:

غیب سے مطلع ہونے کا ایک اور رستہ جس میں خدا کی رضا اور اجازت ہے وہ ''سچے خواب'' ہیں۔ انسان اپنی

---

[1] سورہ ۲۷، آیت ۶۵

[2] سورہ ۳ آیت ۱۷۹

[3] سورہ ۷۲ آیت ۲۶

زندگی میں بہت سے خواب دیکھتا ہے لیکن ان کا بہت بڑا حصّہ یا تو ان کے باطنی ضمیر اور اندرونی افکار کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جو نیند کی حالت میں خوابوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یا پھر پریشان خیالی کا مظہر ہوتے ہیں جو کچھ نیند میں اور کبھی بیداری کی حالت میں ظاہر ہوتے ہیں اور انسان کو غمگین اور پریشان کر دیتے ہیں۔ صرف تھوڑے سے خواب ایسے ہوتے ہیں جن میں خدا کی طرف سے الہام اور بشارت کا پہلو ملتا ہے اور ان جانے اور مخفی حقائق کو کبھی تو ان کے حقیقی روپ میں بیان کرتے ہیں اور کبھی کسی اور قالب میں ڈھال کر بطور نمونہ ظاہر کرتے ہیں اور جن لوگوں میں تعبیر خواب کا ذوق پایا جاتا ہے اور خواب کی ابجد سے واقف ہیں وہ اس کی صحیح معنوں میں تعبیر اور تفسیر کر سکتے ہیں اور ان میں موجود غیب کی خبروں کو اخذ کر کے پیش کر سکتے ہیں۔

یہاں پر ہم خواب کی ان دونوں قسموں میں سے ہر ایک کی طرف اشارہ کریں گے اور ایک اچھے خواب کا تذکرہ کریں گے جو آج سے پندرہ سو سال قبل رُسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جدِّ گرامی حضرت عبدالمطلب نے دیکھا تھا۔

مکّہ میں پانی کی قلّت اور کنوئیں کی کھُدائی:

حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور اُن کے فرزند اسماعیل علیہما السلام نے خدا کے حکم سے خانہ کعبہ کی بُنیاد رکھی اور اس مقدس گھر کی تعمیر کی۔ اسماعیل علیہ السلام نے مکّہ میں سکونت اختیار کی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ہر سال حج کے موقعہ پر مکّہ آجایا کرتے تھے جناب اسماعیل علیہ السلام نے اپنے والد سے پانی کی کمی کی شکایت کی اور اُن سے اس سلسلے میں چارہ جوئی کرنے کی درخواست کی۔ خداوندِ عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی اور اُنہیں کنواں کھودنے کا حکم دیا تاکہ اس کنوئیں سے حاجیوں کی پیاس بجھتی رہے اور آنے والوں کے لیے رفاہ عامہ کا بندوبست ہو، البتہ اس سرزمین میں کسی ایسے کنوئیں کی کھُدائی سخت دشوار تھی جس سے پانی حاصل ہو اور اس سے استفادہ کیا جا سکے، لیکن جرائیل امین نے حکم الٰہی سے اس نقطہ کی نشاندہی کی جہاں اس وقت چاہ زمزم ہے چنانچہ اس مقام کی کُھدائی کی گئی اور خلافِ توقع مختصر سی کھُدائی کے بعد پانی نکل آیا اور وہ خداوند عالم کی اس عنایت پر بہت خوش ہوئے۔ پھر جناب جرائیلؑ نے کہا کہ کنوئیں کی گہرائی میں اُتر کر اس کے چاروں کونوں میں خدا کا نام لے کر کسی ماریں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور ہر کونے سے پانی پھُوٹ پھوٹ کر باہر آنے لگا۔ جرائیلؑ نے کہا ابراہیمؑ! اب آپ بھی یہ پانی پئیں اور اپنے بیٹے کے لیے بھی کنوئیں میں برکت کی دُعا کریں۔ پھر جرائیلؑ اور ابراہیمؑ دونوں کنوئیں سے باہر آ گئے۔ [1]

---

[1] سفینۃ البحار ص ۵۵۵ (مادہ زمزم)

قبیلہ جرہم نے چاہ زمزم کو بند کر دیا:

اس زمانے میں مکہّ شہر پر قبیلہ جرہم کا تسلّط اور حُکمرانی تھی اور حرم کی کُنجی بھی اُنہیں کے پاس تھی۔ دُور اور نزدیک سے آنے والے لوگ جو نذرونیاز اور چڑھاوے چڑھاتے تھے وہ بھی حرم کعبہ کے متولیوں کے پاس چلے جاتے اور اس امر کے لیے مخصوص خزانوں میں محفوظ کر لیے جاتے، چنانچہ روایات میں ہے کہ۔

"کان فی الکعبۃ غزالان من ذھب وخمسۃ اسیاف فلما غلب خزاعۃ علی جرھم علی الحرم القت جرھم السیاف والغزالین فی بئر زمزم والقوافھا الحجارۃ وطمعوھا واعموا اثرھا فلما غلب قصی علی خزاعۃ لم یعرفوا موضع زمزم وعمیٰ علیھم موضعھا۔"

''کعبہ میں موجود قیمتی اشیاء میں سونے کے دو ہرن اور پانچ تلواریں بھی تھیں۔ جب قبیلہ خزاعہ کی بنی جرہم پر فتح وکامیابی کے آثار نمایاں ہو گئے اور جرہم کے خزانہ اور حرم سے انخلاء کے آثار یقینی ہو گئے تو اُنہوں نے جلدی سے سونے کے دونوں ہرن اور پانچ قیمتی تلواروں کو چُپکے سے خزانے سے نکالا اور چاہ زمزم میں ڈال دیا اور پھر پتھروں سے بھر کر اُسے بند کر دیا اور کنوئیں کا نشان مٹا دیا۔ اسی حالت میں چند نسلیں گزر گئیں۔ یہاں تک کہ قصی نے بنی خزاعہ پر غلبہ پا لیا اور مکّہ کی فرمانروائی اپنے ہاتھوں میں لے لی، اس وقت مکہّ میں چاہ زمزم کا نام تو سُنا جاتا تھا، لیکن اس کے نشان کا کسی کو پتہ نہیں تھا۔''

الہام پر مبنی خواب:

زمانہ گزرتا رہا یہاں تک کہ جناب عبدالمطلب کی سیادت کا دور آ پہنچا، وہ اس قدر باعظمت انسان تھے کہ اپنے آرام کے لیے خانہ کعبہ کی دیوار کے سایہ میں اپنے بستر بچھا کر آرام فرمایا کرتے تھے۔ اور آپ سے پہلے کسی نے بھی ایسا کام نہیں کیا تھا۔ ایک مرتبہ جب عبدالمطلب کعبہ کی دیوار کے سایہ میں سوئے ہوئے تھے تو خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص اُن کے پاس آ کر کہتا ہے کہ ''چاہ زمزم کو کھودو اور اس کی جگہ وہی ہے جہاں پر سفید بالوں وکوا بیٹھتا ہے اور چیونٹیوں کی بل بھی ساتھ ہے جہاں زمزم کا کنواں تھا وہاں پر ایک پتھر رکھا ہوا تھا جس کے نیچے چیونٹیاں رہتی تھیں اور جب وہ دن کے وقت اپنی بل سے باہر نکلتی تھیں تو وہ کوّا انہیں اپنی چونچ کے ساتھ چُن چُن کر کھا جاتا تھا، چنانچہ جناب عبدالمطلب نے اس خواب کی بنا پر زمزم کے حقیقی مقام کو تلاش کر لیا اور خود بھی اور اُن کے فرزند نے بھی مل کر اس جگہ کو کھودا، پتھروں اور ریت کو ہٹایا اور پانی تک پہنچ گئے

جب پانی تک پہنچ گئے تو نعرہ تکبیر بلند کیا۔'' [1]

نامعلوم جگہ کی شناخت:

اس خواب میں چاہ زمزم کی وہ جگہ جو اس وقت تک کے لوگوں کے لیے نامعلوم تھی اپنی صحیح اور حقیقی صورت میں ظاہر ہو کر سامنے آ گئی اور عبدالمطلب نے بھی وہ خواب دیکھ کر کسی تعبیر دینے والے کی امداد کے بغیر کنویں کی ناساختہ اور نامعلوم جگہ کو پہچان لیا اور ایک مخف مقام کا اُن کو الہام ہو گیا۔

عبدالمطلب کا خواب:

ایک اور موقع پر عبدالمطلب حجر اسود کے نزدیک سوئے ہوئے تھے کہ عالمِ خواب میں ایک منظر دیکھا جو اُن کے نزدیک ایک عظیم منظر تھا اور اس منظر کی وجہ سے وہ وحشت زدہ اور پریشان ہو گئے۔ خواب کی تعبیر بیان کرنے والے کے پاس گئے اور اپنے خواب کو یوں بیان کیا۔

''میں نے عالمِ خواب میں دیکھا ہے کہ میری پیٹھ پر ایک درخت اُگ آیا ہے جو آسمان کی طرف بلند ہے اور اس کی ٹہنیاں اور شاخیں مشرق و مغرب میں پھیل چکی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ایک نُور اس درخت سے روشن ہوا جو سُورج کی روشنی سے کئی درجے زیادہ چمکدار تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ اس نُور کو عرب و عجم کے لوگ سجدہ کر رہے ہیں جُوں جُوں دن گزرتے جاتے ہیں اس درخت کا نُور بڑھتا جاتا ہے قریش کے کچھ افراد اس درخت کو بیخ وُ بن سے اُکھاڑ دینا چاہتے ہیں لیکن جونہی وہ اس بُرے ارادے سے درخت کے نزدیک جانا چاہتے ہیں تو ایک نوجوان جس کا چہرہ سب سے زیادہ خُوبصورت اور جس کا لباس سب سے زیادہ پاکیزہ تھا اُنہیں پکڑ لیتا ہے ان کی کمر توڑ ڈالتا ہے اور ان کی آنکھیں پھوڑ ڈالتا ہے۔ میں جونہی اپنا ہاتھ اس درخت کی طرف بڑھاتا ہوں تو وہ نوجوان پکار کر کہتا ہے کہ آپ کا اس درخت میں کوئی حصّہ ہے جب کہ درخت مجھ سے ہے؟ اُس نے جواب دیا، یہ درخت ان لوگوں کے لیے ہے جو اس درخت کو پکڑ چکے ہیں اور اس کی ٹہنیوں کو مضبوطی سے تھام چکے ہیں۔ یہ سُن کر معبر کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا اور کہنے لگا۔

"لئن صدقت ليخرجن من صلبك ولد يملك الشرق والغرب وينبأ في الناس......وكان ابوطالب يحدث بهذا الحديث والنبي قد خرج ويقول كانت الشجرة والله ابا القاسم الامين۔"

---

[1] کافی جلد ۴ ص ۲۱۹

''اگر آپ سچ کہتے ہیں اور اس خواب کو دیکھا ہے تو آپ کو صلب سے ایک بیٹا پیدا ہوگا جو مشرق اور مغرب کو اپنے قبضہ میں لے لے گا اور خدا کی خبریں لوگوں تک پہنچائے گا......یہی وجہ ہے کہ جناب ابوطالب اپنے والد کا خواب ہمیشہ بیان کرتے رہتے تھے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث برسالت ہوگئے اور حکم خدا کے ساتھ قیام فرمایا تو ابوطالب فرمایا کرتے تھے کہ خدا کی قسم وہ درخت ابوالقاسم امین ہے۔[1]

میلادِ پیغمبرؐ کی خوشخبری:

معبّر کی تعبیر کے مطابق اس خواب میں چند غیبی خبریں مخفی تھیں جو کئی سال گزرنے کے بعد تدریجی طور پر جامۂ عمل پہنتی رہیں:

1 عبدالمطلب کی صلب سے ایک بیٹا متولد ہوگا۔ 2 وہ بیٹا مشرق اور مغرب کا فرماں روا بنے گا۔ 3 خدا کی خبریں لوگوں تک پہنچائے گا۔ 4 جوں جوں دن گزرتے جائیں گے اس کے جلوہ اور روشنی میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ 5 کچھ قریشی اس کی مخالفت کریں گے اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کریں گے۔ 6 ایک جوان اس کا دفاع کرے گا اور اس کے دشمنوں کا ستیاناس کردے گا۔ (یہ جوان علی ابن ابی طالب کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا) 7 عبدالمطلب کا ہاتھ اس درخت تک نہیں پہنچ پائے گا کیونکہ وہ بعثت رُسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے ہی خدا کو پیارے ہوجائیں گے۔

ایک خواب اور کئی غیبی خبریں:

یہ خبریں صراحت کے ساتھ تو خواب میں بیان نہیں ہوئیں، لیکن تعبیر بیان کرنے والے نے جو تعبیر خواب کی ابجد سے واقف تھا، تعبیر کے کچھ نمونوں کے ذریعہ غیب کی چند حقیقتوں کی خبر دے دی۔

سچے خواب یا خدا کا الہام:

قرآن مجید اور اسلامی روایات میں سچے خوابوں کے کئی نمونے بیان ہوئے ہیں۔ گذشتہ ادوار میں بھی اور ہمارے دَور میں بھی دُنیا کی مختلف قوموں میں اس کے کئی نمونے ملتے ہیں۔ اس قسم کے خواب ہیں جن میں خدا کی خوشخبریاں اور اس کی طرف سے مذکورا الہام ہوتے ہیں۔ غیب کی خبر دیتے ہیں۔ مخفی اور پنہاں حقائق کو آشکار کرتے ہیں اور بعض دینی روایات کے

---

[1] امالی صدوق ص ۱۵۸

مصداق ہوتے ہیں جیسا کہ ایک حدیث میں رُسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"ان للرئویا جزء من ستہ واربعین جزء اًمن النبوة"خواب نبوت کی ۱۴۶ اجزاء میں سے ایک جزو ہے۔[۱]

خواب میں خدا کا کلام:

عبادہ بن صامت نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خدا کے اس فرمان کے بارے میں دریافت کیا "لُھم البشریٰ فی الحیٰوۃ الدُّ نیا" (سُورہ۱۰ آیت ۲۴) یعنی ان کے لیے دنیاوی زندگی میں خوشخبری ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ھی الرئویا الصالحۃ یراھا المومن لنفسہ اوتُری لہ وھو کلام یکلم بہ ربك عبدَہٗ فی المنام"

"اس خوشخبری سے مراد جو قرآن میں مومنین اور متقین کے لیے آئی ہے وہ سچے اور صالح خواب میں جو خود مومن دیکھتا ہے یا دوسرے لوگ اس کے لیے دیکھتے ہیں اور اس قسم کے خواب فی الواقع وہ کلامِ ہیں جس کے ذریعہ خدا اپنے بندے سے خواب کی حالت میں گفتگو کرتا ہے۔"[۲]

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا ایک اور فرمان ہے۔

"انہ لم یبق بعدہ من النبوۃ الا المبشرات وھی الرئویا الصالحۃ۔"[۳]

"ان کے بعد وحی ونبوّت کا سلسلہ تو ختم ہو چکا ہے لیکن خدا کی خوشخبریاں باقی ہیں یعنی وہ ہیں سچّے اور صالح خواب۔"[۴]

شاعر کہتا ہے۔

نگر	خواب	رابیھدہ	ننگری
یکی	بہرہ	دانش	زپیغمبری

---

[۱] امالی صدوق ص ۱۵۸

[۲] السماء والعالم، ص ۴۴۲

[۳] فصل ابنِ حزم حصّہ پنجم ص ۱۴

[۴] السماء والعالم، ص ۴۴۲

روانہائے روشن بہ بیند بخواب
ہمہ دیدنیہا چو آتش در آب

یعنی دیکھو! خواب کو فضول مت سمجھو!! کیونکہ وہ نبوت کے اجزا میں سے ایک جز و ہے۔ صاحبِ علم عقلیں خواب دیکھتی ہیں، وہ خواب ایسے ہوتے ہیں جیسے پانی میں آگ ہوتی ہے۔

غیب سے انسان کی دلچسپی:

انسان کو غیب سے بہت دلچسپی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے مستقبل سے زیادہ سے زیادہ باخبر ہوتا کہ ہر زمانے اور ہر جگہ میں اپنے آپ کو فتح و کامرانی سے ہم آہنگ کر سکے اور اپنی زندگی ہی میں ایسے راستے کا انتخاب کر سکے جس کا انجام عزّت اور فضیلت پر ہو اور ہر لحاظ سے اس کے مفادات محفوظ رہ سکیں۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ اس کی دوستی ہو جن کا مستقبل روشن ہوتا ہے تا کہ اُن کے مقام اور مرتبے سے فیض یاب ہو سکے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسروں کے مافی الضمیر سے آگاہ ہوتا کہ اُن کے مقام اور مرتبے سے فیض یاب ہو سکے۔ اپنے دوست و دُشمن کو اچھی طرح پہچان سکے اور ہرایرے غیرے کی چرب زبانی سے بچ سکے۔

سچے خواب تو ممکن ہے کہ زندگی میں ایک دوبار دکھائی دیں اور ضروری یا غیر ضروری حقائق سے پردہ اُٹھائیں، لیکن یہ انسان کی غیر محدود توقعات کے لیے کافی نہیں ہیں اور اسے قانع بھی نہیں کر سکتے اور اس کی اس سخت پیاس کو بھی نہیں بجھا سکتے کہ وہ غیب سے کماحُقہ واقف ہو سکے۔ اسی لیے وہ ہمیشہ مستقبل کی فکر میں رہتا ہے اور کسی بھی ذریعہ کو اختیار کرنے میں عار نہیں سمجھتا اس لیے کہ وہ اپنی آئندہ کل سے باخبر رہنا چاہتا ہے کہ کل کیا ہوگا؟ کیا واقعات درپیش آئیں گے؟ اور اس کا کیا انجام ہوگا؟

غیب جاننے کے دعویدار:

کچھ لوگوں نے انسان کے اس شدید اور عظیم رُجحان سے کئی ناجائز مفادات اُٹھائے ہیں، مکر و فریب سے کام لے کر لوگوں کو خوابِ غفلت میں ڈال کر اُنہیں لُوٹا ہے۔ گزشتہ صدیوں سے آج تک بہت سے ایسے لوگ دُنیا میں پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے لوگوں کو کہانت، ستارہ شناسی، ساحری، جادوگری، فال گیری، رمّالی، ہاتھ ریکھا اور اس قسم کے مختلف طریقوں کے دعویدار بن کر کہنے لگے کہ ہم ان ذرائع سے غیب کی دُنیا سے آگاہ ہو سکتے ہیں، آنے والی کل کے متعلق خبر دے سکتے ہیں اور لوگوں کو ان کے مقدر سے آگاہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ اس بات کا دعویٰ بھی کرنے لگے کہ ان کے بُرے انجام کو اچھے

انجام میں تبدیل کر سکتے ہیں اور مستقبل میں درپیش خطرات کو بھی ان سے دُور کر سکتے ہیں۔

خرافات پر مبنی یہ کام جن کا دارومدار اوہام اور خیالات پر ہوتا ہے عالم غیب کی طرف تو کوئی راہ پیدا نہ کر سکتے ہیں اور مستقبل میں درپیش خطرات کو بھی ان سے دُور کر سکتے ہیں۔

خرافات پر مبنی یہ کام جن کا دارومدار اوہام اور خیالات پر ہوتا ہے عالم غیب کی طرف تو کوئی راہ پیدا نہ کر سکے، تاریک مستقبل کو بھی روشن نہ کر سکے۔ اور مفید خبروں کے ذریعہ انسان کو بھی کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے، البتہ لوگوں کے سکُون وآرام کو غارت کرنے، تشویش اور پریشانی میں اضافہ کرنے، لوگوں کو ایک دوسرے کے متعلق بدگمان کرنے، دلوں میں عداوت اور کینے کا بیج بونے اور تباہی اور فساد برپا کرنے میں ضرور موثر ثابت ہوئے۔

جادوگری وغیرہ کے نقصانات:

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوستی، دشمنی میں بدل گئی، بہت سے اموال ضائع ہو گئے، بے گناہوں کے خُون زمین پر بہہ گئے۔ لوگوں میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہو گیا، بدبختی اور سیاہ روزی کے اسباب پیدا ہو گئے۔ اسی لیے اسلامی قوانین نے ان مُضر اور نقصان دہ اُمور کو غلط قرار دے کر ان پر قدغن عائد کر دی۔ ان سب کو حرام کاروبار میں شمار کیا اور اُن سے حاصل ہونے والی آمدنی کو ناجائز قرار دیا۔

امام جعفر صادقؑ سے ایک سوال:

آئمہ اطہار علیہم السّلام نے اپنے پیروکاروں کو اس قسم کے اعمال سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک تو اُنہیں اس قسم کے خرافاتی اُمور سے قطعاً دُور رکھا اور دوسرے اُنہیں یہ بتا دیا کہ ایسی باتوں کو سچ سمجھنا اور ایسی باتیں کرنے والوں کی تصدیق کرنا غیر شرعی اور اسلامی احکام کے سراسر خلاف ہے۔ جیسا کہ ہیثم بن واقد کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی۔

"ان عندنا بالجزیرۃ رجلاربما اخبرمن یاتیہ یسئلہ عن الشی یسرق اوشبہ ذالك افنسئلہ؟ فقال: قال رسُول اللہ الی ساحر او کاھن او کذاب یصدقہ بما یقول فقد کفر بما انزل اللہ من کتاب۔"

"جزیرہ کے علاقہ میں ایک شخص ہمارے درمیان ہے کہ جب کسی کی چوری ہوتی ہے یا اس قسم کا کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو لوگ اُس کے پاس جا کر پُوچھتے ہیں اور وہ بتا دیتا ہے، آیا ہمیں بھی اجازت ہے کہ

ہم اس کے پاس جا کر اس قسم کے سوال کریں؟ تو امام نے فرمایا، رُسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے جو شخص غیب کو معلوم کرنے کے لیے کسی ساحر یا کاہن یا جھوٹے شخص کے پاس جائے اور اس کی باتوں کو سمجھے تو وہ ان سب کا کفر کرے گا جو خدا نے آسمانی کتابوں میں نازل کیا ہے۔'' [1]

غیب گو کی تصدیق قرآن کی تکذیب ہے:

حضرت علی علیہ السلام نے خوارج سے جنگ کرنے کے لیے لشکر کو تیار کیا جب آپ چلنے کے لیے آمادہ ہوئے تو ایک شخص نے آ کر عرض کیا: اگر آپ اس وقت محاذ جنگ پر جائیں گے تو مجھے خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوں اور شکست کھا کر واپس آ جائیں اور میں نے یہ سب کچھ نجومی حساب اور ستاروں کی چال سے معلوم کیا ہے'' تو امام نے فرمایا:

"اتزعم انك تهدى الى الساعة التى من سار فيها صرف عنه السوء و تخوف من الساعة التّى سارفيها حاق به الضر؟فمن صدقك بهذا فقد كذب القرآن واستغنى عن الاستعانة بالله فى نيل المجوب ورفع المكروه وتبتغى فى قواك للعامل بامرك ان يوليك الحمد وون دبه لانك بزعمك انت هديته الى الساعة التى نال فيها النفع وامن الضر۔"

''تو یہ گمان کرتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو ایسی گھڑی کی رہنمائی کر رہا ہے کہ جو اس وقت ڈرا رہا ہے کہ جو اس وقت سفر کرے گا نقصان اُٹھائے گا، جو شخص تیری ان باتوں کی تصدیق کرے گا وہ قرآن کی تکذیب کرے گا اور اپنی حسبِ منشا چیز کے حصول اور ناپسندیدہ چیز سے بچنے کے لیے خدا کی مدد اور نصرت طلبی سے بے نیاز ہوگا۔ تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنی باتوں پر عمل کرنے والے سے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری حمد و ستائش کرے نہ کہ اپنے خدا کی کیونکہ تمہارے گمان کے مطابق تم ہی نے اسے ایسے وقت کی نشاندہی کی ہے جس میں اُسے فائدہ ہوا ہے اور نقصان سے بچ گیا ہے۔'' [2]

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۵۰۰ (مادہ کہن)

[2] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۷۹

غیب بتانے کے لیے علم نجوم کی حیثیت:

پھر امام علیہ السلام نے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

"ایھا الناس ایاکم والنجوم، الایھتدی به فی بر اوبحر فانھا تدعوا الی الکھانة والمنجم کالکاھن، والکاھن کالساحر، والساحر کالکافر ولکافر فی النار سیروا علی اسمھ الله۔"

''یعنی اے لوگو! ستارہ شناسی کو صرف صحرائی اور دریائی راستوں کی تلاش کے لیے حاصل کرو۔ اور اس بات سے پرہیز کرو کہ اسے غیب بتانے اور فتح اور شکست کی راہوں میں استعمال کرو، کیونکہ اس طرح تم کہانت تک جا پہنچو گے اور جس منجم کا کام غیب بتانا ہو وہ کاہن کی مانند ہے، اور کاہن ساحر کی مانند ہے، اور ساحر کافر کی مانند ہے، اور کافر جہنمی ہے۔ پھر آپ نے لشکر والوں کی طرف منہ کر کے فرمایا: اللہ کا نام لے کر چل پڑو! یعنی اس شخص کی غیب گوئی کی اعتنا نہ کرو جس میں بدبینی پائی جاتی ہے۔''[1]

فریب کار اور لوگوں کو دھوکہ دہی:

خلاصہ کلام اس دُنیا کا غیب اور کائنات کے دوسرے جہانوں کا غیب صرف اور صرف ذات خدا سے مخصوص ہے۔ اور یہ جو بعض اوقات بعض معاملات میں انبیاءِ کرام یا ائمہ اطہار علیہم السلام نے بیداری کی حالت میں غیب کی باتیں کہی ہیں تو وہ بھی باری تعالیٰ کے حکم اور اس کی اجازت سے کہی ہیں۔ یعنی خداوند عالم کچھ مقامات اور مواقع پر اپنے شائستہ اور لائق بندوں کو ناشناختہ حقائق کا الہام کرتا ہے اور نسبۃً غیب سے مطلع کرتا ہے، اور کبھی کبھی خدا کا الہام عالمِ خواب میں سچے خوابوں کے ذریعے ہوتا ہے اور اسی الہام کی وجہ سے غیب کے پردے ہٹا دے جاتے ہیں اور خواب دیکھنے والے پر مخفی حقائق آشکار ہو جاتے ہیں۔

لیکن عوام کو دھوکہ دینے کے لیے جھوٹے اور فریبی لوگوں نے کہانت، سحر وجادو، نجوم وغیرہ کے جو ذرائع اپنائے ہوئے ہیں اُن سے نہ صرف غیب کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، بلکہ گمراہی اور فساد کا موجب بھی بنتے ہیں اور اسلام نے ان سب کو ممنوع قرار دیا ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ خُطبہ ۷۹

مرنے کے بعد کی ناشناختہ کائنات کے غیب کا علم بھی اس دُنیا کے غیب کی مانند خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور خداوند عالم ہی نے وحی کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو برزخ کی کیفیت اور وہاں پر مومنین اور کفار کی ارواح کی کیفیت سے آگاہ فرمایا ہے، اور خداوندِ عالم ہی نے قرآن مجید میں بہت سی آیات کے ضمن میں کائنات کے خاتمے، مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے، میدانِ محشر میں لوگوں کے اکٹھا ہونے، حساب وکتاب، شفاعت کرنے والوں کی شفاعت اور اہلِ رحمت اور اہلِ عذاب کے انجام کے بارے میں خبر دی ہے۔ اور آئمہ اسلام علیہم السلام نے خدائی الہام کے ذریعہ بہت سی روایات میں عالمِ آخرت کے حقائق کو مزید تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

موت اور عالمِ برزخ کے مشاہدات:

نسبتۂ غیب کی اقسام میں سے ایک قسم جو مرنے کے بعد تمام لوگوں کے لیے آشکار ہو جائے گی وہ ہے عالم برزخ اور ان لوگوں کی ارواح کا مشاہدہ جو اس دُنیا سے جا چکے ہیں، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مرنے سے پہلے بھی کوئی شخص بیداری کی حالت میں یا عالمِ خواب میں مُردہ لوگوں کی رُوحوں سے رابطہ پیدا کر کے ان کی کیفیت اور حالات سے آگاہ ہو سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب اثبات میں ہے، البتہ مطلب کی وضاحت کے لیے قدرے تفصیل کی ضرورت ہے۔

حضرت علیؑ وادی السلام میں: مُردوں سے باتیں:

دینی نقطۂ نظر سے ان لوگوں کی رُوحوں سے رابطہ پیدا کرنا جو اس دُنیا سے جا چکے ہیں صرف محال ہی نہیں بلکہ اسلامی کتابوں میں ان کا واقع ہونا بھی تاریخی طور پر ثابت ہے اور بعض روایات کے مطابق بسا اوقات بعض آئمہ اطہار علیہم السلام نے بیداری کی حالت میں بھی مردوں کی ارواح سے رابطہ پیدا کیا ہے اور ان سے باتیں بھی کی ہیں، بلکہ بعض اوقات غیر معصوم لوگوں نے بھی مردوں کی ارواح سے بیداری کی حالت میں باتیں کی ہیں۔ یہاں پر ثبوت کے طور پر دو واقعات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے ایک صحابی جناب حبہ عرنی کہتے ہیں۔

"خرجت مع امیر المومنین علیه السلام الی الظهر، فوقف بوادی السلام کانه مخاطب لاقوام فقمت بقیامه حتیٰ اعییت ثم جلست حتی مللت ثم قمت حتی نالنی مثل ما نالنی اولا ثم جلت حتّی مللت ثم قمت وجمعت ردائی فقلت یاامیر المومنین انی قد اشفقت علیك من طول القیام فراحة ساعة ثم طرحت الرواء لیجلس علیه فقال لی یاحبة ان

هوالا محادثة مومن اوموانسة. قال قلت یاامیر المومنین وانهم لكذالك قال نعم ولو كشف لك لرايتهُم حلقا حلقا محتبين يتحادثون فقلت اجسام ام ارواح فقال ارواح وما مومن يموت فی بقعة من بقاع الارض الاقيل لروحه الحقی بوادی السلام وانها لبقعة من جنة عدن"

''میں امام علیہ السلام کی معیت میں کوفہ سے باہر گیا، حضرت نے وادی السلام کے قبرستان میں توقف فرمایا، ایسے کھڑے ہوئے جیسے کسی کے ساتھ باتیں کرنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ میں بھی حضرت کے ساتھ کھڑا ہوگیا اور اس قدر کھڑا رہا کہ تھک کر بیٹھ گیا، کافی دیر بیٹھا رہا حتیٰ کہ بیٹھ بیٹھ کر بھی تھک گیا، پھر کھڑا ہوگیا، اور اس قدر کھڑا رہا کہ مثل سابق تھک کر بیٹھ گیا۔ پھر کافی دیر کے بعد دوبارہ کھڑا ہوگیا اور اپنی دوش سے عبا اٹھائی اور آقا کی خدمت میں گذارش کی کہ میں آپ کے اس حد تک کھڑا ہونے سے خائف ہوں کچھ دیر آرام فرمایئے۔ میں نے اپنی عبا زمین پر بچھادی اور امام اس پر تشریف فرما ہوئے پھر فرمایا، اے حبہ! میرا یہ کھڑا ہونا مومن کے ساتھ گفتگو اور انس محبت کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے عرض کیا جناب! کیا ان کا بھی آپس میں انس ومحبت ہے اور وہ آپس میں بھی باتیں کرتے ہیں؟ امام نے فرمایا یقیناً، اگر پردے ہٹادیے جائیں تو تم دیکھو کہ وہ ٹولے ٹولے ہوکر ایک دوسرے کے گرد جمع ہیں اور ایک دوسرے سے باتیں کررہے ہیں میں نے پوچھا حضور! کیا یہ لوگ جسم ہیں یا رُوح؟ تو آپ نے فرمایا یہ رُوح ہیں۔

پھر آپؑ نے ارشاد فرمایا روئے زمین کے کسی بھی حصّے پر کوئی مومن ایسا نہیں ہے جو مر جائے مگر یہ کہ اس کی روح کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ وادی السلام میں چلی جائے اور دوسری ارواح کے ساتھ جاملے، کیونکہ یہ وادی بہشت بریں کے ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا ہے۔[1]

سلمان سے پیغمبر کا فرمان:

حضرت سلیمان فارسیؓ امیرالمومنین علیہ السلام کی طرف سے مدائن کے گورنر تھے۔ اصبغ بن نباتہ کہتے ہیں کہ میں بھی مدائن میں تھا۔ اور اکثر سلمان فارسیؓ کی مُلاقات کو جایا کرتا تھا ایک دن جب میں اُن کے پاس گیا تو دیکھا کہ وہ بیمار ہیں اور یہ وہی بیماری تھی جس میں اُنہوں نے وفات فرمائی۔ لگاتار اُن کی عیادت میں مصروف رہتا تھا اور حالات دریافت کرتا تھا، رفتہ رفتہ مرض بڑھتا گیا اور موت کا یقین ہوگیا:

---

[1] کافی جلد ۳ ص ۲۴۳

"فالتفت الی وقال لی یااصبغ عھدی نبی رسُول اللہ یقول یاسلمان سیکلمك میت اذاونت وفاتك وقد اشتھیت ان ادری وفاتی وانت ام لا؟"

ایک دن مجھ سے کہا اے اصبغ رُسولؐ خدا نے مجھ سے عہد فرمایا تھا کہ جب تمہاری موت نزدیک ہوجائے گی تو تمہارے ساتھ مُردے باتیں کریں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ جانوں آیا میری موت نزدیک آچکی ہے یا نہ؟

سلمانؓ قبرستان میں:

اصبغ نے کہا آپ کا جُوحکم ہوفرمایئے! میں ضرورانجام دوں گا! اُنہوں نے فرمایا آپ ابھی چلے جایئے اور میرے لیے ایک تابوت تیار کرلایئے، جو چادر مردوں کے لیے تابوت میں بچھائی جاتی ہے میرے لیے بھی وہ بچھالایئے۔ اپنے ساتھ چار افراد بھی لیتے آیئے جو میرا تابوت اٹھا کر قبرستان چلے چلین۔ اصبغ نے تعمیل امر کی فوراً اٹھے اور سلمان کی فرمائش پر عملدرآمد کیا اور اُن کا تابوت قبرستان میں لے گئے۔ تابوت کو زمین پر رکھا گیا، سلمانؓ نے کہا مجھے قبلہ رو کردیجیے ایسا ہی کیا گیا تو اُنہوں نے بلند آواز سے کہا:

"السلام علیکم یااھل عرصة البلأ، السلام علیکم یامجتبین عن الدنیا۔"

''تم پر سلام ہو اے آزمائش کی وادی میں رہنے والو! تم پر سلام ہو اے دُنیا سے چھپے ہوئے لوگو''

لیکن اُنہوں نے کوئی جواب نہ سُنا، پھر انہیں سلام کیا اور کہا: ''تمہیں خداوند بزرگ اور رُسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی نے مجھ سے فرمایا تھا جب تمہاری موت نزدیک ہوگی تو تمہارے ساتھ مُردے باتیں کریں گے۔'' اب میں یہ بات جاننا چاہتا ہوں کہ آیا میری موت نزدیک ہے یا نہیں؟

سلمان سے مُردہ کی باتیں:

ایک مُردے کی رُوح نے سلمانؓ کو جواب دیا، پہلے تو سلام کا جواب دیا پھر کہا ''ہم آپ کی باتیں سُن رہے ہیں، جو پُوچھنا چاہتے ہیں پُوچھ لیں۔'' سلمان نے کہا ''آیا آپ اہل بہشت سے ہیں یا اہل جہنم سے؟'' اُس نے کہا ''ایسے لوگوں سے ہوں جنہیں خدا نے اپنی عفو اور رحمت میں شامل فرمایا ہے اور بہشتی ہوں۔''

آخری لمحات میں سلمان کی دُعا:

سلمان نے اس سے اس کے مرنے کی کیفیت اور مرنے کے بعد کے حالات تفصیل سے دریافت کیے اور ہر ایک سوال کا جواب سُنا، جب باتیں کر چکے تو کہا کہ مجھے تابوت سے باہر نکالا جائے۔ چنانچہ باہر نکال کر زمین پر بٹھایا گیا، اور وہ خدا کی ذات کی طرف متوجہ ہوکر کہنے لگے:

"یامن بیدہ ملکوت کل شیء والیہ ترجعون وھو یجیر ولا یجار علیہ، بك آمنت ولنبیك اتبعت وبکتابك صدقت وقد اتانی ماوعدتنی یامن لا یخلف المیعاد، اقبضنی الی رحمتك وانزلنی وار کرامتك۔"

'اے وہ ذات جس کے قبضہ قدرت میں ہر چیز کے خزانے ہیں، اور اسی کی طرف ہر ایک کی بر گشت، اور وہ ذات ہی لوگوں کو بلاؤں اور عذاب سے محفوظ رکھتی ہے اور کسی شخص میں اس کے عذاب کو ٹالنے کی طاقت نہیں۔ میں تجھ پر ایمان لا یا ہوں، تیرے پیغمبرؐ کی اطاعت کی ہے اور تیری مقدس کتاب کی تصدیق بھی کی ہے۔ جو تُو نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا اب اس کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اے وہ ذات جو ہرگز وعدہ خلافی نہیں کرتی، میری رُوح کو قبض فرما کر اپنی رحمت سے ملحق کر دے اور اپنے فضل و کرم کے گھر میں لے جا۔ یہ کہا، شہادتیں زبان پر جاری کیے اور جان، جانِ آفرین کے سُپرد کر دی۔'' [1]

ان مذکورہ دو واقعات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دینی لحاظ سے بیداری کی حالت میں مُردوں کی رُوحوں کے ساتھ رابطہ پیدا کرنا ممکن اور واقع ہونے والی بات ہے۔ لیکن اس کا یہ معنی نہیں کہ ہر شخص جس رُوح سے جس وقت چاہے رابطہ پیدا کر کے اس سے سوال و جواب شروع کر دے۔

رُوحوں کو بُلانے کی وبا:

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے "رُوحوں کے بلانے" کا مسئلہ ایک وبا کی شکل اختیار کر گیا تھا اس کی ابتداء تو مغربی مُلکوں میں ہوئی، لیکن آہستہ آہستہ مشرقی ممالک تک بھی اس کے اثرات پہنچ گئے۔ اس بارے میں کئی کتابیں لکھی گئیں اور اخبارات و رسائل میں کئی مقالے تحریر کیے گئے۔ بہت سے لوگ رمالوں اور فال گروں کی طرح، رُوحوں کے بُلانے کا دعویٰ

---

[1] بحار الانوار جلد ۶ ص ۲۶۷

کرنے لگے۔ تہران اور دوسرے شہروں میں رُوحوں کے بُلانے کے باقاعدہ اجلاس منعقد ہونے لگے۔ ان جلسوں کی نوعیت کچھ اس طرح کی ہوتی تھی کہ ایک شخص جو رابط کہلاتا تھا ایک گھومنے والی میز درمیان میں رکھ دیتا تھا اور کچھ بے سمجھ لوگوں کو اس کے گرد بٹھا دیتا تھا، وہ اپنا ہاتھ بھی میز پر رکھ دیتا تھا اور دوسروں کو بھی میز پر ہاتھ رکھنے کو کہتا تھا۔ میز کی ہلکی سی حرکت کو جو اس کے اپنے ہاتھ کو نا معلوم حرکت سے پیدا ہوتی تھیں رُوح کے پہنچ جانے کی علامت بتا تا تھا۔ اس وقت وہ حاضرین سے کہتا تھا کہ سوال کریں، وہ اپنے سوالات لکھ کر اس کو دے دیتے تھے اور وہ حاضرین کے ہر سوال کا جواب رُوح کی طرف سے پانچ یا چھ سکینڈ میں دے دیتا تھا۔

ارواح سے رابطہ قائم کرنے والی انجمنیں:

میری زبردست خواہش تھی کہ ایک مرتبہ ہی کیوں نہ سہی، ایسے اجلاس میں ضرور شرکت کروں اور نزدیک سے اُسے دیکھوں، خوش قسمتی سے یہ مسئلہ بھی طبعی طور پر حل ہوگیا۔ وہ اس طرح کہ ایک دن کچھ لوگ میرے مکان پر آئے اور ایک ڈاکٹر کی مجلس فاتحہ پڑھنے کی دعوت دی، اُنہوں نے ڈاکٹر صاحب مرحُوم کے حالات زندگی اور تعلیمی کوائف بتانے کے دوران بتایا وہ انجمن ماہرین نفسیات کے چیئرمین بھی تھے اور ہم اسی انجمن کے ارکان ہیں۔ میں نے پُوچھا کہ اس انجمن کا کیا پروگرام ہوتا ہے؟ اُنہوں نے کہا اس انجمن کا کام ارواح کے ساتھ رابطہ کرنا ہوتا ہے۔ میں نے اُن کی دعوت قبول کرلی اور وعدہ کیا کہ مجلس میں تقریر کے لیے ضرور حاضر ہوں گا۔

وہی دن آ گیا اور میں مقررہ وقت پر مسجد پہنچ گیا۔ مجلس میں حاضرین کی کافی تعداد تھی، میں نے اپنی تقریر شروع کی اور ماہرین نفسیات کی انجمن کی مناسبت سے روح کے موضوع پر تقریر کی۔ جب مجلس ختم ہوئی اور میں منبر سے نیچے آ گیا تو کچھ لوگ میرے گرد جمع ہو کر کہنے لگے آپ تو ایک بہترین رابطہ (میڈیم) ہیں اور ارواح اور لوگوں کے درمیان بہترین واسطہ بن سکتے ہیں کہ لوگوں کے سوالات ارواح تک اور رُوحوں کے جوابات لوگوں تک پہنچائیں۔

مَیں اپنے آپ کو اچھی طرح جانتا تھا اور مجھے معلوم تک کہ یہ کام مجھ سے نہیں ہوسکتا، لیکن چونکہ انجمن کے ارکان نے میری تقریر کو بے حد پسند کیا تھا اور اس پر متعجب تھے، لہٰذا میں نے سمجھ لیا کہ انجمن میں کوئی قابل قدر کام انجام نہیں پاتا، البتہ میں نے اس بارے میں کوئی بات نہ کی اور صرف یہی کہا کہ آیا ممکن ہے میں بھی رُوحوں کے بلانے کے پروگرام میں شرکت کروں؟ اُنہوں نے نہایت ہی خوشی کے ساتھ مثبت جواب دیا۔ بلکہ ان میں سے ایک صاحب نے فوراً انجمن کا پتہ، اجلاس کے منعقد ہونے کی تاریخ اور وقت بھی لکھ کر میرے حوالے کردیا۔

رُوحوں کے بلانے کا کمرہ:

وہ دن آ پہنچا اور میں بھی وقت مقررہ سے کچھ منٹ پہلے انجمن میں پہنچ گیا۔اس وقت تک انجمن کا کوئی رُکن نہیں پہنچا تھا۔تھوڑی دیر بعد سب آہستہ آہستہ آنا شروع ہو گئے۔ پہلے تو حاضرین کی چائے سے خاطر تواضع کی گئی۔ پھر اُنہیں رُوحوں کے بُلانے کے کمرے میں لے جایا گیا۔اس ہال کی کیفیت کچھ اس طرح تھی۔ درمیان میں گھومنے والی چھوٹی میز کے بجائے ٹھہری ہوئی بڑی میز تھی۔ میز کی لمبائی تقریباً پانچ میٹر اور چوڑائی ایک میٹر اور بیس سینٹی میٹر اس کے اُوپر نیلے رنگ کا خُوبصورت کپڑا ڈالا گیا تھا۔ میز کے اطراف میں بڑے سلیقے کے ساتھ کُرسیاں سجائی گئی تھیں اور ہر کُرسی کے سامنے میز پر کچھ کاغذ اور پنسل رکھ دی گئی تھی۔

آنے والے کُرسیوں پر بیٹھتے گئے رابطہ (میڈیم) کی عمر کوئی ۳۵ برس ہوگی۔ انجمن کا کام شروع ہو گیا۔ حاضرین میں سے ایک نے کاغذ پر لکھا کہ ڈاکٹر کی رُوح کو بُلائیں اور اس کی کیفیت کے بارے میں سوال کریں اور وہ بھی پُوچھیں کہ اُن کی مجلس فاتحہ خوانی کیسی رہی سوال کو بلند آواز سے پڑھا گیا جسے ہر ایک نے سُنا۔ میڈیم نے تھوڑی دیر اپنی آنکھیں بند کیں۔ سر کو تھوڑا سا نیچے جھُکایا، جیسے کوئی شخص گہری سوچ میں چلا جاتا ہے۔ پھر اُس نے کاغذ کا ٹکڑا اُٹھایا اور اس پر لکھ کر بلند آواز سے کہا: ڈاکٹر صاحب حاضر ہیں اور کہہ رہے ہیں اس جگہ میری حالت بہت اچھی ہے، بہت خوش وخرم ہوں، مجلس فاتحہ خوانی بہت اچھی رہی اور اپنے دوستوں کا شُکریہ ادا کرتا ہوں۔

سعدی کی رُوح حاضر ہے:

اسی دوران انجمن کے ایک رُکن میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کافی عرصہ ہوا ہم نے سعدی کی رُوح سے رابطہ برقرار کیا تھا میڈیم سے کہنے لگے کہ ''سعدی کی رُوح کو بلایئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میڈیم نے کہا کہ سعدی کی رُوح حاضر ہے۔ سوالات کا آغاز ہوا۔ ہر شخص نے باری باری سوالات لکھ کر میڈیم کے حوالے کیے۔ اُس نے ہر ایک کے سوالوں کے جواب سعدی کی طرف سے لکھ کر سُنائے، لیکن میری نزدیک نہ تو کسی سوال کی کوئی اہمیت تھی اور نہ ہی کسی جواب کی اور نہ ہی رُوح کے ساتھ رابطہ پر کوئی گواہ بن سکتا تھا۔ اس کے بعد حاضرین میں سے ایک شخص نے مجھ سے پُوچھا آیا آپ مطمئن ہیں؟ میں نے کہا نہ، یہ صُورت حال میرے لیے قانع نہیں ہے۔ اُنہوں نے پُوچھا آپ کیونکر مطمئن ہوں گے؟ میں نے کہا ''میں خود سعدی سے کچھ سوال کروں گا۔'' اُنہوں نے یہ بات مان لی۔

سعدی کی رُوح اور عربی شعر:

میرا پہلا سوال یہ تھا کہ: سعدی سے کہیے کہ ''عرفاء اور صوفیا کے کئی فرقے ہیں۔ بعض فرقے آپ کو بھی ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ تو کیا دینی نقطہ سے تصوّف حق ہے یا باطل؟ اگر حق ہے تو ان میں سے کون سا فرقہ حق کے زیادہ نزدیک ہے؟'' سوال پڑھا گیا، میڈیم نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد لکھا، سعدی کہتے ہیں: اصل مقصد تو خدا تک پہنچنا ہے، جس در سے پہنچو وہی حق ہے۔'' البتہ واضح ہے کہ یہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا، بلکہ جان چھڑانے والی بات تھی، لیکن پھر بھی میں نے کچھ نہ کہا۔

میرا دوسرا سوال یہ تھا کہ ''سعدی سے کہے کہ آپ فارسی کے علاوہ عربی میں بھی بہترین شعر کہتے تھے۔ جناب ڈاکٹر صاحب کی وفات کے سلسلہ میں سعدی سے درخواست کیجیے کہ ایک عربی رباعی کہیں جو مندرجہ ذیل مطالب پر مشتمل ہو، ڈاکٹر صاحب وفات پا گئے، مسجد میں مجلس فاتحہ خوانی منعقد کی گئی فلسفی نے منبر پر تقریر کی اور مجلس بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوئی۔'' میں نے سوچا پہلے تو یہ رابط صاحب عربی جانتے ہی نہیں، دوسرے اگر تھوڑی بہت جانتے بھی ہوں تو قطعاً بعید ہے کہ عربی میں کوئی شعر کہیں اور وہ بھی اس قدر جلدی اگر اس سوال کا اچھا جواب ملا تو پھر اجلاس نہایت ہی توجہ کے لائق ہوگا۔

سعدی کی رُوح روٹھ گئی:

رابطہ نے کچھ دیر سوچا پھر پنسل اٹھا کر کاغذ پر ایک جملہ لکھا جو رباعی نہیں تھا۔ یہ جُملہ دراصل یہ تھا کہ ''سعدی کی روح رُوٹھ کر چلی گئی۔'' میں نے پوچھا روٹھنا کیسا؟ اس کی شان میں کسی قسم کی گستاخی تو نہیں ہوئی، سعدی نے تو رُسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں کیسی بہترین رباعی زبان میں کہی ہے۔

بلغ العلیٰ بکمالہٖ
کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ
صلوا علیہ وآلہٖ

اُنہوں نے اس بارے میں کیوں بے غوری کر دی؟ اگر ہماری اس نشست میں عربی کے دو شعر کہہ دیتے تو اس میں کیا حرج تھی۔ المختصر وہ اجلاس اس کیفیت کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچا۔

میں دینی نقطۂ نظر سے گذشتہ لوگوں کی رُوح کے ساتھ بیداری کی حالت میں رابطہ قائم کرنے کو ممکن اور ہونے والی

بات سمجھتا ہوں اور زبردست خواہش ہے کہ کوئی اسی صورتِ حال پیدا ہوجائے جس سے شیخ طوسی اور شیخ صدوق رضوان اللہ علیہما کی ارواح کے ساتھ رابطہ قائم کروں اور کچھ روایات قائم کروں اور کچھ روایات اور موضوعات ایسے ہیں جو اُنہوں نے اپنی کتابوں میں درج کیے ہیں اُن کے بارے میں پُوچھوں کہ اُنہوں نے کِس کتاب میں لکھا اور کس فصل میں تحریر کیا ہے؟ لیکن افسوس کہ اب تک مجھے ایسی کوئی توفیق حاصل نہ ہوسکی اور یہ کام میسر نہ ہوسکا۔

فال کے ذریعہ غیب کا علم حاصل ہونا:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے رُوح کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے مسئلہ کو اس قدر غیر اہم اور آسان بنا دیا ہے اور اس بات کے دعویدار ہیں کہ میز کے گھمانے سے مرنے کے بعد کے عالم سے رابطہ پیدا کر لیتے ہیں اور جس رُوح کو چاہیں بلا سکتے ہیں، اس کے ساتھ باتیں کر سکتے ہیں اور برزخ کے غیب سے آگاہ ہوسکتے ہیں بعینہ ان لوگوں کی مانند ہیں جو نخود اور قہوہ کے ذریعہ فال نکال کر اس عالم کے غیب سے واقف ہوجاتے ہیں۔ آنے والی کل کے بارے میں خبریں دیتے ہیں اور لوگوں کو اپنے پیش آمدہ انجام کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ نہ تو میز کو گھمانے سے عالم برزخ اور گذشتہ لوگوں کی رُوح سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ طالع بینی اور رتالی سے آئندہ کی تقدیر کا علم حاصل ہوسکتا ہے کہ اس کی رُو سے لوگوں کے انجام کی خبر دی جاسکے۔

سچے خواب:

مُردوں کی ارواح سے رابطہ قائم کرنے اور عالمِ برزخ کے غیب سے آگاہ ہونے کا ایک اور راستہ کہ جس کی عقل اور شریعت بھی تائید کرتے ہیں سچے خواب ہیں۔ جس طرح اس دُنیا کے کئی غیبی اُمور عالمِ خواب میں رویائے صادقہ کے ذریعہ مُردوں کی رُوح سے رابطہ قائم کر کے واضح اور آشکار ہوسکتے ہیں۔

مُردوں کی ارواح سے رابطہ پیدا کرنے کے بارے میں دو نُکتے قابلِ توجہ ہیں۔ پہلا یہ کہ اس قسم کے خواب بذاتِ خود رُوح کی بقا اور مرنے کے بعد کی زندگی پر ایک واضح دلیل ہیں، دوسرا یہ کہ بعض خواب سچ مچ برزخ کے غیب کی کلید ہیں اور بہت سی مخفی حقیقتوں کو آشکار کر دیتے ہیں۔ اور یہ دونوں نکات خدا پرست اور غیر مادی جہانوں پر عقیدہ رکھنے والے فلاسفہ کی منطق سے سازگار ہیں وگرنہ مادہ پرستوں اور ماوراء مادہ کے مُنکر افراد کے نظریہ کے مطابق ان کی نہ تو کوئی توجیہ کی جاسکتی ہے اور نہ ہی کوئی تاویل۔

مکتب مادی اور چار بُنیادی اُصول:

زیادہ واضح الفاظ میں، مادی مکتبِ فکر تخلیقی عالم کے بارے میں بنیادی اصولوں پر استوار ہے۔ اوّل یہ کہ تمام کائنات میں مادہ اور مادی طاقتوں کے علاوہ اور کچھ بھی موجود نہیں۔ دوم یہ کہ تمام کائنات سو فیصد مادی مخلوق ہے۔

سوم یہ کہ کائنات کی تخلیق مادہ کی حرکت اور اندھے اور بے شعور اتفاق کا نتیجہ ہے اور عالمِ مادہ کے پس پردہ کسی غیر مادی عالم اور حکیم کی قدرت موجود نہیں ہے جو کائنات کی خالق اور مدّبر ہے۔ چہارم اس کائنات کی ساری مخلوق کی مادی منطق کے ساتھ توجیہ اور تفسیر کی جاسکتی ہے۔

رویائے صادقہ یا سچے خواب کہ جن کا تعلق مُردوں کی ارواح سے ہو اور ان جانے اور مجہول قضیوں سے ہوتا ہے اور ساری کائنات میں اس کے ہزار ہا نمونے ملتے ہیں اور مادی مکتب کے پہلے اور چوتھے اُصول کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں ہیں اور مادہ پرست حضرات ان کی اپنے نظریہ کے مطابق توجیہہ بھی نہیں کر سکتے۔ یہاں پر ان سچے خوابوں میں سے ایک خواب کے ذریعے استشہاد کیا جاتا ہے جو رُوح کی بقا اور ان جانے غیب سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

سچے خواب:

چند سال پہلے کی بات ہے کہ ایران کے ایک شہر میں ایک شریف اور ایماندار آدمی رہتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا بھی اپنے والد محترم کی طرح متقی اور پرہیز گار انسان تھا۔ مالی لحاظ سے دونوں باپ بیٹا کمزور تھے اور دونوں ایک متوسط گھرانے میں رہ رہے تھے۔ اپنے احترام کو مدّنظر رکھتے ہوئے لوگوں سے اپنی ضروریات کو چھپانے کے لیے کفایت شعاری سے کام لیتے تھے۔ ان کی کفایت شعاری کا ایک نمونہ یہ بھی تھا کہ شہر کی واٹر سپلائی سکیم سے صرف پینے اور کھانے پکانے کے لیے پانی کا استعمال کرتے تھے۔ کپڑے دھونے، حوض بھرنے اور گھر میں موجود درختوں کو پانی دینے کے لیے زیر زمین پانی یا کنوئیں کے پانی سے استفادہ کیا کرتے تھے۔

اسی کنوئیں پر ایک چھوٹا سا کمرہ بنایا ہوا تھا تا کہ ایک تو کنوئیں کا پانی دھول مٹی اور گرد و غبار سے محفوظ رہے اور دوسرے کنوئیں سے پانی لینے والوں کو سردی، گرمی، برف اور باران سے بچائے رکھے۔ دونوں باپ بیٹا، کنوئیں سے پانی نکالنے کے لیے مزدور نہیں لاتے تھے۔ بلکہ خود باری باری اس کام کو انجام دیا کرتے تھے۔

باپ بیٹے کی گفتگو:

ایک دن باپ بیٹے نے آپس میں گفتگو کی کہ کنوئیں پر چھت کی لپائی کمزور ہو چکی ہے۔ اور ممکن ہے کہ کسی بھی وقت

چھت کنوئیں میں جا پڑے یا پھر پانی لینے والوں میں سے کسی کے سر پر آ پڑے لہٰذا اس کی دوبار لپائی کرنی چاہیے۔ چونکہ مالی حالت اُنہیں راج مزدور لانے کی اجازت نہیں دیتی تھی لہٰذا آپس میں یہی طے کیا کہ چھُٹی کے کسی دن مل کر پُرانی لپائی کو چھت سے ہٹا کر نئی لپائی کریں۔

انگوٹھی جو گم ہوگئی:

موعود دن پہنچ گیا، کنوئیں کو تختوں اور پھٹوں وغیرہ سے بند کیا، لپائی کو چھت سے اکھیڑا اور مٹی کو صحن میں اکٹھا کیا اور وہیں پر اسے گِل گارا بنایا۔ باپ نے راج کا اور بیٹے نے مزدور کا کام سنبھالا، بیٹا گارا دیتا جاتا تھا اور باپ لپائی کرتا جاتا تھا اور لپائی کا کام ختم ہوگیا۔ دن کے آخر وقت میں باپ کو پتہ چلا کہ اس کی انگوٹھی ہاتھ میں نہیں ہے۔ اُس نے خیال کیا کہ شاید ہاتھ دھوتے وقت حوض کے پاس اُتار کر رکھ دی ہے۔ وہاں اچھی طرح تلاش کرنے سے مایوس ہوگیا۔ ایک عرصے تک گھر والوں کے ساتھ انگوٹھی گم ہوجانے کا افسوس کے ساتھ تذکرہ کرتا رہا۔ چھت کی تعمیر اور انگوٹھی کو گم ہوئے ایک عرصہ ہوگیا۔ آخرکار وہ بھی دل کا دورہ پڑنے سے فوت ہوگیا۔

نامعلوم چیز جو مرنے کے بعد معلوم ہوئی:

اس کے ایماندار بیٹے کا کہنا ہے کہ میرے باپ کو فوت ہوئے ایک عرصہ گزر گیا کہ ایک رات میں نے اُسے خواب میں دیکھا کہ مجھے معلوم تھا کہ وہ فوت ہوگیا ہے۔ میرے پاس آ کر علیک سلیک کے بعد کہنے لگا: بیٹا! میں نے فلاں شخص کے پانچ سو تومان (روپے) قرض دینے ہیں تم مجھے اس مصیبت سے چھٹکارا دلاؤ۔

بیٹا نیند سے بیدار ہوا اور خواب کی کچھ پرواہ نہ کی اور قرض کی ادائیگی کے بارے میں بھی کوئی اقدام نہ کیا۔ تھوڑی مدت کے بعد اُس نے پھر باپ کو خواب میں دیکھا، اور پہلے کی طرح اُسے پھر قرض کی ادائیگی کی تاکید کی اور اب تک اُسے ادا نہ کرنے کی شکایت کی بیٹا عالمِ خواب میں بھی جانتا تھا کہ اس کا باپ فوت ہوچکا ہے اُس نے باپ نے کہا تمہیں معلوم ہے کہ چند سال قبل ہم نے کنوئیں پر موجود کمرے کی چھت کی لپائی کی تھی اور اسی دوران میری انگوٹھی گم ہوگئی تھی اور ہم نے اُسے جس قدر تلاش کیا، لیکن کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی! بیٹے نے کہا بالکل صحیح ہے! باپ نے کہا بہت سے مسائل ایسے ہوتے ہیں جو انسان کی زندگی میں تو معلوم اور ان جانے ہوتے ہیں۔ لیکن مرنے کے بعد ان پر واضح اور عیاں ہوجاتے ہیں۔ مجھے بھی مرنے کے بعد ہی معلوم ہوا کہ میری انگوٹھی چھت کی لپائی کے دوران گارے میں چھت پر رہ گئی ہے۔ کیونکہ جب ہم چھت پر لپائی کر رہے تھے اور گرمالہ میرے بائیں ہاتھ میں تھا اور گارا دائیں ہاتھ سے اُٹھا کر چھت پر ڈال رہا تھا ایک مرتبہ تم نے مجھے

گارا دیا اور میں نے اُسے دائیں ہاتھ میں لیا اور بائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے گرمالے سے دائیں ہاتھ کا گارا جُدا کررہا تھا تو گرمالے کے کنارے کے ساتھ انگوٹھی بھی گارے کے ساتھ لپائی میں آ گئی اور مجھے پتہ نہ چل سکا اگر تمہیں اطمینان کرنا ہے کہ میں ہی تمہارے ساتھ باتیں کررہوں فوراً جاؤ اور چھت سے اس مٹی کو ہٹاؤ اور واس کو پھر سے گارا بناؤ تمہیں انگوٹھی مل جائے گی۔

قرض خواہ اور قرضے کی تعیین:

بیٹے نے یہ خواب کسی کو بتائے بغیر صبح صبح سے سب سے پہلے یہی کام کیا اور انگوٹھی کو پالیا۔قرض کی جو رقم والد نے کہی تھی اسے جمع کیا اور قرض خواہ کے پاس چلا گیا۔ بیٹا کہتا ہے کہ میں نے سلام اور حال احوال دریافت کرنے کے بعد اُس سے پُوچھا، آیا آپ نے میرے مرحُوم والد سے کوئی رقم لینی تھی؟ دکاندار نے پُوچھا میرے والد نے آپ سے کیونکر قرض لیا تھا؟ اُس نے کہا ایک دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ آپ کے والد آئے اور مجھ سے مبلغ پانچ سو تومان قرض مانگا۔ میں نے اُنہیں مذکورہ رقم تو دے دی، لیکن نہ تو اس کا پرونوٹ لکھایا اور نہ ہی کسی قسم کی رسید لی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ دل کا دورہ پڑنے سے فوت ہوگئے۔ میں نے کہا تو آپ نے رقم کی وصولی کے لیے میری طرف رجوع کیوں نہ کیا؟ اُس نے کہا ''میرے پاس کوئی ثبوت تو نہیں تھا، لہٰذا مناسب نہ سمجھا کہ آپ سے وہ رقم مانگوں، کیونکہ ممکن تھا آپ میری بات نہ مانتے۔ چنانچہ متوفی کے بیٹے نے اُسے مبلغ پانچ سو روپے بھی دیے اور تمام واقعہ بھی بیان کیا۔

مادی منطق کی نارسائی:

ایسے خوابوں کو نہ تو مادیوں کے نکتہ نظر کے مطابق اور نہ ہی فرائڈ کی سیکالوجی کے تحت توجیہ وتفسیر کی جاسکتی ہے، کیونکہ نہ تو باپ کو معلوم تھا کہ انگوٹھی گارے میں رہ گئی تھی اور نہ ہی بیٹے کو اس بات کا علم تھا، اسی طرح بیٹے کو اپنے باپ کے قرضے کی ذرہ بھر اطلاع نہیں تھی اور نہ ہی وہ اپنے باپ کے قرض خواہ کو پہچانتا تھا۔ یہ خواب اور اس قسم کے دوسرے خوابوں کی تفسیر اور توجیہ صرف اور صرف حیات بعد الموت اور مُردوں کی رُوحوں کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کی بنیاد پر کی جاسکتی ہے۔ لیکن فرائڈ اور دوسرے مادہ پرست فلسفی اس قسم کے خوابوں کے بارے میں لب کشائی نہیں کرتے جن کی دُنیا بھر میں لاکھوں مثالیں ملتی ہیں اور ماوراء مادہ کی کائنات کا اثبات کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مادہ پرست اپنی مادیت میں بڑے متعصب ہیں اور اپنی مادی روش کو ترک نہیں کرنا چاہتے۔

عالمِ خواب میں مُردوں کی ارواح سے رابطہ:

اس خواب میں متوفی کی رُوح کے زندہ انسان کی رُوح سے رابطہ پیدا کیا ہے۔ اور چند غیبی حقائق کو من وعن اور بغیر

کسی قسم کی تبدیلی کے اُسے بیان کردیا۔لیکن بعض مواقع پر متوفی کی رُوح زندہ انسان کی رُوح سے خواب میں رابطہ پیدا کرتی ہے۔البتہ اپنی شکل وصُورت میں نہیں بلکہ سیمپل اور علامت کی صُورت میں اور وہ غیبی خبر جو خواب کا مقصود ہوتا ہے۔ باخبر تعبیر بیان کرنے والے کی تعبیر وتفسیر کے ذریعہ واضح ہوتی ہے۔جیسا کہ موسیٰ عطار کی ایک روایت میں ہے۔

ایک خواب جس کی امام نے تعبیر فرمائی:

"جاء موسیٰ العطار الی ابی عبداللہ علیه السلام فقال له یابن رُسول اللہ رأیت رئویاهالتنی رائیت صهر الی میتاوقد عانقنی وقد خفت ان یکون الاجل قد اقترب فقال یا موسیٰ توقع الموت صبا حاً فانه ملاقینا ومعانقة الاموات لاحیاء لاعمارهم، فما کان اسم صهرل؟ قال حسین فقال: اما ان رؤیاك تدل علی بقائك وزیارتك اباعبداللہ علیه السلام۔"

''موسیٰ عطار حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کرنے لگے۔میں نے خواب دیکھا ہے جس سے مجھے سخت پریشانی لاحق ہوئی ہے، میرا ایک داماد فوت ہوچُکا ہے میں نے اُسے خواب دیکھا ہے کہ اُس نے مجھ سے معانقہ کیا ہے (اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈالی ہیں) مجھے خطرہ ہے کہ میری موت قریب آ چکی ہے!امام نے فرمایا موسیٰ! ویسے تو صبح وشام موت کے انتظار میں رہا کرو کہ وہ اپنے وقت پر ضرور آ کر رہے گی، لیکن زندہ لوگوں سے مُردوں کا معانقہ زندوں کی لمبی عمر کو بیان کرتا ہے۔ پھر امام نے پُوچھا تمہارے داماد کا کیا نام تھا؟ عرض کیا حسین! امام نے فرمایا یہ خواب دلالت کرتا ہے کہ تمھیں لمبی عمر ملے گی اور امام حسین علیہ السلام کی زیارت کا شرف حاصل ہوگا۔''[1]

عالمِ برزخ اور نسبتہً غیب:

تو اس ساری گفتگو کا یہ نتیجہ نکلا کہ عالمِ برزخ اور ثواب وعذاب ان لوگوں کے لیے غیب ہے جو دُنیا میں رہتے ہیں لیکن یہ نسبتہً غیب ہے، جونہی انسان اس دُنیا سے رُخصت ہوگا۔ یہ چیزیں غیب نہیں رہیں گی، بلکہ واضح اور آ شکار ہوجائیں گی۔اور نیک اور بدکار لوگوں کے ثواب وعذاب کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔نیک لوگ وہاں پر خوش وخرم اور شادمان وفرمان

---

[1] اسماء والعالم ص ۴۳۳

ہیں کیونکہ فیضِ ربی اُن کے شاملِ حال ہے اور اپنے نیک اعمال کی جزا دیکھ رہے ہیں، لیکن گناہگار اور بدکار لوگ دو لحاظ سے عذاب میں مبتلا ہیں ایک تو اپنے ان گناہوں اور بدکاریوں کی وجہ سے جن کا دُنیا میں ارتکاب کرتے رہیں ہیں اور اب اُن کے عذاب کا مزہ چکھ رہے ہیں اور دوسرے اس غم اور افسوس کی وجہ سے جو وہ اپنی گذشتہ زندگی اور برباد شُدہ عمر پر کرر ہے ہیں اور اس کو یاد کر کے اس غم میں گھلے جا رہے ہیں اور جب وہ یہ بات خاطر میں لاتے ہیں کہ ناپائیدار دُنیا کے ساتھ فضول دل لگائے رکھا، اپنی دنیاوی فرصت سے فائدہ نہ اُٹھایا اور مرنے کے بعد کے عالم کے لیے کوئی ذخیرہ جمع نہیں کیا تو سخت غمگین اور پریشان ہوجاتے ہیں اور یہی غمگین اور افسوس بذاتِ خود ایک بہت بڑا اور دردناک عذاب ہے۔

عقلمند شخص کی علامتیں:

عقلمند انسان وہ ہے جو اس چند روزہ دُنیا میں ناپائیدار اور دنیاوی مال ومقام سے مغرور نہ ہو، جلد ختم ہوجانے والی لذّتوں اور شہوتوں میں مگن نہ ہوجائے، خود کو فراموش نہ کر دے، انسانیت کو نہ بھلا دے۔ اپنے کل کے لیے توشہ اکٹھا کرے اور خالی ہاتھ موت کی آغوش میں نہ چلا جائے۔

دراین دیر موحش وراین دار فانی
نماند کسی جاودانی
بغیر ازفنا نیست حاصل جہاں را
خدایست باقی وباقی است فانی
نہ فرعون ماند نہ گنج ونہ قارون
نہ دردست موسیٰ عصای شباتی
بفکر سرای بقاباش جانا
منہ دل بہ اُمید دنیای فانی

اس وحشت ناک اور فانی گھر میں نہ تو کوئی باقی رہا ہے اور نہ ہی کوئی جاودان رہے گا۔ کائنات کو فنا کے علاوہ اور کچھ نہیں ملے گا۔ صرف خدا ہی باقی ہے اور باقی سب فانی ہے۔ اس دُنیا میں نہ تو فرعون باقی رہا اور نہ ہی خزانہ وقارون باقی رہے اور نہ ہی موسیٰ کے ہاتھ میں عصائے شباتی باقی رہا۔ اے جانِ من! ہمیشہ جاودانی سرا کی فکر میں رہو اور دُنیائے فانی کی امید پر کسی چیز کے ساتھ دل مت لگاؤ۔"

قرآن مجید انسانوں کو نصیحت کرتا ہے:

قرآن مجید نے کئی مقامات پر لوگوں کو مختلف طریقوں سے نصیحت کی ہے اور ان کی فکر کو اُن کے مستقبل کی طرف مرکوز کیا ہے۔ سعادت مند لوگ وہ ہیں جو دل کی آنکھیں کھول کر، عقل کی طاقت کو کام میں لا کر اپنے بارے میں سوچتے ہیں، غفلت اور بے خبری کے پردوں کو ہٹا کر سعادت اور سربلندی کی راہ میں قدم بڑھاتے ہیں۔

ارشاد رب العزت ہے:

وَاتَّبِعُوٓا اَحۡسَنَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِيَكُمُ الۡعَذَابُ بَغۡتَةً وَّاَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ۝٥٥ اَنۡ تَقُوۡلَ نَفۡسٌ يّٰحَسۡرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِىۡ جَنۡۢبِ اللّٰهِ وَاِنۡ كُنۡتُ لَمِنَ السّٰخِرِيۡنَ ۝٥٦

''قرآن مجید کو جو کہ بہترین خدائی کتاب ہے کہ پیروی کرو قبل اس کے کہ خدا کا ناگہانی عذاب تمہارے دامن گیر ہو جائے اور تم نادانستہ طور پر اس کی لپیٹ میں آ جاؤ تو اس وقت غافل اور خفتہ دل انسان کہے گا، مجھ پر افسوس ہے کہ میں نے خدا کے حکم کی تعمیل میں کوتاہی کی ہے۔ اس کی اطاعت سے روگردانی کی ہے اور خدا کے دین کا مذاق اڑایا ہے۔[1]''

پیغمبرؐ اور آئمہؑ اطہار کی دلسوز نصیحتیں:

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اطہار علیہم السلام نے جو مسلمانوں کے دلسوز باپ اور مہربان اُستاد کی حیثیت رکھتے ہیں اپنے پیروکاروں کو ہمیشہ معنویت اور روحانیت کی ترغیب اور تشویق کی ہے۔ اور اپنی گفتگو اور خطوط میں بھی اُنہیں ضروری ہدایات کی ہے کہ اپنے معنوی فرائض کو کبھی نہ بھلائیں۔ آخرت کو فراموش نہ کریں اور ہمیشہ اپنے آپ کو دنیا کا بندہ اور بردہ تصور نہ کریں۔

رُسول پاکؐ کا فرمان:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''مالی اری حب الدنیا غلب علی کثیر من الناس حتیٰ کان الموت فی هذه

---

[1] سورہ نمبر ۳۹۔ آیات ۵۵، ۵۶

الدنیا علی غیرھم کتب و کان الحق فی ھذا الدنیا علی غیرھم وجب وحتی کان ما یسمعون من خبر الموات قبلھم عندھم کسبیل قوم سفر عما قلیل الیھم راجعون۔"

''مجھے کیا ہوگیا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ دُنیا کی محبت بہت سے لوگوں پر غالب آ چکی ہے اور ان کی حالت یہ ہوگئی ہے گویا اس دنیا میں موت اُن کے غیروں کے لیے مقرر کی گئی ہے اور حق وعدل کی رعایت دوسرے لوگوں پر واجب کی گئی ہے اور حقائق کا سامنا کرنے سے اس حد تک کتراتے ہیں کہ جب اُنہیں ماسلف افراد کی موت کی خبر ملتی ہے تو اُن کی صورت حال ان لوگوں جیسی ہو جاتی ہے جن کے کچھ لوگ سفر پر گئے ہوں اور کچھ عرصہ بعد وہ واپس آ جائیں گے۔''[۱]

ایک اور روایت میں ہے کہ:

"ان امیرالمومنین علیہ السّلام دخل سوق البصرة فنظر الی الناس یبعیون ویشترون، فبکی بکاءً اشدیداً ثم قال یاعبیدالدنیا وعمال اھلھا، اذ کنتم بالنھار تخلفون وباللیل فی فراشکم تناصون وفی حلال ذالك عن الآخرة تغفلون فمتی تجھزون الزادوتفکرون فی المعاد۔"

''حضرت علی علیہ السلام بصرہ کے بازار میں تشریف لائے تو لوگوں کو اس قدر خرید وفروخت میں سرگرم عمل پایا کہ گویا وہ خود کو بھُول چکے ہیں۔ اور اپنے انسانی ہدف سے بالکل بھٹک چکے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت سخت پریشان ہوگئے اور خُوب گریہ کیا۔ پھر فرمایا: اے دنیا کے بندو! اور اے دنیاوالوں کے مزدورو! تم دن کو تو کاروبار اور قسمیں کھانے میں مصروف رہتے ہو اور رات کو بے خبری کی حالت میں بے سُدھ ہو کر بستروں میں جا لیٹتے ہو۔ اور رات اور دن کے درمیانی اوقات میں آخرت اور اور اُس کے حساب وکتاب سے غافل رہتے ہو تو پھر کس وقت خود کو اس سفر کے لیے آمادہ کرو گے جو تمہیں درپیش ہے؟ اور کب اس کے لیے زادراہ تیار کرو گے؟ اور کب اور کس زمانے میں قیامت اور معاد کے بارے میں سُوچو گے؟''[۲]

---

[۱] تحت العقول ص ۲۹

[۲] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۶۷۴ (مادہ سوق)

مجلس نمبر 10

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ ۞ وَاِذَا النُّجُوۡمُ انۡكَدَرَتۡ ۞ وَاِذَا الۡجِبَالُ سُيِّرَتۡ ۞

(قرآن کریم)

قیامت سے پہلے دُنیا کا خاتمہ:

قبل اس کے کہ قیامتِ کبریٰ قائم ہو اور اوّلین وآخرین مخلوق حساب وکتاب اور جزا وسزا کے لیے دوبارہ زندہ ہو، یہ عالم فنا ہو جائے گا۔ آسمان لپیٹ دیے جائیں گے۔ منظومہ شمسی درہم برہم ہو جائے گا اور تمام ارضی وسماوی مخلوق موت کا جام پی لے گی۔ ان محیر العقول اور حیران کُن رودادوں کا تذکرہ قرآن مجید کی متعدد آیات اور آئمہ اطہار کی بہت سی روایات میں آیا ہے جو ان آیات کی تفسیر اور تشریح کرتی ہیں۔

ممکن ہے کہ ایک زبردست زلزلہ تمام رُوئے زمین کو ہلا کر رکھ دے، زمین کے ایک وسیع وعریض علاقے کو مکمّل طور پر تباہ کر دے جس سے دُنیا کا بے حد وحساب نقصان ہو جائے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ایک نہایت ہی طاقتور ایٹم بم کا روئے زمین کے کسی حصّہ پر دھماکہ کیا جائے جو زمین کے ایک بہت بڑے حصّے کو زبردست نقصان پہنچائے۔ اس علاقے کے تمام انسانوں کا خاتمہ کر دے۔ حصّہ زمین کے تمام حیوانات وحشرات کا مکمل طور پر خاتمہ ہو جائے اور تمام درخت اور نباتات کُلی طور پر خشک ہو جائیں لیکن یہ دونوں عظیم اور ہلاکت آفرین حادثات نہ تو تخلیقی قوانین کو تبدیل کر سکتے ہیں اور نہ ہی کائنات کی کیفیت میں تبدیلی لا سکتے ہیں اور نہ ہی منظومہ شمسی برہم ہوگا، حتیّٰ کہ کرۂ ارضی کی تکوینی وضع پر بھی کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ بلکہ زمین اپنے مدار کے گرد اسی طرح گھُومتی رہے گی۔ دوسرے شمسی سیارے حسبِ معمول اپنی راہوں پر گامزن رہیں گے اور آفتاب عالم تاب حسبِ دستور سابق طُلوع وغروب ہوگا اور نور افشانی کرتا رہے گا۔

کائنات کا خاتمہ یا بُنیادی تبدیلی:

روزِ جزا کے پہنچنے سے پہلے کائنات کے خاتمے کا مسئلہ معمولی بات نہیں بلکہ ایک اساسی تبدیلی اور بنیادی دگرگونی ہے جس کا کرۂ زمین جیسے ایک چھوٹے سے آفاقی جِرم کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ عالم کے خاتمے پر وہ نظام ختم ہو جائے گا جو اس وقت کائنات پر حکم فرما ہے۔ اجرام سماوی کا توازن اور تعادل بگڑ جائے گا جس کے نتیجے میں ایسے حالات پیش آ جائیں

گے جو انسان کے تصّور میں بھی نہیں آ سکتے۔

بالذات ازلی اور ابدی:

خداوند عالم نے دُنیا اور منظومہ شمسی کی عمر کے خاتمے کے متعلق قرآن مجید کی متعدد آیات کے ضمن میں نہایت ہی عظیم روئدادوں کے عنوان سے خبر دی ہے۔ منجملہ ان خبروں کے یہ فرمایا ہے کہ: سُورج لپٹ جائے گا اور اپنی چمک دمک کھودے گا۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر ریت کی مانند اُڑتے پھریں گے، ستارے ٹوٹ جائے گا، سمندروں میں آگ لگ جائے گی، زمین کی کیفیت کچھ اور ہو جائے گی غرضیکہ کائنات میں حیرت ناک واقعات رونما ہوں گے۔ مزید تفصیل کے لیے متعلقہ آیات کچھ تو اسی فصل میں اور کچھ آئندہ فصل میں بیان ہونگی۔

مکتبِ اسلام میں بالذات ازلی اور ابدی صرف اور صرف خداوندِ قدوس ہی کی ذات بابرکات ہے، اس کے علاوہ نہ تو کوئی چیز اس کامل صفت کی حامل ہے اور نہ ہی کوئی شخص۔ خدا کے علاوہ جو کچھ اور جو کوئی بھی ہے وہ حادث اور اسی کی مخلوق ہے۔ اور یہی چیز بذاتِ خود دینِ مبین اسلام میں توحید کے بُنیادی اصول میں سے ایک اصل ہے۔ جیسا کہ وہ خود ارشاد فرماتا ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ③

وہ ”اول ہے ہر آغاز کے اور ہر موجود سے پہلے تھا اور وہ آخر ہے بغیر انجام کے اور تمام مخلوق کے بعد رہے گا۔ وہ روشن آیات کی وجہ سے ظاہر اور آشکار ہے اور اس کی حقیقت کے ادارک سے مخلوق عاجز ہے لہٰذا باطن اور مخفی ہے۔ اور وہی تمام اشیاء کی حقیقتوں کو جانتا اور ان سے باخبر ہے۔“[1]

نہ اوّل کی ابتدا ہے نہ آخر کی انتہا:

میمون البان کہتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیت ”ھوالاوّل آخر۔“ کے بارے میں پُوچھا گیا تو امام نے فرمایا۔

”اول لاعن اول قبلہ ولا عن بدءٍ سبقہ وآخرلاعن نہایۃ کمایعقل من صفات المخلوقین ولکن قدیم الاوّل وآخر لم یزل ولایزال بلابدءٍ ولا

---

[1] سُورہ نمبر ۵۷ آیت نمبر ۳

نھایة لایقع علیه الحدوث ولایحول من اهلی الی حال خالق کل شیء۔"

"وہ اوّل ہے نہ ایسا اوّل کہ جس سے پہلے کوئی اور اوّل ہو، اور وہ اس سے سبقت لے گیا ہو۔ اور وہ آخر ہے نہ ایسا آخر کہ مخلوق کی صفات کی مانند اس کی کوئی انتہا ہو۔ وہ اوّل ہے اور پہلے بھی بے انتہا تھا، اور آخر ہے اور بعد میں بھی بے انتہا رہے گا نہ اس کے آغاز کی ابتداء ہے نہ انجام کی انتہا، اس پر حوادث طاری نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتا ہے اور ہر شخص اور ہر چیز کا خالق ہے۔"[۱]

مخلوقات کا آغاز اور انجام:

عظیم کہکشائیں کائنات کے چھوٹے اور بڑے اجرام، ارضی اور سماوی مخلوق غرضیکہ عالمِ ہستی میں جو بھی مخلوق موجود ہے سب نے خدا کی حکیمانہ مشیت کے تحت ہستی اور وجود کا جامہ پہنا ہوا ہے اور قرآنی تصریحات کے مطابق تمام موجودات ومخلوقات کی ایک محدود حد اور مقررہ مدت ہے۔ ایک دن اُنہوں نے وجود کی صُورت اختیار کی اور دوسرے دن عدم کو سدھا رجائیں گی۔ ارشاد ربانی ہے۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳﴾

"ہم نے زمین اور آسمانوں کو نہیں پیدا کیا مگر حق اور عدالت کی بنیاد پر اور محدود اور مقررہ مدت کے لیے، لیکن جو لوگ کافر ہو گئے ہیں وہ حقائق کی طرف توجہ نہیں کرتے اور جن خطرات سے اُنہیں آگاہ کیا گیا ہے وہ اس سے بے پرواہ اور منہ موڑے ہوئے ہیں۔"[۲]

خالقِ کائنات جس کے نہ تو آغاز کی حد ہے اور نہ انجام کی:

یہ صرف مکتب اسلام ہی نہیں ہے جو تمام کائنات کو حادث اور مخلوق جانتا ہے۔ بلکہ خدا کے تمام پیغمبر اس بارے میں متفق القول ہیں اور وحی کے ذریعہ اُنہیں اس بات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اُنہوں نے اپنے پیروکاروں کو اس امر سے مطلع کیا ہے کہ عالمِ ہستی میں خدا کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ حادث اور مخلوق ہے۔ اور جو ذات ازلی و ابدی، قدیم بالذات ہے اور جس

---

[۱] معانی الاخبار ص ۱۲

[۲] سُورہ ۴۶ آیت ۳

کا نہ آغاز ہے نہ انجام وہ صرف اورصرف خداوند متعال ہی ہے۔

کائنات کے بارے میں غلط نظریہ:

گذشتہ دور میں قدیم فلاسفہ میں سے ارسطو اور متاخرین میں سے ابونصر فلابی جیسے فلاسفہ اور مشہور و نامور دانشور جن میں سے بعض تو انبیائے ماسلف کے ہمعصر تھے، یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ تمام آسمان اپنی تمام صفات کے ساتھ قدیم بالذات ہیں نہ تو اں کا آغاز ہے اور نہ ہی انجام، لیکن اُن کا یہ عقیدہ گمان اور تخمین پر مبنی تھا اور کائنات کے بارے میں کسی دلیل و برہان کے بغیر اس غلط نظریہ کی ترویج کی۔ اور وحی الٰہی اور انبیائے عظام کے فرامین کے برخلاف کائنات اور اس کی صفات کو قدیم بالذات سمجھا اور صدیوں تک اس غلط مفروضے کو ایک علمی موضوع کے عنوان سے کتابوں میں لکھتے رہے، اس کا دفاع کرتے رہے اور اور کلاسوں میں طلباء کو اس کی تعلیم دیتے رہے۔

لیکن موجودہ دور میں سائنسی علوم کی ترقی اور تخلیقی اسرار و رموز سے پردے اُٹھ جانے کی وجہ سے سائنسدان اور دانشور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کائنات کا یہ حیران کُن ڈھانچہ نہ ازلی ہے۔ اور نہ ابدی، وہ عظیم کہکشائیں جو طاقتور دُوربینوں TELESCOPES کے بغیر نہیں دکھائی دیتیں، سب حادث ہیں اور کائنات کے نورانی جرم اسی مخلوق ہیں جو ایک زمانے میں معرضِ وجود میں آئے اور اس وقت میں کتم عدم میں چلے جائیں گے، خاموش ہو جائیں گے اور مُردہ جرم کی صُورت میں بیکراں فضا کی بے انتہا وسعتوں میں سرگرداں ہو جائیں گے۔

انبیاء کے اقوال اور آج کا علم:

خلاصہ کلام کائنات کے حادث ہونے اور عالم کی تخلیق کا مسئلہ جو انبیاء نے گذشتہ زمانوں میں خدا کی وحی کے ذریعے معلوم کیا تھا اور بڑے بااعتماد انداز میں اپنے پیروکاروں کے لیے اس کی وضاحت اور تشریح کی آج مکمّل طور پر پایہ ثبات تک پہنچ چُکا ہے اور کسی بھی صُورت میں اس کی تردید نہیں کی جاسکتی۔ اور اس کے برعکس کائنات کی ذات اور صفات کے قدیم ہونے کا نظریہ جسے دُنیا بھر کے نامی گرامی فلاسفہ اور دانشور قبول کر چکے تھے آج کے علمی حلقوں نے اُسے مسترد کر دیا ہے اور تمام محققین اور دانشور بھی اسے قبول کرنے سے قطعاً انکار کر چکے ہیں۔

اس اہم دینی اور علمی بحث کو جو کہ معاد کے بنیادی اور اہم ترین مسائل میں سے ہے اس فصل میں تفصیل سے بیان کیا جائے گا اور اولاً ازلی و ابدی کے معانی کی وضاحت کی جائے گی جنہیں آج کے قلم کار بے انتہا کے معنی سے تعبیر کرتے ہیں اور ثانیاً قدیم دانشوروں کے اقوال کی طرف اشارہ کیا جائے گا جو اجرام سماوی کو قدیم ازلی سمجھتے تھے۔ اور اسی طرح موجودہ دور

کے دانشور کی گفتگو کی طرف اشارہ کیا جائے گا جو عالم کو حادث سمجھتے اور قدیم فلاسفہ کے نظریہ کو مسترد کر چکے ہیں۔

ازلی اور ابدی کا معنی:

ازلی یا قدیم اس چیز کو کہتے ہیں جو بے انتہا موجود ہو اور اس کا کوئی نقطہ آغاز نہ ہو۔ اور ابدی اس چیز کو کہتے ہیں جو بے انتہا باقی ہو اور اس کے اختتام کی کوئی حد نہ ہو۔

عالمِ تصّور میں بے انتہا کی مثال:

بے انتہا کی وضاحت اور ذہن میں بٹھانے کے لیے ہم اعداد کی مثال بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ایک (۱) کے عدد کا صحیح عدد کے عنوان سے انتخاب کرتے ہیں اور اس کے اوّل میں ایک صفر (۰) لگا دیں تو وہ دس (۱۰) بن جائے دس کے آگے ایک اور صفر لگا دیں تو سو (۱۰۰) بن جائے گا، اسی طرح ایک صفر بڑھاتے جائیں سو سے ہزار، ہزار سے دس ہزار، ایک لاکھ، دس لاکھ ایک کروڑ دس کروڑ، اسی طرح اور آگے بڑھیں ایک ارب، دس ارب اور آگے بڑھیں کھرب بن جائے گا۔ پھر بھی نہ رُکیں اور اپنے دل مین صفروں کا اضافہ کرتے جائیں ایک صفر نہیں لاکھوں، کروڑوں، اربوں صفروں کا اضافہ کرتے جائیں، اور آگے بڑھیں، کرۂ زمین کے برابر صفریں لگا دیں، اگرچہ کوئی انساں یا حساب کرنے والی مشین اس عدد کو نہیں پڑھ سکے گی، لیکن ہمارے لیے عالم ذہن وخیال میں پھر صفریں لگانے کے لیے راستہ کھُلا ہوا ہے اور اسی طرح صفروں کا اضافہ کر سکتے ہیں اور اس عدد کو آگے بڑھا سکتے ہیں اور پھر عالمِ تصور میں بے انتہا کا یہی معنی ہے۔

آفاقی اجرام کی تخمینی عمر:

بنابریں اگر سائنسدان کبھی یہ کہتے ہیں کہ فلاں آسمانی ستارے کی عمر دو ارب سال ہے، باوجود یکہ یہ دو ارب سال کی مُدت بھی بہت طولانی ہے، لیکن پھر بھی اس ستارے کی عمر کی تعیین ہر چند کہ ہماری نظر میں اور ایک انسان کی عمر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بہت ہی زیادہ ہے، لیکن پھر بھی اس کا یہ معنی ہے کہ وہ جرم (ستارہ) قدیم اور ازلی نہیں ہے اور نہ ہی اس کا وجود بے انتہا ہے بعینہٖ اگر یہ کہا جائے کہ وہی ستارہ اربوں سال باقی رہے گا اور اسی طرح نور افشانی کرتا رہے گا تو اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ابدی نہیں ہے اور اس کا نور بے انتہا نہیں ہے۔ موجودہ دور کے سائنسدانوں نے اپنے پاس موجود معیار کی بُنیاد پر یہ کام انجام دیا ہے اور بعض آسمانی اجرام کی گزشتہ اور آئندہ عمر کے بارے میں اندازے لگائے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ تمام آفاقی اجرام نہ تو ازلی ہیں نہ ابدی بلکہ حادث ہیں۔

سُورج کی گذشتہ اور آ ئندہ زندگی:

’’سُورج کی روشنی ہائیڈروجن کے جلنے اور اس کے ہلیم HELIUM میں تبدیل ہوجانے کی وجہ سے معرض وجود میں آتی ہے۔ سورج کے مجموعی نُور کے لیے تبدیلی کا یہ عمل وسیع صُورت میں انجام پانا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر سکینڈ ۶۳۰ ملین ٹن ہائیڈروجن ۶۲۵ء۴۰ ملین ٹن ہیلیم میں تبدیل ہوتا رہتا ہے اور ۶۰ء۴ ٹن باقیماندہ ہائیڈرون جن نورانی انرجی میں تبدیل ہو کر ختم ہوجاتی ہے۔ اس انرجی کا ایک مختصر سا حصّہ زمین تک پہنچ کر اُسے روشن کرتا ہے اور یہی مختصر سی نورانی انرجی روئے زمین پر موجود تمام اشیاء کی زندگی کی ضامن ہے۔‘‘

’’ممکن ہے کہ یہ تصّور ہو کر ہر سکینڈ میں خرچ ہونے والی ہائیڈروجن کی اس مقدار کا سلسلہ اگر اسی طرح جاری رہا تو سُورج زیادہ تر برقرار نہیں رہ سکے گا۔ لیکن اگر سُورج کے وزن اور حجم کا حساب کریں تو پھر یہ تصور زائل ہوجائے گا، سُورج کا تخمینی اور تقریبی وزن دو بلین بلین بلین ٹن ہے۔ اگر ہم یہ تصور کریں کہ سُورج کا تمام جرم روزِ اوّل ہی سے ہائیڈروجن سے تشکیل یافتہ ہے اور ہائیڈروجن کی ہیلیم میں تبدیلی کا عمل مسلسل طور پر۔ ۶۳۰ ملین ٹن فی سکینڈ ہے اور یہی صُورت حال بغیر کسی وقفے کے جاری ہے۔ اور جاری رہے گی ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ سُورج تقریباً چالیس بلین سال سے نورافشانی کرتا چلا آرہا ہے۔ اور مزید ساٹھ بلین سال تک اسی صورت کو جاری رکھ سکتا ہے۔[1]

ممکن ہے کہ خداوندقدیر کسی مخلوق کو پیدا کرے اور اسے ابدی عمر بھی عطا کردے تو ایسی مخلوق ابدی اور دائمی تو ہوگی، لیکن قدیم اور ازلی نہیں ہوگی، کیونکہ اس مخلوق کا آغاز تو ہوگا، لیکن انجام نہیں ہوگا۔ جیسے مرنے کے بعد عالمِ آخرت میں لوگوں کی زندگی ہے جسے دوام اور ابدیت حاصل ہے۔ لیکن اگر کوئی چیز ازلی ہو اور گذشتہ دور میں بے انتہا بھی ہو تو اُسے حتمی طور پر ابدی ہونا چاہیے اور آئندہ دور کے لیے بے انتہا، اس کی ہستی باقی اور پائیدار ہونی چاہیے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو ضروری تھا کہ گذشتہ دور کے دوران ہی اس بے انتہا کا خاتمہ ہوجاتا اور اس کوئی نام ونشان تک باقی نہ رہتا۔

قدیم فلاسفہ کے کچھ اقوال جو آفاقی اجرام کو قدیم سمجھتے تھے۔

اجسام کی پیدائش میں مختلف نظریات:

"اختلف اهل العالم فی حدوث الاجسام والوجوه الممكنة لاتزيد على اربعة اما ان يكون محدث الذات والصفات اوقديم الذات والصفات او

---

[1] سیری در جہاں دانش ص ۲۸

قديم الذات محدث الصفات وبالعكس۔"

"خواجہ نصیر الدین طوسی کہتے ہیں، دنیا کی تخلیق اجسام کے بارے میں مختلف آ راء ہیں اور اس بارے میں ممکن احتمال دیے جاسکتے ہیں وہ چار وجوہ سے باہر نہیں۔ یعنی یا تو ان کی ذات اور صفات (دونوں) حادث ہیں۔ یا ذات اور صفات (دونوں) قدیم ہیں یا ذات قدیم اور صفات حادث ہیں، یا ذات حادث اور صفات قدیم ہیں۔

کائنات کے قدیمی ہونے کا نظریہ:

"اما القسم الاوّل فهو قول الجمهور من المسلمين والنصارىٰ واليهود۔"

"پہلی قسم کے قائل عام مسلمان، عیسائی، یہودی اور مجوسی ہیں۔"

"واما القسم الثانی فهو قول ارسطاطايس وثاوفرسطس وبرقلس ومن المتاخرين ابی نصر الفارابی وابی علی بن سينا وعندهم ان السمٰوات قديمة بذاتها وصفاتها المعينة الا الحركات والاوضاع فان كان كُل واحد منها حادث ومسبوق بالآخر الاالی اوّل۔"

"قسم دوم کے قائل ارسطو اور یونان کے کئی دوسرے قدیم حکماء وفلاسفہ ہیں اور متاخرین میں سے فارابی اور بوعلی سینا ہیں۔ ان کے نظریے کے مطابق آسمان اپنے ذاتی لحاظ سے اسی طرح مخصوص صفاتی لحاظ سے قدیم ہیں۔ لیکن ان کی حرکات اور اوضاع، نوعی لحاظ سے قدیم ہیں نا کہ ذاتی نقطہ نظر سے۔ با این معنی کہ ہر ایک حکت حادث ہوتی ہے اور دوسری حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن وہ حرکات اور امضاع نوعی لحاظ سے ازلی ہیں اور ان کا کوئی نقطہ آغاز نہیں ہے۔ [1]

تیسری اور چوتھی قسم جنہیں خواجہ طوسی نے اپنی تلخیص المحصل میں بیان کیا ہے ہماری بحث سے خارج ہیں، لہٰذا ہم اُنہیں یہاں پر ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

دہریوں کا نظریہ:

"وهولاء ايدك الله هم القائلون بان الدهر سرمدية لااوّل لها ولا آخروان

---

[1] تلخیص المحصل ص ۱۸۹

كل حركة تحرك بها الفلك فقد تحرك قبلها بحركة قبلها حركة من غير نهاية وسيتحرك بعدها بحركة بعد حركة الاالى غاية وانه لايوم الى وقد كان قبله ليلة ولاليلة الاوقد كان قبلها يوم ولا انسان تكون الامن نطفة ولا نطفة تكونت الامن انسان ولاطائر الامن بيضة ولا بيضة الامن طائرٍ ولا شجرة الامن حبة ولاحبة الامن شجرة وان هذه الحوادث لم تزل تتعاقب ولا تزال كل ليس للماضی منها بداية ولا للمستقبل منها نهاية وهی مع ذالك صنعة لصانع لم يتقدمها وحكمة من حكيم لم يوجد قبلها وان الصنعة ولصانع قدعان لم يزالا۔"

''جولوگ سماوی حرکات کونوعی لحاظ سے قدیم اورذاتی لحاظ سے حادث مانتے ہیں، اُن کا عقیدہ ہے کہ یہ دہر، سرمدی اور ہمیشگی ہے۔ نہ تو اس کا نقطہ آغاز ہے اور نہ ہی حدانتہا ہے۔ ہر حرکت کہ جس کی وجہ سے فلک متحرک ہے اس کا تعلق کسی اور حرکت سے ہے کہ جس سے پہلے ایک اور حرکت ہے اور اس سے پہلے ایک اور حرکت اور حرکات کا یہ سلسلہ لا متناہی ہے اور اس حرکت کے بعد بھی فلک حرکت کرتا رہے گا اور اس کے بعد بھی حرکت ہوگی اور حرکات کا یہ لا متناہی سلسلہ ہمیشہ رہے گا جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اسی طرح کوئی دن ایسا نہیں جس سے پہلے رات نہ ہو اور کوئی رات ایسی نہیں جس سے پہلے دن نہ ہو۔ اسی طرح کوئی انسان بغیر نطفہ کے وجود میں نہیں آیا اور کوئی نطفہ بغیر انسان کے معرضِ وجود میں نہیں آیا، کوئی پرندہ بغیر انڈے کے اور کوئی انڈہ بغیر پرندے کے معرضِ وجود میں نہیں آیا۔ بیج یا گھٹلی کے بغیر درخت اور درخت کے بغیر بیج یا گھٹلی وجود میں نہیں آئے اور یہ تبدیلیاں ہمیشہ سے ایک دوسرے کے بعد رونما ہوتی آ رہی ہیں اور رونما ہوتی رہیں گی۔ نہ تو اُن کے ماضی کی کوئی ابتدا ہے اور نہ ہی مستقبل کی کوئی انتہا ہے۔ یہ سب اسی کیفیت کے ساتھ کسی صناع کے مصنوع ہیں جو ان سے مقدم نہیں ہے اور کسی حکیم کی حکمت کے شاہکار ہیں جو ان سے پہلے نہیں تھا۔ خلاصۂ کلام صانع اور مصنوع دونوں قدیم ہیں، ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔''[1]

---

[1] اسماء والعالم ص ۵۹

اب چند ایک باتیں موجودہ دور کے دانشوروں کو جو عالم کی حادث مانتے ہیں BIOPHYSICS کے پروفیسر فرنیک ایلن کہتے ہیں: THERMODYNAMICS (حرارت) کے قانون نے ثابت کر دیا ہے کہ کائنات ایسی صُورتِ حال کی جانب رواں دواں ہے کہ جس میں تمام اجسام اپنے جیسے پست درجے تک پہنچ جائیں گے جس کے بعد قابلِ استعمال انرجی کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ ایسی صُورت میں زندگی ناممکن ہو کر رہ جائے گی۔ اگر کائنات کا کوئی نقطہ آغاز نہ ہوتا اور ازل سے موجود ہوتی تو اس سے پہلے اس قسم کے موت کے آلات اور عوامل حادث ہوتے۔ یہ تابناک سورج اور ستارے اور زندگی سے بھرپور زمین اس بات کی سچی گواہ ہیں کہ کائنات کے کسی زمانے میں وجود عمل میں آیا ہے اور اس کی پیدائش کسی خاص لمحہ میں وقوع پذیر ہوئی ہے۔"[1]

موجودہ دور کے دانشور اور انبیاء کا مکتب:

ہمارے دور کے سکالرز نے ان قدیم حکماء اور فلاسفہ کے نظریہ کی باطل سمجھ کر مسترد کر دیا ہے جو آسمانوں اور آفاقی اجرام کے ذاتی اور صفاتی طور پر قدیم ہونے کے قائل تھے۔ یہ سکالرز سائنسی علوم اور تجرباتی تحقیقات کی بنا پر اس قطعی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ کائنات نہ ازلی ہے اور نہ ابدی بلکہ کائنات کا ایک عظیم مجموعہ ایک ایسی مخلوق ہے جو مقررہ زمانے میں اور خاص حالات کے تحت معرضِ وجود میں آئی ہے۔ اور کسی اور زمانے میں اور کئی اور حالاتِ کی وجہ سے اختتام پذیر ہوگی اور یہ وہی حقیقت ہے جسے گذشتہ زمانے میں خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے پیشواؤں نے لوگوں سے بیان کی ہے اور مکتب انبیاء کے پیروکار صدیوں سے اسی عقیدہ پر کاربند چلے آ رہے ہیں۔

انبیاء کرام اور مادہ کا حادث ہونا:

مکتبِ انبیاء کے پیروکار صرف کائنات کے اجرام اور عالمِ ہستی کے مجموعہ ہی کو حادث نہیں مانتے بلکہ کائنات کے مواد اوّلیہ کو بھی حادث مانتے ہیں جو کائنات کا اصل مادہ ہیں اور کائنات اسی اصل مادہ سے تخلیق ہوئی ہے۔ اور اسے ایک ایسی مخلوق سمجھتے ہیں جو خالق کے ارادہ سے ہستی کا جامہ پہن کر معرضِ وجود میں آئی ہے۔ اور یہی نظریہ ہمارے دَور کے بہت سے دانشوروں کے نزدیک قابل قبول ہے اور وہ علمی نقطہ نظر سے مادہ کے قدیم ہونے کے نظریہ کو اسی طرح مُسترد کر چکے ہیں جس طرح کائنات کے قدیمی ہونے کو باطل سمجھتے ہیں اور وہ مادہ اور کائنات کو حادث مانتے ہیں۔

---

[1] اثبات وجود خدا ص ۱۸

مادہ ازلی نہیں ہے:

’’آیا کوئی عقلمند اور سمجھدار انسان یہ باور کرسکتا ہے کہ بے حس اور بے شعور مادہ اتفاق کی بنا پر اپنا آغاز آپ کرے اور اپنے آپ کو نظم عطا کرے اور یہ نظم اس کے لیے باقی بھی رہ جائے؟ یقیناً اس سوال کا جواب منفی ہے۔ جب انرجی (نئے) مادہ میں تبدیل ہوتی ہے تو یہ تبدیلی کسی نہ کسی قانون کے تحت ہی واقع ہوتی ہے۔ اور جب کوئی مادہ معرضِ وجود میں آتا ہے تو وہ بھی اُنہی قوانین کی پیروی کرتا ہے جن کی اس سے پہلے مادے پیروی کیا کرتے تھے۔‘‘

’’کمیسٹری میں یہ بات ثابت ہے کہ مادہ کسی نہ کسی دن نابود ہو جائے گا، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ بعض مواد کی نابودی بڑی حد تک سست ہے اور بعض کی بہت حد تک تیز بنابریں مادہ کا وجود ازلی نہیں بلکہ اس کا کوئی نہ کوئی نقطہ آغاز ضرور ہے۔ کمیسٹری اور دوسرے علوم کے شواہد بتاتے ہیں کہ یہ آغازِ سُست اور تاریخی بنیادوں پر نہیں تھا بلکہ مادہ کی تخلیق اچانک اور ناگہانی بنیادوں پر ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ کچھ ایسے دلائل بھی موجود ہیں جو مادہ کی تخلیق کے تخمینی زمانہ کی نشاندہی کرتے ہیں، اسی لیے مادی دُنیا کی ایک مقررہ زمانے میں تخلیق ہوئی ہے اور اسی زمانے سے مذکورہ قوانین کی پیروی کرتی آ رہی ہے۔ یہ اتفاق اور تصادف کی پیداوار ہے۔‘[1]

مادہ مخلوق ہے:

اسلامی روایات میں اس بات کی اچھی طرح وضاحت موجود ہے کہ خداوندِ عالم تمام اشیاء سے پہلے تھا اور ہر چیز کے بعد باقی رہے گا اور تمام اشیاء کو اپنی مشیت کے ساتھ خلق فرمایا ہے اور مادہ بھی ان اشیاء میں سے ایک ہے۔ بنابریں مادہ بھی تمام کائنات اور ثوابت وسیار کی مانند ایک تخلیق شُدہ اور حادث مخلوق ہے۔

علی بن مزیار کہتے ہیں کہ حضرت امام محمد باقرؑ نے کسی شخص کے لیے اپنے ہاتھوں سے ایک دعا لکھی جس کے الفاظ یہ تھے،

’’یاذاالذی کان قبل کُل شیء ثم خلق کُل شیء ثم یبقی ویفنی کل شیء۔‘‘

’’اے وہ خدا جو ہر چیز سے پہلے تھا، ہر چیز کو خلق فرمایا، پھر تُو تو باقی رہ جائے گا اور دوسری تمام چیز فنا

---

[1] ’’آئن سٹائن کہتے ہیں: میں اس دُنیا میں مادہ اور انرجی کو ازلی نہیں مانتا اور نہ ہی تخلیق کائنات کو اتفاق کا نتیجہ سمجھتا ہوں بلکہ تخلیق کائنات میں پروردگار قادر متعال کی مشیت کو کارفرما سمجھتا ہوں اور بس۔‘‘

ہوجائیں گی۔‘‘[1]

آسمانی حرکات کے قدیم ہونے کا نظریہ:

ان فلاسفہ کی گفتگو کا دوسرا حصہ تھا کہ آسمانی حرکات اور دہر کی تبدیلیاں نوعی اعتبار سے تو قدیم ہیں اور ذاتی لحاظ سے حادث ہیں، فلک کی ہر ایک حالت اپنے سے پہلے حرکت کے بعد ملی ہوئی ہے۔ ہر رات، دن کے بعد آتی ہے، ہر نطفہ انسان کی تشکیل کرتا ہے اور ہر انسان نطفہ کی تشکیل کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ مسلسل اور پے در پے تبدیلیاں اور حرکات اگر چہ ان میں سے ہر ایک فروی اور ذاتی لحاظ سے حادث ہیں، لیکن نوعی اعتبار سے ازلی اور ابدی ہیں۔ نہ تو ان کی کوئی ابتدا ہے اور نہ ہی کوئی انتہا۔

ایک زمانہ تھا جب انسان کا نام ونشان نہ تھا:

ان فلاسفہ کی اس قسم کی باتیں بھی نہ تو قرآن مجید اور دینی تعلیمات سے مطابقت رکھتی ہیں اور نہ ہی سائنس اور حیاتیات کے اُصولوں سے ہم آہنگ ہیں۔ اس نظریہ کے حامی انسان اور نطفہ کو دہر کے ظرف میں ازلی مانتے ہیں اور اُن کے نطفہ آغاز کو تسلیم نہیں کرتے، لیکن قرآن مجید یہ فرماتا ہے۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ①

یقیناً ایک زمانہ ایسا گزرا ہے جس میں انسان کا نام ونشان نہ تھا۔[2]

انسان کی تخلیق کس زمانے میں ہوئی:

باوجودیکہ انسانی تخلیق، علم الٰہی میں قطعی طور پر مقدر ہو چکی تھی اور اس کے تخلیقی عناصر بھی طبعی مواد اور معدنی نمکیات کی صُورت میں آغوشِ طبیعت میں مچل رہے تھے، لیکن جب خداوند خالق وتوانا نے اسے خلق فرمایا اور خلقت ہستی اس کے زیب تن کی اس وقت کافی زمانہ گزر چُکا تھا، جیسا کہ حضرت امام محمد باقرؑ علیہ السلام اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

’’کان مذکوراً فی العلم ولم یکن مذکوراً فی الخلق‘‘

---

[1] بحار الانوار جلد ۳ ص ۱۸۴

[2] سورہ ۷۶ آیت ۱

''انسان علمِ الٰہی میں تو مذکور تھا، لیکن تخلیق شدہ اور موجودہ صورت یافتہ نہیں تھا۔''[۱]

امام جعفر صادق علیہ السلام بھی اسی آیت کی تفسیر میں یوں فرماتے ہیں:

کان شیئا مقدوراً لم یکن مکوناً

انسان قضائے الٰہی میں ایک مقدر اور حتمی چیز تو تھا لیکن تخلیق شدہ اور موجودہ صورت یافتہ نہیں تھا۔[۲]

یہ آیت اور اس سے متعلقہ احادیث مخلوق ہے اور انسانی حیات کا زمانے کے دوران اور مخصوص دورے میں آغاز ہوا ہے۔

انسان کی بدبودار مٹی سے تخلیق:

ایک اور بات نطفہ اور انسان کے متعلق جس کی یاددہانی ضروری معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے صراحت کے ساتھ فرما دیا ہے کہ خالق کائنات نے انسانِ اوّل کو خشک بدبودار، مٹی یا کیچڑ یعنی مٹی اور پانی کو ملا کر اس سے حاصل ہونے والے جوہر سے پیدا کیا ہے اور پھر اپنی حکمت بھری قضاء سے ہمیشہ کے لیے مقرر فرما دیا ہے کہ نسل انسانی رحم مادر میں نطفے کے انعقاد کے ذریعہ معرضِ وجود میں آتی رہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾

اور بے شک ہم نے انسان کو بدبودار خشک مٹی سے پیدا کیا۔[۳]

''اور ہم نے آدمی کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اس کی نوع کی بقا کے لیے اس کو ایک عورت کے رحم میں ڈال دیا۔''

نطفہ اور انسان دونوں حادث ہیں:

پس معلوم ہوا کہ قرآنی نقطہ نظر سے انسان اور نطفہ کے نوع کے لحاظ سے قدیم ہونے کی بات بھی غلط اور بے بنیاد ہے اور مکتب اسلام میں یہ دونوں حادث ہیں نہ ازلی ہیں اور نہ ابدی۔ نہ تو ان کا ماضی بے انتہا ہے اور نہ ہی مستقبل۔

علمی نقطہ نظر سے بھی دورِ حاضر کے دانشور، نطفہ اور انسان کے قدیمی ہونے کے نظریہ کو غلط ثابت کر چکے ہیں، کیونکہ

---

[۱] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۶۹

[۲] تفسیر صافی ص ۵۵۶

[۳] سورہ ۱۵۔ آیہ ۲۶

علمی طور پر یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ابتدا میں یہ زمین آگ کے ایک گولہ کی مانند جلا کر بھسم کر دینے والا ایک جرم تھی۔ اور نا معلوم مُدت مدید گزرنے کے بعد آگ پر ایک نازک سی تہہ جمنا شروع ہوئی۔ جس نے زمین کی صُورت اختیار کر لی اور زندہ مخلوق کے رہنے کے قابل بن گئی۔ آج بھی ہمارے کرۂ ارضی کے اندرونی حصّوں میں سیال اور آتشین مواد اسی طرح موجود ہیں اور کبھی کبھار کسی نہ کسی نقطہ سے آتش فشاں کی صُورت میں اُبلنا شروع ہو جاتے ہیں اور زمین سے پگھلا ہوا مواد اور پگھلے پتھر باہر آ جاتے ہیں۔

زمین کی گہرائی اور پگھلا ہوا مواد:

''ہم جس قدر زمین کے مرکز سے نزدیک ہوتے جائیں گے اتنا ہی درجہ حرارت بڑھتا جائے گا۔ اس درجہ حرارت کی افزائش اس حد تک ہے کہ ایک مقررہ حد تک پہنچ کر کوئی جسم جامد حالت میں باقی نہیں رہ سکتا۔ یہ گہرائی کہ جس کی حدُود کے بعد ''سیالی'' صورتِ حال شروع ہو جاتی ہے سو کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے۔ اس ضخامت کے ساتھ ۱۲۷۵۶ کلومیٹر قطر زمین کی نسبت زمین کی جامد سطح ایک نازک پردے کی مانند معلوم ہو گی۔ اسی ضخامت کے تصوّر اور سمجھانے کے لیے عام طور پر اسے مُرغی کے انڈے کے چھلکے سے تشبیہ دیتے ہیں۔''[1]

ابتدا میں زمین کا درجہ حرارت:

المختصر کرۂ زمین کی پیدائش کے آغاز میں شدت حرارت کی وجہ سے ہر چیز بخارات کی صُورت میں تھی اور اس جھلسا دینے والی فضا میں عناصر کا ایک دوسرے سے مرکب ہونا ناممکن تھا۔ چہ جائیکہ زمین کے اس آتشین ماحول میں کوئی زندگی پائی جاتی یا کوئی زندہ مخلوق اپنے تکوینی مراحل طے کرتی۔

فضا میں معلق سمندر:

''کورسی مارین کہتے ہیں: زمین یا اس کے منتشر ٹکڑے آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونا شروع ہو گئے۔ عناصر کا باہمی میل جول شروع ہو گیا اور زمین کا وہ مرکزی نقطہ جسے ہم آج پہنچانتے ہیں معرضِ وجود میں آ گیا۔ آکسیجن اور ہائیڈروجن آپس میں محفوظ نہیں ہو سکتی تھیں، یہاں تک کہ زمین کا درجہ حرارت چار ہزار ڈگری آکسیجن اور ہائیڈروجن آپس میں مخلوط نہیں ہو سکتی تھیں۔ یہاں تک کہ زمین کا درجہ حرارت چار ہزار ڈگری فارن ہائٹ تک پہنچ گیا۔ تو پھر یہ دونوں عناصر بڑی سُرعت کے

---

[1] چہ می دانم؟ زمین و سرگزشت آن ص ۵۲

ساتھ ایک دوسرے سے آ ملے اور ان دونوں گیسوں کے ملاپ سے پانی کا وجود عمل میں آیا۔ جو آج ہمیں تحقیق سے معلوم ہے وہ یہ کہ زمین کے اس تکوینی دورانیہ میں زمین کا فضائی ماحول حد سے زیادہ سنگین اور دبیز ہوگا۔ تمام سمندر آسمان میں ہوں گے اور وہ تمام عناصر جو آج ایک دوسرے سے مرکب ہیں فضا میں پھیلے ہوئے ہوں گے جو پانی زمین کی بیرونی فضا میں موجود ہوگا زمین کی سمت روانہ ہو گیا ہوگا۔ لیکن چونکہ زمین کا ماحول زمین کے بیرونی ماحول سے نہایت ہی گرم اور جلا دینے والا تھا لہٰذا اُسے زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی بخارات کی شکل اختیار کرنی پڑی ہوگی اور سطح زمین تک کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی ہوگی، جُوں جُوں زمین کی فضا ٹھنڈی ہوتی گئی ہوگی وہ سمندر جو فضا میں معلق تھے زمین کی طرف آنا شروع ہو گئے ہوں گے۔ اس وقت اس قدر مہیب سیلاب زمین پر آئے ہوں گے جو ہمارے تصوّر اور تخمین سے خارج ہیں۔ کئی لاکھ سال تک سطح زمین پر فضائی اور عظیم طوفانوں کے تباہ کن انقلابات رونما ہوتے رہے ہوں گے۔''[1]

تمام کائنات حادث ہے:

مذکورہ گفتگو سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ حاصل ہوا کہ صدہا سال قبل انبیاء کرام علیہم السلام بڑے اعتماد کے ساتھ لوگوں کو بتا چکے ہیں کہ تمام کائنات اور اجرام سماوی عارضی اور حادث ہیں نہ پہلے سے تھے اور نہ ہمیشہ رہیں گے۔ جس دوران میں انبیاء عظام، عالم کے حادث ہونے کی بات کر رہے تھے اسی دور میں کچھ متقدمین اور متاخرین فلاسفہ نے کائنات کے ذاتی اور صفاتی لحاظ سے قدیم ہونے کا نظریہ پیش کیا اور صدیوں تک اس بے بنیاد وہم وگمان کو علم اور یقین سمجھتے رہے، اس پر بحث ومباحثہ کیے، اس بارے میں کئی کتابیں تحریر کیں اور طالب علموں کو تعلیمی اداروں میں اس کی تعلیم دیتے رہے۔

منظومہ شمسی کی عمر کا خاتمہ:

موجودہ دور میں علمی پیش رفت اور تحقیقی وسائل کے نتیجہ میں یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ عالم حادث ہے اور ہمارا منظومہ شمسی جو بیکراں کائنات کا ایک معمولی سا حصّہ ہے نہ تو ازلی ہے اور نہ ہی ابدی، اس کا نقطہ آغاز بھی ہے اور حد اختتام بھی، ایک دن آئے گا کہ اس عظیم نظام کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا، منظومہ شمسی کی عمر ختم ہو جائے گی۔ آفتاب عالم تاب تیرہ وتاریک ہو جائے گا اور اس دنیا میں ہم رہ رہے ہیں ایک دن اپنے انجام کو جا پہنچے گی۔ غرضیکہ ماضی میں انبیاء کرام نے وحی کے ذریعہ جو کچھ حاصل کیا تھا اور دین کے نام سے لوگوں کو جس سے مطلع کیا تھا آج وہ بات سائنسدانوں اور دانشوروں کے لیے سائنسی اور تجرباتی طور پر مسلّم ہو چکی ہے اور تعلیمی اداروں میں اس کو علم کے نام سے پڑھایا اور طلباء کو درس دیا جاتا ہے۔

---

[1] راز آفرینش انسان ص ۲۱

آفتاب تاریک ہوجائے گا اور لپیٹ دیا جائے گا۔

اس فصل میں قرآن شریف کی ان چند آیات کا ذکر کیا جائے گا جو کائنات کے خاتمہ کے بارے میں مذکور ہوئی ہیں اور چونکہ ان آیات کے مطالب طبعی تبدیلیوں اور آفاقی روئداد سے متعلق ہیں، لہٰذا ان مطالب کی وضاحت اور تشریح و تفصیل کے لیے دانشوروں کی علمی تحقیقات اور آفاقی سکالروں کی گہری ریسرچ سے بھی استفادہ کیا جائے گا تا کہ قارئین محترم قرآنی آیات کو فکر و تدبر کے زاویہ سے دیکھیں اور اس آسمانی کتاب کی زیادہ سے زیادہ عظمت کی طرف توجہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے۔

"اذالشمس کورت"، جب سُورج تاریک ہوجائے گ اور لپیٹ دیا جائے گا۔[1]'

کتاب "لسان العرب" میں ہے۔

کورت الشمس جمع ضوء ھاولف کماتلف العمامة"

"سورج کی تکویر کا مقصد اور معنی یہ ہے کہ اس جرم کی روشنی اور فروغ سمیٹ لیے جائیں گے اور وہ عمامہ کی مانند لپیٹ دیا جائے گا۔[2]

جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ تکویر کے معنی میں دو مطالب پائے جاتے ہیں ایک یہ کہ آفتاب کی روشنی اور چمک دمک گھٹتے گھٹتے تاریکی میں تبدیل ہوجائے گی اور دوسرے یہ عظیم جرم اسی طرح لپیٹ دیا جائے گا جس طرح عمامے کے ہر پیچ کی بیرونی سطح دوسرے پیچ کے اندر لپٹ جاتی ہے مندرجہ ذیل تفصیل جو ماہر دانشوروں کے ذریعہ سُورج کی سرنوشت کے بارے میں بیان ہوئی ہے مذکورہ دونوں مطالب کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

"شمسی توانائی کی مقدار جو روزانہ زمین کی طرف نازل ہوتی ہے۔ ۶۹۰،۰۰۰، ۴ ہارس پاور فی مربع میل توانائی کے برابر ہے اور سال بھر میں زمین پر نازل ہونے والی توانائی ان توانائیوں سے کئی لاکھ گناہ زیادہ ہے جو کوئلہ اور دوسرے جلائے جانے والے مواد سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن زمین اس عظیم شمسی توانائی کا صرف ایک مختصر حصہ اپنے پاس رکھ لیتی ہے اور اس کا بہت بڑا حصّہ آزادانہ طور پر سیاروں کے درمیان کی فضا میں چلا جاتا ہے۔"[3]

---

[1] سورہ ۸۱ آیت ۲

[2] لسان العرب (مادہ کرو)

[3] پیدائش و مرگ خورشید ص ۱۷

سُورج کی توانائی کہاں سے آ رہی ہے:

اس عظیم توانائی کا سرچشمہ کیا چیز ہے؟ کون سا ایسا مادہ ہے جو اسے مسلسل بحال رکھے ہوئے ہے اور اربوں کھربوں سال گزر جانے کے باوجود بھی سُورج حسبِ معمول روشن ہے اور نور پاشی کر رہا ہے؟ دانشوروں نے کسی حد تک سورج کے راز کو پالیا ہے اور نسبتاً اس سے آ گاہی حاصل کر لی ہے، لہٰذا وہ مذکورہ سوالوں کا ان لفظوں میں جواب دیتے ہیں۔

''اگر کوئی سُورج، کوئلوں سے بنایا جائے تو وہ پانچ چھ صدیوں تک جل کر فنا ہو جائے گا، لیکن جو سُورج اپنی توانائی زیرایٹمی SUBATOMIC سرچشمہ سے حاصل کرتا ہو وہ کئی کھرب سال تک باقی رہ کر نور افشانی کر سکتا ہے۔''[۱]

''اب ہم ان قدیم ترین نظریات کو قبول کر سکتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ شمسی توانائی ایک قسم کے جلنے سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن وہ جلنا جوہری انداز میں ہوتا ہے جس کا ایندھن ہائیڈروجن ہوتی ہے اور خاکستر ہیلیم۔''[۲]

زیرایٹمی توانائی:

آفاق شناسوں کے نظریہ کے مطابق شمسی توانائی کا اہم منبع ہائیڈروجن گیس ہے جو سُورج کی سطح پر موجود ہے۔ یہ عنصر دائمی طور پر جلتا رہتا ہے جس سے توانائی پیدا ہوتی ہے۔ اس ایندھن کے جلنے سے ہیلیم حاصل ہوتی ہے جو سُورج کے اندر منتقل ہو جاتی ہے اور اسی میں جا کر ٹھہر جاتی ہے۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک ہائیڈروجن گیس ختم نہ ہو جائے اور ہائیڈروجن کے خاتمہ ہی سے زیرایٹمی، انرجی کا منبع بھی ختم ہو جائے گا۔

ہائیڈروجن سے ہیلیم پیدا ہوتی ہے:

''جو ہیلیم، ہائیڈروجن گیس کے جلنے کی وجہ سے سُورج کے اندر تشکیل پاتی ہے۔ اس ہائیڈروجن گیس سے جو آغاز کار میں ہوتی ہے بہت کم شفاف ہوتی ہے، جس قدر ہائیڈروجن، ہیلیم میں تبدیل ہوتی جائے گی سُورج کا مرکزی حصّہ بھی اسی قدر تاریک ہوتا جائے گا۔ آخر کار نتیجہ یہ نکلے گا کہ سُورج کے مرکزی حصّہ میں حد سے زیادہ توانائی اکٹھی ہو جائے گی۔''[۳]

ان مذکورہ اقتباسات سے دو باتیں خاص طور پر واضح ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ سُورج کے داخلی اور اندرونی حصوں میں ہیلیم کا جتنا اضافہ ہوتا جائے گا اسی حساب سے اس کی تاریکی میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ

---

[۱] پیدائش ومرگ خورشد ص ۱۱۴

[۲] چہ می دانم؟ زندگی ومرگ ستارگان ص ۹۵

[۳] پیدائش ومرگ خورشید ص ۱۳۱

سُورج کی سطح میں موجود ہائیڈروجن گیس ہمیشہ استعمال ہوتی رہتی ہے اور اسے جوتوانائی حاصل ہوتی ہے وہ ہمیشہ فضائے بیکراں میں پھیلتی اور منتشر ہوتی رہتی ہے۔ ہائیڈروجن سے ہیلیم پیدا ہوتی ہے وہ سُورج کے اندرونی حصّوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اسی بنا پر آفتاب عالم تاب لپٹا رہتا ہے اور ہمیشہ اس کا بیرونی مواد اس کے اندرون میں داخل ہوتا رہتا ہے اور وہیں پر ہی وہ جمارہتا ہے۔

تکویر یا سُورج کا لپٹ جانا:

لغت عرب میں سب سے بہتر اور واضح کلمہ جو اس حقیقت کو کما حقہ بیان کر سکتا ہے وہ ہے ''تکویر'' اور خداوند عالم نے کائنات کے خاتمہ پر سُورج کی اس تبدیلی کو بیان کرنے کے لیے اسی کلمہ کو استعمال فرمایا ہے۔

''اذالشمس کورت۔'' (جب سورج بےنور ہو کر لپیٹ دیا جائے گا)

اور ستاروں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

''واذالنجوم انکدرت'' (جب ستارے تاریک ہوجائیں گے [۱])

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

''واذاالکواکبُ اُنتثرت'' (جب ستارے ٹوٹ کر گرنے لگیں گے [۲])

ستاروں کا بڑھاپا:

ستارے بھی آفتاب کی مانند نہ تو ازلی ہیں اور نہ ہی ابدی، ان کا نقطہ آغاز بھی ہے اور حد اختتام بھی۔ وہ بھی خورشید کی مانند اپنی ہائیڈروجن کو خرچ میں لاتے اور توانائی پیدا کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ بوڑھے ہو کر تاریک ہوجائیں گے، ان کی چمک دھمک گھٹتی جائے گی، ان کا حجم چھوٹا ہوتا جائے گا اور انجام کار ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ کر گر پڑیں گے۔

''ستارہ جب اپنے ہائیڈروجنی ذخیرے کی انتہا کو پہنچ جائے گا اور اپنے تمام ایندھن کو ختم کر ڈالے گا تو وہ سکڑتا جائے گا اور چھوٹے سے چھوٹا جرم بن جائے گا، پھر وہ جس قدر چھوٹا ہوتا جائے گا اسی قدر اس کی گردش میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اسی قدر اس کی گردش میں اضافہ ہوتا جائے گا آخر کار ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ جائے گا اور ایک چمک دار بُلبلے کی مانند فضا میں منتشر ہوجائے گا۔ ستاروں کے پھٹنے میں ایک منٹ سے زیادہ دیر نہیں لگے گی، لیکن اس قلیل عرصے میں ہر ستارے

---

[۱] سُورہ ۸۱ آیت ۲

[۲] سُورہ ۸۲ آیت ۲

کا ۱۰/۹ حصّہ فضا میں منتشر ہو جائے گا۔"[۱]

پہاڑوں اور سمندروں کا خاتمہ:

قرآن مجید میں ہے۔

"واذا الجبال سیرت"

جب پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر چلائے جائیں گ[۲] ے

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

"وتکون الجبال کالعھن المنفوش"

جب پہاڑ دھنی ہوئی روئی کی طرح نرم ہو جایں گے [۳]۔

"واذا البحار سجرت"

جب سمندر آگ کی طرح شعلہ ور ہو جائیں گے [۴]۔

ایک اور مقام پر ہے۔

"واذا البحار فجرت"

جب دریا شگافتہ ہو کر ایک دوسرے سے مل جائیں گ[۵] ے

سُورج کی حرارت اور تپش میں اضافہ:

جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے کہ سُورج میں جس قدر ہائیڈروجن گیس کا مصرف زیادہ ہوتا جائے گا اسی قدر اس کے مرکزی حصّہ میں ہیلیم کا اضافہ ہوتا جائے گا جس کے نتیجہ میں سُورج کی حرارت اور تپش میں اضافہ ہوتا جائے گا اور زمین پر اس کی چمک دمک اور تپش حد سے بڑھ جائے گی۔

---

[۱] گزشتہ وآئندہ جہان ص ۱۷۴

[۲] سورہ ۸۱ آیت ۳

[۳] سُورہ ۱۰۱ آیت ۱۰۵

[۴] سُورہ ۸۱ آیت ٦

[۵] سُورہ ۸۲ آیت ۳

''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سُورج کی شعاعوں اور تپش میں اضافہ ہوتا جائے گا اور جب سورج کی ہائیڈروجن گیس ختم ہوجانے کے نزدیک ہوجائے گی تو اس کی شعاعوں کی انرجی بھی سوگنا ہوجائے گی۔ یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ سُورج میں توانائی کی پیدائش کے مسئلہ کے بارے میں جو تحقیقات ہوئی ہے ہمیں ایسے نتیجہ تک پہنچاتی ہیں جو کلاسک نظریہ کے بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ کلاسک نظریہ تو یہ کہتا ہے کہ جب سُورج کی سرگرمیاں اور اس کے فعل وانفعال کم ہوجائیں گے تو ایک دن ایسا آجائے گا کہ ہر چیز ٹھنڈی اور یخ بستہ ہوجائے گی، لیکن یہ تحقیقات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ سُورج کی حرارت اور شعاعوں میں اس قدر اضافہ ہوجائے گا کہ اس کے آخری مرحلہ پر شدت حرارت کی وجہ سے ہر چیز فنا ہوجائے گی۔''

''اس طرح سے زمین کا درجہ حرار تپانی کھولنے کے درجہ حرارت سے کئی گنا بڑھ جائے گا اگرچہ قوی امکان یہ ہے کہ اس درجہ حرارت میں پتھر اور دوسری ٹھوس چیزیں پگھل کر پانی تو نہیں ہوجائیں گی، البتہ یہ بات یقینی ہے کہ دریاؤں اور سمندروں کا پانی ضرور کھولنے لگے گا۔ اور چونکہ کوئی زندہ مخلوق اس حد تک درجہ حرارت میں زندگی بسر نہیں کرسکتی۔ بنابریں زمین کا درجہ حرارت جتنا بڑھتا جائے گا زندہ موجودات اتنا ہی تنزل اور پستی کا شکار ہوتی جائیں گی۔ پس قوی امکان یہی ہے کہ درجہ حرارت کے ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ جانے سے پہلے ہی جانوروں کی تمام قسمیں نیست ونابود ہوجائیں گی۔''[۱]

ماضی کے برعکس نظریہ:

سُورج کی توانائی کے بارے میں ماضی کا سیکل رسی نظریہ تو یہ تھا کہ جُوں جُوں سُورج کی حرارت گھٹتی جائے گی زمین پر موجود اشیا برف بنتی جائیں گی اور سخت سردی کی وجہ سے زمین پر زندگی بسر کرنا محال ہوجائے گا، لیکن آج کا نظریہ ماضی کے مفروضہ کے بالکل برعکس ہے، کیونکہ موجودہ دور کا نظریہ یہ کہتا ہے کہ سُورج کی ہائیڈروجن گیس ختم ہوجانے کے بعد اس کی حرارت سوگنا بڑھ جائے گی اور اسی حرارت اور سخت تپش کے باعث زمین پر کوئی موجود زندہ باقی نہیں رہے گا۔

قرآن مجید جو آج سے چودہ سوسال سے بھی زیادہ عرصہ پہلے رُسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے وہ بھی کائنات کے خاتمہ کے سلسلے میں سورج کی حرارت کی کمی اور زمین پر موجود اشیاء کے ٹھنڈا ہوکر جم جانے کے متعلق بات نہیں کرتا بلکہ جلادینے والی گرمی کی خبر دے رہا ہے جسے آج کے اسکالرز علم ویقین کا نام دیتے ہیں۔ البتہ قرآن اور ان کے علم میں فرق ضرور ہے۔ کیونکہ قرآن شریف سُورج کی گرمی کی ان کے نظریہ کے مطابق گرمی سے کہیں زیادہ کی خبر دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سُورج کا درجہ حرارت اس حد تک بڑھ جائے گا کہ سمندروں اور دریاؤں کا پانی کھولنے لگا، لیکن قرآن مجید اس سے بڑھ کر درجہ حرارت کی خبر دیتا ہے اور فرماتا ہے ''سمندروں میں آگ لگ جائے گی'' وہ کہتے ہیں کہ'' پتھر اور دوسری ٹھوس چیزیں قوی

[۱] پیدائش ومرگ خورشید ص ۱۳۱

امکان کے پیش نظر نہیں پگھلیں گی۔'' لیکن قرآن کہتا ہے کہ پہاڑ دھنی ہوئی رُوئی کی مانند اڑتے پھریں گے۔''

ایسے نظریات کو بیان کرنے کا مقصد:

یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس فصل اور دوسری فصلوں میں موجود دور کے دانشوروں کے علمی نظریات کو پیش کرنے کا مقصد صرف اور صرف قارئین گرام کے اذہان کو ان مطالب کے نزدیک کرنا ہے جن کے بارے میں قرآن پاک نے خبر دی ہے، نہ یہ کہ اُن کے نظریات کی تائید قرآن سے کرانا مقصود ہے۔ کیونکہ جب تک کوئی نظریہ قطعی دلائل سے ثابت نہ ہوجائے اس وقت تک مفروضہ اور خیال سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہوتا، اسی لیے نظریات ہمیشہ بولتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ سُورج کی آواخر عمر کے موقعہ پر زمین کی حرارت کے بارے میں کل کوئی اور نظریہ پیش کر دیا جائے اور آج کا نظریہ بھی تمام موجودات ارضی کے یخ بستہ ہوجانے کے نظریہ کی مانند ٹھکرا دیا جائے۔

سُورج کے خاتمہ کی کیفیت اور قرآن:

اور پھر یہ کہ قرآن مجید میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ تکویر آفتاب، ستاروں کا گرنا، دریاؤں میں آگ لگ جانا اور پہاڑوں کا ریزہ ریزہ ہونا۔ لیکن ان رودادوں کی وجوہات اور زمینی فضاؤں کی حرارت کا منبع، کتابِ خدا میں بیان نہیں ہوا اور کائنات کے خاتمہ اور منظومہ شمسی کی تباہی کے بارے میں صراحت کے ساتھ قرآن نے کچھ نہیں بتایا، اسی لیے ثابت نہ ہونے والے اور غیر قطعی علمی مفروضے قرآن مجید کی واقعی آیات کے مطالب کی تفسیر اور توجیہ نہیں کر سکتے۔

کائنات یکدم تباہ ہوجائے گی:

اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر خدا کی قطعی قضا یہ ہوئی کہ سورج کا خاتمہ طبعی ہو، وہ اپنے راستوں کو صحیح سالم انداز میں طے کرے۔ اپنی عمر کے نصف راستے میں کسی حادثے سے دوچار نہ ہو اور اس کے دھماکے سے پھٹ جانے کے اسباب بھی فراہم نہ ہوں۔ تو ممکن تھا کہ سُورج کی کامل تکویر جو اس کی انتہائی لپیٹ اور تاریکی کے معنی میں ہے آفاق شناسوں کے نظریہ کے مطابق اس آفاقی جرم کی عمر کے آخر میں عملی جامہ پہنے، لیکن جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے اور اگلی فصل میں بھی تفصیل سے بیان ہوگا کہ سُورج کا خاتمہ اور ستاروں کا تباہ ہوجانا غرضیکہ کائنات کا خاتمہ خدا کی تقدیر کے مطابق اچانک، ناگہانی اور یکبارگی ہوگا۔ اور کائنات کا تخلیقی ڈھانچہ ایسے حادثات کی وجہ سے یک دم دھڑام سے گر پڑے گا جو ہم سے مخفی ہیں۔ سُورج مختصر مدت میں اپنی انتہائی تکویر کو پہنچ جائے گا، ستارے یک دم تاریک ہوجائیں گے۔ تمام ارضی وسماوی مخلوق ایک ہی مرتبہ مرجائیں گی اور تکوینی نظام کا ایک ہی لحظے میں خاتمہ ہوجائے گا، لہٰذا سُورج اور ستاروں کی طبعی موت

کے بارے میں کسی بحث کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

آسمانی اجسام کے بارے میں ایک نظریہ:

ماضی میں کائنات کے اجرام کے بارے میں کچھ فلاسفہ کا نظریہ تھا کہ وہ ذاتی اور صفاتی لحاظ سے قدیم ہیں لیکن اس نظریہ کو یکسر مسترد کیا جاچکا ہے، البتہ اس باطل اور مسترد شدہ مفروضہ کے ساتھ ساتھ اجرام فلکی کے بارے میں وہ بھی ایک نظریہ رکھتے تھے جسے علمی اور تجرباتی طور پر غلط ثابت کیا جاچکا ہے۔خواجہ نصیرالدین طوسیؒ کہتے ہیں۔

"اما الاجسام الفلکیة فقد زعمت الفلاسفة انها لا ثقیلة ولا خفیفة ولا حارة ولا باردة ولا رطبة ولا یابسة ولا یصح الخرق والالتیام والکون والفساد علیها۔"

''کچھ فلاسفہ ماضی میں یہ گمان کرتے تھے کہ فلکی اجسام نہ تو بوجھل ہیں اور نہ ہی ہلکے، نہ گرم ہیں نہ سرد، نہ مرطوب ہیں نہ خشک نہ ان میں شگاف پڑسکتا ہے۔اور نہ ہی مل سکتے ہیں۔ان میں نہ تو کون ہوتا ہے نہ فساد''[1]

دورِحاضر کے دانشوروں کی نسبۃً آگاہی:

ماضی میں فلاسفہ کے اس غلط اور بے بنیاد نظریہ کا اظہار علوم کی نارسائی، علمی سطح کی پستی، علمی وسائل کے فقدان اور طاقتور ٹیلیسکوپوں کے نہ ہونے کی وجہ سے تھا۔لیکن دورِحاضر کے اسکالرز علم کی وسعت، انسانی معلومات کی سطح کے بلند ہونے اور صنعتی وسائل کی فراوانی کی بناپر اس قابل ہوگئے ہیں کہ خلقت عالم کے بہت سے اسرار ورموز سے پردہ اٹھائیں، آفرینش کے بہت سے رازوں سے مطلع ہوں، کسی حد تک آفاق کے اسرار سے آگاہ ہوں۔اور نتیجۃً ماضی کے فلاسفہ کے غلط نظریات کے بارے میں تحقیقات کرکے حقائق کو پیش کریں، لیکن ان دانشوروں کا نسبۃً آگاہی اور معرفت کا یہ معنی نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ اور ہر جگہ ہی حق پر ہیں اور کائنات اور کائنات کے اندر موجود اشیاء کے بارے میں بھی غلط اور بے بنیاد نظریات پیش نہیں کرسکتے بلکہ اس کے برعکس چونکہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بہت سے قابل مطالعہ موضوعات کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔اور ہر سال مختلف علوم کے مسائل کے بارے میں ریسرچ ہوتی رہتی ہے جن کے نتیجہ میں مختلف نظریات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ممکن ہے سینکڑوں نظریات میں سے بہت کم نظریات ایسے ہوں جو واقعات سے مطابقت رکھتے ہوں اور علم ودانش

---

[1] تلخیص المحصل ص ۲۲۵

اُنہیں قبول کریں اور باقی کو مسترد کردیں یا سالہا سال بلکہ صدیوں تک اُن کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ ہوسکے۔ نہ تو علمی طور پر اُنہیں قطعی طور پر قبول کیا جاسکے اور نہ ہی ریسرچ اسکالرز انہیں دوٹوک انداز میں مسترد کرسکیں۔

مثلاً سورج اور اس سے وابستہ چاند اور دوسرے سیاروں کی تخلیقی کیفیت کے بارے میں صاحبِ نظر افراد نے متعدد نظریے پیش کیے ہیں اور پھر ان میں سے ہر ایک کے بارے میں بڑی حد تک لے دے ہوئی ہے ان پر تنقید بھی ہوئی ہے اور ان کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، مگر تا حال ان میں سے کوئی نظریہ بھی پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچ سکا اور نہ ہی علمی محفلوں میں اُسے قطعی طور پر قبول کیا گیا۔ مسٹر دردسو نے اپنی کتاب میں ان میں سے بعض نظریات کو خلاصہ کے طور پر اور ان نظریات پر کی گئی تنقید کو درج کیا ہے۔

سورج اور لاپلاس کا نظریہ:

''لاپلاس نے یہ تصور پیش کیا ہے کہ یہ سورج پہلے پہل گیس کا ایک مجموعہ اور موجودہ جسامت سے کئی گنا بڑا تھا۔ اس کا مخصوص حجم بہت کم اور حرارت بہت زیادہ تھی اور اپنے گرد گھومتا رہتا تھا، پھر اُس نے آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونا شروع کیا اور ہر ٹھنڈی چیز کی مانند سکڑتا چلا گیا، وہ جس قدر سکڑتا گیا، اسی قدر اس کی رفتار میں تیزی آتی گئی۔ ایک وقت یہ رفتار اس قدر تیز ہوگئی کہ اس سے ایک حلقہ جدا ہوکر علیحدہ ہوگیا۔ آسمانی مواد کا خُوبصورت حلقہ جو فوراً ہی اپنے جنم دینے والے ستارے کے گرد گھومنے لگا اور پھر آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگا اور حلقے سے جُدا ہونے والے ٹکڑے آپس میں مل گئے اور منظومہ شمسی کے سیاروں کا ایک ستارہ تشکیل دے دیا۔

لاپلاس کے دلائل:

''لاپلاس پھر کہتے ہیں کہ اگر اس عمل کا منظومہ شمسی کے تمام سیاروں کی تعداد میں تکرار کریں تو اس منظومہ کے ڈھانچے کا راز کُھل جائے گا۔ اور اگر اس کام کو تمام سیاروں کے بارے میں بجالایا جائے تو تمام اقمار (چاندوں) کی تشکیل کیفیت واضح ہوجائے گی۔ اگر آپ کو اس موضوع میں کچھ شک ہے تو پھر ایک نگاہ سیارہ زحل کی طرف دوڑایئے جس سے آپ کو پتہ چل جائے گا کہ وہ ایک حلقہ دار سیارہ سے جُدا ہوکر علیحدہ ہوچکا ہے۔ اور یہ حلقہ آنے والے کسی ایک قمر (چاند) کو جنم دے گا۔ یہ تھا لاپلاس کا استدلال۔''

''لیکن میرے خیال میں زحل کا نظارہ اس نظریے کے صحیح ہونے کی تائید نہیں کرتا، کیونکہ آج ہمیں معلوم ہوچکا ہے کہ زحل کا حلقہ، آنے والے کسی چاند کو جنم نہیں دے گا، بلکہ یہ خود ایک فنا ہوجانے والے قمر کا باقیماندہ حصہ ہے۔ اور کرہ ماہ

بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے کے بعد ایسے ہی انجام سے دوچار ہوگا۔اور پھر یہ بات بھی ہے کہ اگر اصلی سُورج مغرب سے مشرق کی طرف چلتا رہتا تو اس کے حلقوں سے وجود میں آنے والے دوسرے سیارے بھی اسی سمت اپنا سفر جاری رکھتے جبکہ یورنیس URANUS اور نیپچوں NEPTUNE اور ان کے قمروں کی حرکت اس جہت کے خلاف ہے اور لاپلاس کا مفروضہ اس قطعی دلیل کا جواب نہیں دے سکتا اور باطل ہوجاتا ہے۔ اگرچہ گذشتہ صدی کے اوخر میں فائی FAYE اور لیگونڈز نے اس مفروضہ کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔لیکن ان کی سعی بھی بارآور ثابت نہیں ہوئی، کیونکہ ان ایام میں لاپلاس کے مفروضہ کو تاریخی حیثیت کے سوا اور کوئی وقعت حاصل نہیں ہے۔''

دوستارہ شناسوں کے سوال وجواب:

''۱۹۰۰ء کی حدود میں چمبرلین اور مولٹن نامی دوستارہ شناسوں ASTROLOGERS نے بڑی جرات کے ساتھ ایک نظریہ پیش کیا کہ: اگر کوئی ستارہ ہمارے سُورج کے نزدیک سے عبور کرے اور اور اس سے ٹکرائے بغیر گزر جائے تو کیا حادثہ رونما ہوگا؟ جس طرح کرہ ماہ مدوجزر کے ذریعہ سمندروں کے پانی کو اپنی طرح کھینچتا ہے،اسی طرح گزرنے والے اس ستارے کی کشش بھی مادہ خورشد میں عظیم ''مدّ'' پیدا کردے گی، اور اگر گزرنے والا ستارہ بہت عظیم اور وزنی ہو تو یہ ''مدّ'' ایک بہت بڑے پہاڑ کی صُورت اختیار کرلے گی اور آخر کار سُورج سے جدا ہوجائے گی۔''

برطانوی ستارہ شناس کا نظریہ:

''آخر کار مشہور برطانوی ستارہ جنیز نے اس نظریے کو دوبارہ پیش کیا اور حساب وکتاب کے ذریعہ اُسے حتمی صُورت دی اور کہا قدم زمانے یعنی اربوں سال پہلے ہمارے سُورج کے قریب سے ایک ستارہ گزرا جس نے سُورج میں زبردست مہیب ''مدّ'' پیدا کردیا اور سُورج سے جُدا ہونے والے مادہ نے ایک لمبے سیگار CIGAR کی صورت اختیار کرلی، پھر یہ مادہ تقسیم ہوگیا، سیگار کے ضخیم حصّوں سے بڑے اور باریک حصّوں سے چھوٹے سیارے اس وقت معرضِ وجود میں آئے، لیکن امریکی ستارہ شناس روسل RUSELL نے جنیز پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ: اس مد سے سیارے اس وقت معرضِ وجود میں آئیں گے جب گزرنے والا کوئی ستارہ سُورج کے بہت ہی نزدک سے گزرے حتّٰی کہ عطارد کے فاصلہ سے بھی زیادہ نزدیک تو پھر آپ پلوٹو کے بارے میں کیا کہیں گے جس کا سُورج سے فاصلہ، عطارد کے سُورج سے فاصلہ کا سوگنا ہے؟''

''انگریز ستارہ شناس لٹیلٹن LETELTON نے ۱۹۳۶ء میں اس نظریے کا اظہار کیا کہ ہمارا سُورج دراصل ایک دوہرا DOUBLE ستارا تھا یعنی دوستاروں سے مل کر بنا تھا، جن میں سے ہر ایک دوسرے کے گرد گھومتا تھا جب

گزرنے والا ستارہ پہنچ گیا تو ہمارے سورج کے نزدیک نہ ہوا اُس کے دوسرے ساتھی کے نزدیک ہوگیا اور مذکورہ سیگار کی مانند کا حصّہ اُس سے جُدا کر کے مختلف ٹکڑوں میں بانٹ دیا لیکن گزرنے والا ستارہ وہیں پر رک نہیں گیا بلکہ حسبِ دستور چلتا رہا اور سیگار جیسے حصّے کے کچھ ٹکڑوں کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا، البتہ ان میں سے جو کچھ باقی بچ گیا وہ ہمارے سُورج کے نزدیک ہوگیا اس سے کئی سیارے جُدا ہوکر اس کے گرد گھومنے لگے۔''

پیرروسو کی گفتگو:

''پیرروسو کہتے ہیں، آج دُنیا میں بہت کم ہی کوئی ستارہ شناس موجود ہو جس نے منظومہ شمسی کی تکوین کے لیے اپنی ذاتی اور تازہ تھیوری نہ گھڑلی ہو۔

مسٹر امیل بلو کے نظریہ کے مطابق یہ منظومہ شمسی دراصل ایک عظیم ستارے کی گیس کے بہت بڑے تودے سے ٹکڑا جانے کی وجہ سے پیدا ہوا جس کی رفتار ۷۵ ہزار کلومیٹر فی سیکنڈ کے حساب سے تھی اس ٹکر کے نتیجہ میں، اس ستارے سے کئی حلقے جُدا ہوئے جو بعد میں سُکڑ کر سیاروں کو معرضِ وجود میں لے آئے، لیکن ان مفروضوں میں سے کسی ایک کے لیے بھی وزنی دلیل نہیں پائی جاتی جو ہماری تسلی کرائے کہ ہم ان میں کسی کو دوسرے پر ترجیح دیں۔ بنابریں میرے نزدیک یہ موضوع بھی ان موضوعات میں سے ہے جن کے بارے میں دانشور حضرات ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے رہیں گے اور کبھی بھی آپس میں متفق نہیں ہوسکیں گے۔''[1]

خالق ہی اپنی مخلوق سے اچھی طرح آگاہ ہے:

انبیاء کے آسمانی مکتب کے مطابق عالمِ وجود کی تمام چیزیں مخلوق اور حادث ہیں اور یہ سب خدا کی حکیمانہ مشیت کے پیشِ نظر ہستی کی صُورت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ وہ خدا ہی ان کی حقیقتوں کو جانتا ہے اور اپنی مخلوق کی تمام جہات اور خصوصیات سے واقف و آگاہ ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کیا پیدا کیا ہے، کتنا پیدا کیا ہے اور کیونکر پیدا کیا ہے؟ جیسا کہ محمد بن مُسلم کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سُنا ہے۔

کان اللہ ولا شی غیرہ ولم یزل اللہ عالما بما کون فعلمہ بہ قبل کونہ کعلمہ بہ بعد ما کونہ''

''خدا تھا اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے جو کچھ پیدا کیا ہے اُسے اچھی طرح جانتا ہے اور خدا

---

[1] چہ می دانم، نجومی تلسکوپ ص ۸۲

کا علم موجوداتِ عالم کی ایجاد سے پہلے بھی اسی طرح تھا جس طرح اُن کی تخلیق کے بعد ہے۔"[۱]

کائنات اور منظومہ شمسی کے بارے میں ماضی اور حال کے دانشوروں کے نظریات، مفروضے اور گمان کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا، جن میں سے کچھ تو غلط ثابت ہو کر مسترد کیے جا چکے ہیں اور کچھ کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکا، نہ تو ان کے صحیح پر کوئی یقینی دلیل قائم ہو سکی ہے اور نہ ہی کسی دلیل قاطع کے ذریعہ اُنہیں مسترد کیا گیا ہے۔ اور ممکن ہے کہ بے یقینی کی یہ کیفیت صدیوں تک باقی رہے۔

تخلیقی کیفیت سے انسان بالکل بے خبر ہے:

ان مختلف مفروضوں اور گوناگوں احتمالات کا اصل سبب انسان کی تخلیقی کیفیت سے لاعلمی اور ناواقفیت ہے، کیونکہ خداوند دانا و توانا نے اکیلے خود ہی عالم ہستی کو خلق فرمایا ہے اور ان کے تکوینی قواعد و ضوابط اور قوانین بھی اُس نے خود ہی بنائے ہیں۔ اور اکیلا خود ہی اپنی مخلوق کی کمیّت و کیفیت سے آگاہ ہے۔ اُس نے تخلیق کائنات کے بارے میں نہ تو کسی سے مشورہ کیا، نہ کسی سے مدد طلب کی اور نہ ہی کسی کو اپنے تخلیقی نقشے سے آگاہ کیا، چنانچہ وہ خود ہی قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے کہ کوئی مخلوق تخلیقی امور سے آگاہ نہیں ہے اور نہ ہی ہم نے کسی کو تخلیقِ عالم میں حاضر و ناظر بنایا ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝۵۰ مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۠

"ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، سب فرشتوں نے اطاعت کی سوائے ابلیس کے جو جن تھا اور نافرمانی کی۔ آیا تم اے اولادِ آدم خدا کے امر سے سرپیچی کر کے شیطان اور اس کی ذریت کے احکام مانو گے؟ جبکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔ یہ غلط عمل ظالموں کے لیے بہت بُرا اور نقصان وہ تبادلہ ہے۔ ہم نے اُنہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور اسی طرح اُن کی اپنی تخلیق میں حاضر نہیں رکھا اور نہ ہی یہ سب کچھ انہیں دکھایا ہے۔"[۲]

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آیت میں "ھم" کی ضمیر ابلیس اور اس کی ذریت کی طرف لوٹ رہی ہے اور بعض

---

[۱] السماء والعالم ص ۱۹

[۲] سورہ نمبر ۱۸ آیت ۵۰، ۵۱

کہتے ہیں کہ ''ھم'' کا مرجع ظالمین ہیں جو آیت کے آخر میں مذکور ہیں، صورتِ حال خواہ کچھ بھی ہو۔ نہ تو ابلیسیوں کو تخلیق کائنات کے نقشہ کا علم ہے اور نہ ہی انسانوں کو۔ خداوند عالم نے ان میں سے کسی ایک کو بھی تخلیق کائنات کی صورتِ حال نہیں دکھائی اور نہ اس کی تخلیقی کیفیت سے آگاہ کیا ہے تخلیقِ عالم کے بارے میں یہ لوگ جو کچھ بھی کہتے ہیں سب تخمین اور خیالات پر مبنی ہے۔

انسان خواہ کل کے ہوں یا آج کے نہ صرف کہکشاؤں اور آفاقی اجرام کی تخلیق سے بے خبر ہیں بلکہ ان کے مستقبل اور خاتمے کی کیفیت سے بھی مطلع نہیں ہیں۔ اُنہیں یقینی طور پر اس بات کا علم نہیں ہے کہ جس کرۂ ارضی میں وہ رہ رہے ہیں اس کا انجام کیا اور کیسے ہوگا۔ مستقبل میں اس کا کیا بنے گا، اور کیونکر اپنے انجام کو پہنچے گا؟

''دس سال کے عرصے میں انسان ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ قطب جنوبی کو روند ڈالا، سمندروں کی گہرائیوں کا پتہ لگا لیا ہے اور خلاؤں میں زندہ مخلوق کو بھیج چُکا ہے۔ لیکن ابھی تک اپنے پاؤں کے نیچے کی زمین کے روز افزوں نشیب و فراز تک رسائی حاصل نہیں کرسکا۔ وہ دن دُور نہیں جب مریخ کی مُٹھی بھر مٹی نوع انسان کے لیے تحفہ کی صورت میں زمین پر لے آئے، لیکن ابھی تک یہ نہیں جان سکا کہ جس سیارے پر وہ رہا ہے اس کا مرکزی حصّہ کس جنس سے ہے۔''

زمین کا مستقبل اور انسان کی لاعلمی:

''ہمارے تمدن کا مستقبل اسی راز کے انکشاف سے وابستہ ہے اور اس راز سے آگاہی سے کرۂ زمین کے بہت سے اہم رازوں کے حل کی کنجی ہمارے ہاتھ آجائے گی آیا زمین سرد ہوکر سُکڑ جائے گی یا گرم ہوکر پھیل جائے گی؟

آیا ہمیں برف کی طرح جم جانے کا مستقبل درپیش ہے یا دھماکے سے پھٹ جانے کا خطرہ لاحق ہے؟ آیا زلزلے آتش فشاں پہاڑوں کی وجہ سے آتے ہیں یا برعکس آتش فشاں پہاڑ زلزلوں سے جنم لیتے ہیں۔؟ ان سوالات کا جواب حاصل کرنے کے لیے ممکن ہے کہ دانشور مصروف ہوں اور اس طرح زمین کے بارے میں کوئی راہ حل اور ایک اہم ترین تاریخی جستجو کا کام انجام پائے''[۱]

اس ساری بحث کا نتیجہ:

اس تمام بحث کا نتیجہ کہ یہ نکلا قرآن مجید نے مشہور مقامات پر کائنات کے خاتمے، سورج، چاند اور ستاروں کی زندگی کے اختتام کو بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ حکمت کے مالک، خالق نے ابتدائے آفرینش ہی میں زمین

---

[۱] دانستنہائے جہانِ علم ص ۸۶

وآسمان اور اُن کے درمیان رہنے والی تمام مخلوق کی عمر اور زندگی مقرر کردی ہے۔اسی لیے یہ کائنات اپنے تمام اجرام سمیت حادث مخلوق ہے،ایک دن منصۂ شہود پر آئی اور جامۂ ہستی سے مزین ہوئی اور ایک دن اس کی عمر ختم ہوجائے گی اور وہ اپنے اختتام کو جا پہنچے گی۔

اپنے تصوّر کے مطابق قرآن کی تفسیر:

نزولِ قرآن کے زمانے میں بھی اور اس سے صدیوں بعد تک بھی مشہور زمانہ دانشور اور فلاسفہ آسمانوں اور کائنات کے دوسرے اجرام کے قدیم ہونے کے قائل تھے اپنے مفروضہ اور تصوّر کو دینی لحاظ سے بچانے کے لیے قرآنی آیات کی اپنی سوچ اور گمان کے مطابق تاویل کیا کرتے تھے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جاچُکا ہے کہ سائنسی علوم کی ترقی اور وسعت اور علمی وتجربی وسائل کی فروانی نے موجودہ دور کے ریسرچ اسکالروں کے لیے ثابت کردیا ہے کہ کائنات نہ ازلی ہے اور نہ ابدی بلکہ ایسی مخلوق ہے جس کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور حدِ اختتام بھی۔المختصر ان دانشوروں نے ان آخری دوتین صدیوں میں سرتوڑ کوششوں کے بعد کائنات کے بارے میں نتیجہ نکالا ہے جو آج سے چودہ سوسال پہلے قرآن پاک لوگوں کو بتاچُکا ہے اور یہ بذاتِ خود اس آسمانی کتاب کا ایک زندہ معجزہ ہے۔

آفتاب کی زندگی کے بارے میں تخمینہ:

یہ بات بھی یادرہے کہ تمام آفاق شناس اس بارے میں متفق القول ہیں،جلد یا بدیر منظومہ شمسی کی عمر ختم ہوجائی گی اوراس پر حکم فرما نظام کا خاتمہ ہوجائے گا۔پہلے بتایا جاچُکا ہے کہ بعض دانشوروں نے ایک تخمینے کے مطابق سُورج میں جلنے والی ہائیڈروجن گیس کی مقدار سے نتیجہ نکالا ہے کہ خورشید چالیس ارب سال سے روشن چلا آرہا ہے اور مزید ساٹھ ارب سال تک روشن رہ سکتا ہے۔ اس حساب کی رُو سے کائنات کا خاتمہ نہایت ہی دراز مُدتّ میں ہوگا۔البتہ اس حساب وکتاب کو اس وقت صحیح مانا جاسکتا ہے جب ایک تو ہائیڈروجن کی فرض شدہ مقدار صحیح ہو اور دوسرے سُورج اپنی طبعی موت مرے یعنی توانائی کے تمام ذخائر کو ہو اور تمام ذخائر کے ختم ہوجانے سے پہلے ایک اچانک اور اہم آفاقی روائیداد سے دوچار ہوکر تباہ وفنا ہوجائے۔تو ایسی صُورت میں کائنات کا خاتمہ اور اس کے ساتھ ہی قیامت کا قیام زیادہ دور نہیں ہوگا۔اور ضروری نہیں اربوں سال کی بات کی جائے یا لاکھوں بلکہ سینکڑوں سال مسئلہ درپیش ہو۔ایسی صورت میں سُورج اور دوسرے قمروں کی موت اچانک واقع ہوجائے گی اور ممکن ہے کہ یہ سب کچھ ایک مختصر سی مُدت میں انجام پائے اور منظومہ شمسی کی عمر اربوں سال ختم ہونے سے پہلے ختم ہوجائے گی،اور قرآن مجید کا یہ جُملہ شاید اسی بات کی نشاندہی کررہا ہے کہ:

"انھم یرونہٗ بعیدا ونریہ قریباً"

''ان لوگوں کی نگاہ میں قیامت بہت دُور ہے اور ہم اسے بہت نزدیک سمجھتے ہیں۔''[۱]

جیسا کہ قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے اور ہم بھی آئندہ فصل سے وضاحت کریں گے کہ کائنات کا خاتمہ اور دنیاوی عمر کا اختتام اچانک اور یکبارگی ہوگا اور ناگہانی ہوگا اور ناگہانی زلزلہ کی مانند رونما ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ حادثہ کسی بھی وقت رُونما ہو جائے۔ منظومہ شمسی کی بساط الٹ جائے اور کائنات کے تمام نظاموں کا خاتمہ ہوجائے۔ اسی لیے تو آئمہ اطہار علیہم السّلام نے دُنیا کے فانی ہونے کو بھی کائنات کی دوسری روائیدادوں کے ساتھ ساتھ بیان کیا ہے اور لوگوں کو بار بار اس طرف توجہ دلائی ہے کہ ناپائیدار اور فانی دُنیا پر مغرور نہ ہوں اور ہمیشہ اس کی فنا کو پیشِ نظر رکھیں۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر علیہ السّلام فرماتے ہیں۔

ثلثة اشیاء لاینبغی العاقل ان ینسا ھن علی کُل حال فناء الدنیا وتصرف الاحوال والآالتی لاامان لھا۔"

''تین چیزوں سے عقلمند انسان کو کبھی بھی غافل نہیں ہونا چاہیے، ایک دُنیا کے فانی ہونے سے، دوسرے زندگی کے دوران تمام حالات میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں سے اور تیسرے ان آفات اور بلاؤں سے جو کسی مہلت اور امان کے بغیر انسان کے دامنگیر ہوجاتی ہیں۔''[۲]

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

خداوند عالم کے فضل وکرم سے یہ ترجمہ بتاریخ ۲۹ / اکتوبر ۱۹۸۸ء بروز بُدھ بوقت ۹ بجکر ۲۰ / منٹ صبح، الحسنین منزل نظام آباد ڈیرہ غازی خاں میں اختتام پذیر ہوا۔

مولانا محمد علی فاضل

---

[۱] سُورہ ۷۰ آیات ۶،۵

[۲] بحارالانوار جلد ۱۷ ص ۱۸۳